سنگ لرازاں

دوسرا ایڈیشن

عبدالرحیم ظفرؔ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب.....سنگِ لرزاں

مصنف.....عبدالرحیم ظفرؔ

ٹائیٹل.....سید جواد

اول اشاعت.....2011

دوسری اشاعت.....

کمپوزر.....اختر قاضیؔ

پبلشرز.....

قیمت.....

انتساب

اپنے عظیم والدین کے نام جنہوں نے مجھے پہلی مرتبہ
''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ'' پڑھایا
اور علم کی روشنی سے میرے دل و دماغ کو منور کیا۔

ساتھ ساتھ ان تمام گمنام سپاہیوں کے نام جنہوں نے نام
ونمود کی پرواہ کیے بغیر اپنے نیک مقاصد کیلئے قربانیاں دیں
اور اب بھی دے رہے ہیں۔

تو پہ سگاراں گپتگیں کوٹ وکلاتاں گلے
من پہ پتی میراث وماتی گلزمین ءِ تلوساں
من بنی آدم ءِ او بادگاں
مہرانی حقیں وارثاں

(عطا شاد)

.....☆.....

جو لوگ تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے
تاریخ ان کو سبق سکھاتی ہے !

ان الحق، بات سچی تھی مگر منصور کو کہنی نہ تھی
یار کی محفل کی باتیں ، یار کی محفل کے بعد

کاتب تقدیر، انسان مجبور محض، یا تاریخ ساز، کون جانے؟ ہر انسان ایک تاریخ، ہر آدمی ایک کہانی ایک تاریخ۔ عبدالرحیم ظفر، دنیا کی لذیز ترین مچھلیوں کا مسکن گنز کا فرزند بلوچ، تاریخ کو قبائلیت سے قوم بنانے کے عمل میں تاریخ سازی کے عمل میں شریک بھی ہے اور اس کا مورخ بننے کی کوشش میں زندہ ہے۔ کب تک؟ کاتب تقدیر جانے۔ اس کی نیم مکمل تاریخ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان زندگی میں کئی فیصلے کرتا، خود فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے فیصلے ہیں شاید ہوں بھی۔ لیکن حالات، ماحول معاشی مجبوریاں، تاریخ کا بہاؤ، سیاسی فضاء وہ تمام محرکات جو اس کے فیصلوں میں شامل ہیں اس کے دست قدرت سے باہر ہیں اس کے فیصلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ظفر نے ان محرکات کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھ میں اور ظفر میں کئی درد مشترک ہیں۔ ہم خوشیوں کے خوشبو میں بھی ساتھ رہے اور ظلم کی چکی میں پسنے میں جبر کی تاریک راتوں کے بھی ساتھی رہے۔ ہم تاریخ کے غلام رہے۔ ہم نے جب آنکھ کھولی تو جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اثرات بھوک قحط سالی کے بادل بن کر فضاء میں پھیل چکے تھے۔ دنیا میں اس کے سیاسی ذہن سیاسی طلباء علمی اور عملی طور پر ملکی اور علاقائی سیاست کے ہئیت کے اندر ہی کام کر سکتے ہیں۔ بلوچ طلباء پہلی نسل میں علم آشنا ہوئے تو سیاسی خلاء جو پرانی نسل میں علم سے محرومی ان کو وراثت میں مل گئی تھی۔ اس لئے ان کو اپنی سیاسی زمہ داریوں کا احساس زیادہ تھا۔ آج فکری انارکی کے اس حد تک بھی پہنچ گئے کہ تعلیم حاصل کرنا اتنا ضروری نہیں جتنی آزادی۔

میر بزنجو صاحب قیام پاکستان کے بعد مہاجر اسلامی حکمرانوں کے نزدیک کانگریسی گردن زدنی گروہ میں سرخیل ٹھہرائے گئے اور سیاسی کنارہ کشی پر دوسرے کئی سیاسی کارکنوں جیسے عبدالصمد خان اچکزئی اور عنقا وغیرہ سیاسی کارکن ٹھہرائے گئے۔ سیاسی بقاء بنیادی ضرورت ٹھہری۔ انہوں نے بلوچ سرداروں سے جو اپنی سیاسی بقاء کے لئے لڑ رہے تھے فطری اتحاد کیا لیکن یہ اتحاد اپنے اندر کئی تضادات کا حامل تھا۔ جو آج بھی ہے۔ ان کے خان کا قلعہ مسمار تھا۔ خاران، لسبیلہ اپنے قبائلی تضادات کے لاینحل مسائل کا شکار تھے۔ تنہائی کے خوف، ظلم کی تاریک رات، ابھرتے تضادات، نئے حکمران سنڈیمن کے جانشین اور برطانوی طاقت کے جانشین، کم ظرف رشوت خور افسر شاہی گردن پر سوار ریاستی ظلم اور سردار کی جبری پرانی ریت کا محل۔ کانگریسی ملا روپوش مسجد نشین۔ پاکستان کی نئی ریاست میں پنجابی جاگیردار، امیر محمد خان اور ایوب کے سرمایہ دار ساتھیوں کے مفادات اور تضادات لیاری کے سیٹ پر آ کر متحد ہو گئے۔ عبداللہ ہارون کے بلوچ ووٹوں کے اس

کے بیٹے کسی بلوچستان کے ایک سرمایہ دار کو دیتے؟ بزنجو صاحب کو میر حمل خان مستی برادران کے ذریعے دعوت دی گئی تو انہوں نے صحیح موقع سے سیاسی فائدہ اٹھایا اور سرداروں کے تعاون سے اپنی سیاسی حیثیت بحال کی۔ اچھا کیا؟ برا کیا؟ یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں تاریخ کا ہے۔ بلوچ طلباء کو آزادی کے گھوڑے پر شاعر گل خان نصیر اور بزنجو کے علاوہ بہت سارے اور بھی تھے۔ لیکن گھوڑے سے اترنے کے عمل کا ردعمل بھی ہونا تھا۔ کیونکہ اس گھوڑے سے اترنے کے لئے بچے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ یہ ہمیں سکھایا ہی نہیں گیا تھا اور جن کو اُن کے کہنے پر ہم نے خود گھوڑے پر بٹھایا تھا۔ ہم نے ان کو کیا کہنا تھا۔ یہی نا کہ ہم نے تم سے دھوکہ اس لئے کیا کہ ہم کو دھوکہ دیا گیا تھا۔ حقیقت وہ بھی شکست کی حقیقت کی تسلیم کوئی معمولی بات ہوتی تو آج مجھ کو اتنے جھوٹ کیوں بولنے پڑتے!

معاہدہ نور خان کے دور ردعمل سامنے آئے۔ سیاست کی منزل کیا ہوتی ہے؟ اقتدار، پاکستان میں جزوی شراکت قتدار، سردار حواس باختہ ہوگئے۔ منزل قریب ہے، منزل قریب ہے تو کیا کرنا چاہیے؟ اپنے نزدیک جتنے شراکت کے خواہش مند ہیں ان سے چھٹکارا۔ بزنجو صاحب تاریخی طور پر مکران/کچھی کے فاتح نصیر خان کے نائب تھے، بیلہ اور خاران کو خانیت کے زیر اثر رکھنے کے خواہش مند رہے۔ اس لئے وہ باجگزار علاقوں میں اٹھنے والی کسی بھی قیادت کو خواہ طلباء کے سطح پر ان کے جانشین کے لئے ہو یا کسی سردار کے فرزند کے لئے ہو کیسے قبول کرتے۔ یہ سیاست خاص کر قبائلی سیاست کی نفسیات میں شامل نہیں ہے۔ سرداری میں شراکت کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ دوسرا ردعمل جولیاری، مکران، باجگزار کی سطح سے نکلنے کے لئے بے تاب تھے۔ اتنے ہی فطری ردعمل اس لئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ابھرتے مڈل کلاس تعلیم یافتہ سیاسی ذہن کے نمائندہ سمجھتے تھے اور سردار سے قابض سیاسی قوت اور خان/ریاستی تسلط کے تسلسل کو اپنی بقاء سمجھتے تھے۔ اس فطری تضاد کا ٹھکراؤ معاہدہ نور خان نے منطقی انجام تک پہنچا ہی دیا۔ ائیر مارشل نور خان خضدار تشریف لائے تو میں نے چند دوستوں کا وفد معہ ایک غلط انگریزی میں لکھی تحریر کے ساتھ پیش کی، معاہدہ۔

۱۔ سرداری بحالی

۲۔ پولیس تھانہ خاتمہ

۳۔ ترقیاتی فنڈ استعمال بذریعہ سردار

پر مبنی یہ معاہدہ ''بلوچ'' کے لئے قابل قبول نہیں۔ ساتھ میں جوانی کی بھڑک بھی ماری ''اس سے بلوچستان میں امن قائم نہیں ہوگا''۔ وہ ہمیشہ آسمان کی طرف نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے گردن موڑی اور ساتھ بیٹھے راجہ احمد خان (جنہوں نے مجھے پہلی نوکری دی تھی، نیک، محنتی، دیانت دار جن کی میں دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن ان کو سنڈیمن ثانی بھی کہتا تھا) کی طرف دیکھا۔ ہاں راجہ صاحب! یہ نوجوان کیا کہتا ہے۔ راجہ صاحب خوش گفتار کم گو عالم نے مسکرا کر کہا۔ ''دیکھتے ہیں'' امن قائم ہوا۔ میری بھڑک قبائلی معاشرے کے پس منظر میں کیا سیاسی حقیقت رکھتی تھی۔ آج جو سردار خوش تو بلوچ خوش۔ سردار ناراض تو خدا ناراض، سرکاری فلسفہ پر بلوچ کے ساتھ جو کھیل ہو رہا ہے۔ وہ زیادہ

حقیقت پسندانہ ہے یا میری بھڑک! حقیقت یہ ہے کہ بلوچ مقتدرہ۔جن کو بعد میں ''تین تلوار باز''(Three Musketeers) کہا اور جن کی سیاسی نمائندگی میر بزنجو کر رہے تھے خود مجھ سے جو اس وقت ان کی خفیہ تنظیم کا سینٹرل کمیٹی کا رکن تھا اور رحیم ظفر اور دیگر بلوچ طلباء جو بی ایس او پر قابض تھے جان چھڑانا چاہتے تھے۔اقتدار قریب دیکھ کر وہ ابھرتے مڈل کلاس کے ایسے لوگوں کو خاص کر ایسے علاقوں سے جو باجگزار رہے ہوں خطرہ سمجھتے تھے۔جو آگے جا کر مشکلات پیدا کر سکتے ہوں۔یہ تمام عمل سیاسی عمل کے جائز اقدامات کہلاتے ہیں۔ہمارے جیسے شرارت پسندوں کے بجائے وہ تابع فرماں قسم کے بندے تلاش کرتے ہیں جن کی کمی نہیں ہوتی۔خاص کر باجگزار کھچی مکران کے زرخیز گچکی رئیس اور کھچی جاموٹ زدہ میں ایسے دوستوں کی کیا کمی ہے۔کوئی ملے نہ ملے،میری اور ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ کی خدمات ہمیشہ حاضر ہیں۔

اس سیاسی قبائلی بلوچ معاشرے میں رحیم ظفر نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کر کے واقعاتی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔بلوچ قبائلیت سے قوم بننے کے آفرینش کے درد میں مبتلا ہیں۔نوجوان خوابوں کے اندھیرے میں راستے کی تلاش میں ہیں۔فتح القریب کے ہزاروں ساتھی ہیں۔شکست کے دو قدم آگے بڑھنا دانش کا امتحان ہوتا ہے۔نوجوان خواہش کے سراب میں ایسی تاریخ چاہتے ہیں جو ان کا پسندیدہ ہو۔تاریخ کی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے۔

عبدالرحیم ظفر قابل مبارک باد ہیں۔سردار بلوچ کے لئے انگریز کی بنائی ظلم کے نشان (Symbol) کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ظفر اس کے خلاف آواز اٹھانے والے پہلے نوجوان میں شامل ان کی کہانی کا مصنف بھی ہے۔اس تصنیف پر بھی ان کو شاباش۔خدا کرے یہ ان کے لئے آخری شاباش نہ ہو ان کو اپنی قلمی جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔

میر امان اللہ گچکی

کراچی،مورخہ 5 اپریل 2011

سنگ لرزاں کے سنگ ستم کا بار گراں

عبدالرحیم ظفر کی کتاب سنگ لرزاں کو پڑھ کر مجھے، میری اور مصنف کی پینتالیس سالہ رفاقت کی یادیں کیا کچھ دے جاتی ہیں اور کیا کچھ لے جاتی ہیں وہ میں جانتا ہوں یا پھر رحیم جانتا ہے۔ کچھ تو ان مضامین میں شامل ہیں۔ کچھ ان کی بین السطور میں نظر آتی ہیں۔ لیکن کچھ ہم دونوں کے دل و دماغ کی لوح پر منقش ہو کر بھی صفحہ قرطاس پر منتقل ہو نہیں سکتیں کہ وہ ہم دونوں کی مشترکہ کچھ ایسی خوشگوار و ناخوشگوار یادیں ہیں جن کو ہم کسی دوسرے کے ساتھ شیئر (Share) نہیں کر سکتے ہیں۔ مگر وہی یادیں اس داستان کو بیان کرنے کا ایما بن گئی ہیں۔

جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

ہم پہلی دفعہ کراچی میں ملے۔ میں پنجگور سے اور رحیم جیونی سے طلب علم کے لئے آئے تھے۔ میں کراچی یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ وہ اسلامیہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ رحیم ظفر کو غفار ندیم، این ایس ایف سے کھینچ کر بی ایس او میں لائے اور ان کو اسلامیہ کالج کے یونٹ کا انچارج بنا دیا تھا۔ ''بی ایس ای او'' کو ''بی ایس او'' بنانے میں رحیم ظفر جیسے مخلص طالب کارکنوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ بادی النظر میں جن لوگوں کو بی ایس او کی تخلیق کے بعد مرحلہ وار پیش رفت ترامیم و تنسیخ کا علم نہیں وہ اس ''ای'' کو نکالنے کی اہمیت کا اندازہ آسانی سے نہیں کر سکتے ہیں رحیم ظفر نے اپنی تحریر میں اس بنیادی نکتہ کو تفصیل سے لکھ کر بلوچ طالب علم کی سیاست کو اس کے حقیقی تاریخی اور معروضی تناظر میں دیکھنے کی ایک مخلصانہ جستجو کی ہے۔

ہمارے کوئٹہ کے دوستوں نے جب اگست 1962 کے اوائل میں بلوچ طلباء کی تنظیم کا قیام عمل میں لایا تو ہم نے اس کا نام ''ورنا وانندہ گل'' رکھا جس کا میں پہلا صدر منتخب ہوا اور کراچی یونیورسٹی کے بلوچ طالب علموں نے اکتوبر 1962 کو اپنی تنظیم بنائی تو اس کا نام ''بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن'' رکھا۔ جس کا پہلا صدر چنگیز عالیانی منتخب ہوا۔ ہم نے کچھ مہینے بعد ان دونوں الگ الگ بلوچ طلباء تنظیموں کی سرگرمیوں کو مربوط کرنے کے عمل کا آغاز اپریل 1963 کو کیا۔ جب ہمارے کراچی کے عبدالرحیم (جانی) اور اسلم گچکی (شہید) نے ورنا وانندہ گل کے لئے پوسٹر، پمفلٹ اور ہینڈ بل چھپکے سے کوئٹہ پہنچا دیئے تھے کہ ہمارا سارا مواد چند دن پہلے خفیہ ایجنسی والے اٹھا کر لے گئے تھے اور تمام پریس والوں کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ ہمارے ریاستی مخالف مواد (Anti State Material) کو نہیں چھاپیں گے۔ لیکن کراچی کے دوستوں کے اس عملی تعاون نے ہماری ہڑتال کو کامیاب بنا دیا۔ ان دنوں لبوں پر مُہر لگا دی جاتی تھی تو پاؤں کو

بیڑیاں بھی لگ جاتی تھیں دونوں کا کھولنا ناممکن ہوتا تھا اب تو لب آزاد ہیں جائے ماندن بھی ہے اور پائے رفتن بھی۔ان پابندیوں اور مہر بہ لبوں کو وہی جان سکتے ہیں جو ان سے گزرے ہیں۔

اُن دنوں وحدت مغربی پاکستان کے سایہ استبداد میں مغربی پنجاب کی حکمرانی بذریعہ امیر محمد خان،نواب آف کالاباغ ہمارے سروں پر مسلط تھی کہ ساری وفاقی وحدتوں، ریاستوں اور علاقائی حکومتوں کو مٹا کر مغربی پنجاب میں بزور بازو جرنیلاں ضم کر دیا گیا تھا جس سے بلوچستان دوسروں کے مقابلے میں سے زیادہ دکھی تھی کہ اس کی چار ریاستوں اور آزاد بلوچ قبائل کا جن تحریری معاہدات اور شرائط کے تحت پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ساتھ الحاق کیا گیا تھا۔ان کو حاکموں نے کاغذ کا ایک حقیر مسودہ جان کر پھاڑ پھینک دیا تھا اس سے نہ صرف بلوچ گل زمین پر بلوچ کے حقِ حاکمیت کو چھین لیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے وسائل معدنی دولت آفرینی پر قبضہ کر کے اس کی قومی شناخت،قومی تہذیب وثقافت،قومی بلوچی زبان کے سارے حوالوں کو ملیا میٹ کر کے بلوچستان کو کوئٹہ قلات ریجن کا نام دیا گیا تھا۔جن پر مارشل لاء کے دنوں میں ایک میجر جنرل اور کمشنر حکمرانی کیا کرتے تھے۔ان کا ہر حکم حرفِ آخر ہوا کرتا تھا۔لیکن 1962 کے آمرانہ آئین کے تحت جب بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کے ووٹوں کے ذریعہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے قانون ساز چن لئے گئے تھے تو قلات ڈویژن سے سردار عطا اللہ مینگل اور کوئٹہ سے نواب خیر بخش مری قومی اسمبلی کے ممبر چن لئے گئے تھے۔سیاسی جماعتوں کو الیکشن سے نہ صرف باہر رکھا گیا تھا بلکہ معروف وفعال قدآور سیاست دانوں کو ایبڈو کے مارشل لائی قانون کے تحت زبردستی باہر رکھا گیا تھا۔سب منتخب نمائندے اپنی ذاتی حیثیت اور قبائلی اثر وسوخ کی بنیاد پر منتخب ہو کر ان اسمبلیوں میں پہنچے تھے۔مکران کی واحد نشست سے عبدالباقی بلوچ،نوابزادہ شیخ عمر خان گچکی کو ہرا کر مغربی پاکستان اسمبلی میں پہنچ گئے تھے۔میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ وہ واحد عوامی نمائندہ تھے جو قلات ڈویژن سے چن لیے گئے تھے باقی تمام اپنی ''خاندانی وجاہت'' یا ''سیم وزر کی چمک'' یا حکومتی حمایت سے منتخب ہوئے تھے۔ان سارے نمائندوں میں کوئی پختون نمائندہ نہ تھا سب بلوچ تھے،سوائے بابو محمد رفیق کے جو کہ لورلائی کے پرانے نوآبادکار تھے ہم بلوچ طلباء بڑے خوش تھے کہ اتنے سارے بلوچ نمائندے صوبائی اور قومی اسمبلیوں میں پہنچ کر بلوچوں کے چھینے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں گے انہی امید افزا جذبات کو لے کر ہم نے ان بلوچ ممبران اسمبلی اور قومی سربراہوں کو کیف بلدیہ کے سبزہ زار پر ایک شاندار پارٹی دی لیکن تمام ممبران اس میں شریک نہیں ہوئے۔حتیٰ کہ باقی بلوچ بھی اس سے دور رہے البتہ سردار عطا اللہ مینگل،نواب خیر بخش مری،نواب اکبر خان بگٹی،میر احمد نواز بگٹی،میر علی مگسی،میر مراد خان جمالی،میر شیر محمد مری وغیرہ اس میں شریک ہوئے،مجھے سب کے نام یاد نہیں آرہے ہیں ،پارٹی کے اختتام کے بعد ہم کچھ طالب علم ایکٹوسٹ میر شیر محمد مری اور میر امان اللہ گچکی وغیرہ کے ساتھ وہیں بیٹھ کر سر جوڑنے لگے کہ تمام بلوچ منتخب نمائندوں کو بلوچ کاز سے منسلک کرنے کے لئے کیا لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔تو سب کی متفقہ رائے تھی کہ بلوچ طلباء کو ہی

اس مقصد کے لئے ایک تنظیم بنانی چاہیے تو ہم نے کافی سوچ و بچار کے بعد کئی نشستوں کی مفصل بحث وتکرار کے بعد اپنی تنظیم سازی شروع کی۔اس کا دستور بنایا بلوچ نام ''ورنا وانندہ گل'' اور انگریزی یا اردو نام ''بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' رکھا اس کی بنیادی پالیسی اس حقیقت پر استوار تھی کہ اس تنظیم کا کوئی رکن کسی دوسری تنظیم کا رکن نہیں بن سکتا ہے اور تنظیم خود کسی سیاسی جماعت کا اسٹوڈنٹ ونگ یا پاکٹ آرگنائزیشن نہیں بن سکتی ہے کہ دیکھ چکے تھے کہ پارٹی سیاست بلوچوں کے لئے افتراق کا بنیادی سبب بنتی جارہی تھی جس کی واضح مثال ہماری چائے پارٹی سے کچھ نمائندوں کا اپنے آپ کو دور رکھنا پہلا عملی مظاہرہ تھا۔خاص کر عبدالباقی بلوچ کا اپنے آپ کو ہم سے دور رکھنا۔ ہم نے ذاتی اور تنظیمی طور پر بڑی کوشش کی کہ کم سے کم قوم پرست حضرات ایک معمولی فائدے کے عوض برتر قومی مقصد کو زک نہ پہنچائیں۔ میر غوث بخش بزنجو نے بعد میں ہم کو یقین دلایا کہ وہ اس قضیہ کو خوش اسلوبی سے حل کروائیں گے وہ بھی نہ کر سکے، مسئلہ صرف اتنا تھا کہ مغربی پاکستان کی کونسل آف منسٹرز میں احمد نواز بگٹی کو یا عبدالباقی بلوچ کو متفقہ طور پر نامزد کیا جائے۔بگٹی سرداریت کی آہنی خول سے باہر نہیں آسکا اور بلوچ عوامیت کے اعتماد کی فولادی فصیل کے اس پار نہ جاسکا۔

میں جب دوسرے سال ایسی ہی ایک موسم بہار میں عبدالباقی سے لاہور میں ملا تو ان سے درخواست کی کہ کینگاں کوتاہ کن (ضد چھوڑ دیں) تو اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی اور کہا کہ میں نے اگر آج ہتھیار ڈال دیئے تو امیر محمد خان آف کالاباغ ان سرداروں کو پیر تسمہ پا بنا کر ہمارے گلے میں لٹکا دیں گے لیکن میں قائل نہ ہوسکا کہ میر غوث بخش بزنجو کی ساحرانہ سیاسی شخصیت کی پوری طرح گرفت میں آچکے تھے یا کہ میر امان اللہ گچکی کی محفلوں اور شبانہ نشستوں کے دور چراگ محفل کے گردیدہ ہو چکے تھے ہمیں ان دنوں گمان کی حد تک یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ دونوں معتبر حضرات بھی ''شتر زادہ'' ہیں اس لئے اونٹوں کے بیگار میں ہم ان کو اپنی حد تک یہ استثنیٰ (چھوٹ) دے چکے اور ان کی رہنمائی اور سنگت میں ''بلوچ آزاد وطن'' کے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مربوط منظّم جدوجہد کا آغاز کر چکے تھے۔نواب خیر بخش مری کے ہمہ وقت ہم نشین ہونے اور ان کی ترقی پسند و سائنٹفک تجزیاتی اپروچ کو قریب سے دیکھنے اور ان سے کماحقہ مستفیض ہونے کا ہمیں پورے ایک عشرہ تک شرف بھی حاصل رہا۔لیکن انہوں نے ہماری تنظیم کو بالواسطہ کبھی بھی کسی سیاسی پارٹی سے منسلک کرنے کی بات نہیں کی، بلکہ وہ ہمارے چیدہ چیدہ طلباء کے ایک گروپ کو ان مطالعات وافکار کے ذریعہ رہنمائی کرتے رہے۔چنانچہ چنگیز عالیانی جب کراچی سے کوئٹہ تشریف لائے تھے تو ہم نے ان سے دونوں بلوچ طلباء تنظیموں کو ضم کرنے کی بات کی تو ان گفت وشنید میں امان اللہ گچکی کے علاوہ خیر بخش مری نے بھی بھرپور کوشش کی۔لیکن نام ومنشور کے حوالہ سے دونوں اپنے مؤقف کو بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔اس لئے ہماری پہلی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔چنگیز عالیانی ایم اے کرنے کے بعد کوئٹہ آئے۔میں اسی سال بی اے کرنے کے بعد بعد کراچی چلا گیا، میں نے از سر نو اپنی کوششوں کا آغاز کیا تو مجھے بہت سارے دوستوں کی حمایت حاصل ہوگئی تو ہم نے نہ صرف عبدالغفار کو تنظیم کا صدر چن لیا، بلکہ

''بی ایس او'' کو ''بی ایس ای او'' سے نکال کر سائنسی خطوط پر استوار کر کے بلوچ قومی دھارے میں ''ورنا وانندہ گل'' کی طرح لانے میں کامیاب ہوئے ایک سال بعد میں ''بی ایس او'' کراچی کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہوا۔ عبدالرحیم ظفر سیکریٹری جنرل صدیق بلوچ نائب صدر لطیف بلوچ جوائنٹ سیکریٹری اور ڈاکٹر حئی بلوچ خزانچی منتخب ہوئے۔ ان دو سالوں میں ہم نے نہ صرف بی ایس او کو ''ای'' کے حرف سے چھٹکارا دلایا بلکہ اس خوف سے نکالا کہ بلوچ طلباء کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام طلباء تنظیموں کی طرح کراچی میں بھی ایک سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور ادبی طالب علم تنظیم کے طور پر اپنے کو منوالیں، جیسا کہ ہم کوئٹہ میں کر چکے تھے۔ ان دو سالوں میں ہم فیض احمد فیض صاحب کو اپنے سالانہ بلوچی دیوان کی صدارت کے لئے راضی کر چکے تو انہوں نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''یتیم لہو'' کو پہلی دفعہ بی ایس او کے اس فنکشن میں پڑھی تو وہ اس وقت کی فوجی کارروائی کی عکاس تھی، جو کہ بلوچ گل زمین پر ایوب خان کے عسا کرنے شروع کر رکھی تھی۔ جس نے ہمارے دلوں کو گرما دیا مہاجر اس کو لالوکھیت میں گوہر ایوب کے کشت وخون سے تعبیر کر رہے تھے۔ جو درحقیقت ریاستی دہشت گردی کی ایک بھرپور مذمت تھی جو ہر دور میں زندہ ہے اور دوسرے سال فنکشن میں چانسلر جناب اشتیاق قریشی کو مدعو کیا گیا جس میں آپ نے اعلان کیا کہ بلوچ طلباء کے لئے میرٹ کو ایک طرف رکھ کر ہر طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دیں گے اور یونیورسٹی میں بلوچی زبان کا ڈیپارٹمنٹ بھی کھول دیں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں قائم کردہ تعلیمی اصلاحات کی کمیشن کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر کے ان سے اپنے تعلیمی حقوق منوالیے۔ ہم نے یونیورسٹی میں بلوچ ثقافت ولوک ادب کو پہلی مرتبہ یوں اجاگر کیا کہ سنگیت کار فیض شفیع اور ستار امر ہو گئے اور ساحلی لیوا رقص ثقافتی میلوں کی جان بن گئی۔ پچار رسالہ نکال کر ہم نے بلوچی ادب اور ثقافت کو ادارتی صورت میں متعارف کرانے کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ ان سب خدمات کو ہمارے بڑوں نے اچھی نظر سے دیکھا۔ میں شکر گزار ہوں میر غوث بخش بزنجو صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اور رحیم ظفر کو اپنی خودنوشت سوانح کی یاداشتوں میں یہ لکھ کر دیا رکھا کہ عبدالحکیم جو کہ ورنا وانندہ گل کے صدر رہ چکے تھے۔ اس نے کراچی میں ''بی ایس ای او'' کو اسی طرح از سر نو منظّم کر کے ''بی ایس او'' بنایا اور اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اس میں سال 64 کی بجائے 67 لکھا گیا ہے۔ بی ایس او کی تقسیم کو 68,69 کے الیکشن سے منسوب کر کے پارٹی کے نکتہ نظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو میں سمجھتا ہوں کہ درست نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں رحیم ظفر مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ وہ بہ نفس نفسیں اس میں شریک رہے ہیں اور تمام وقوعات کو اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس لئے میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا ہوں۔

اس تاریخی حال واحوال کے علاوہ اس کتاب میں رحیم ظفر کی کچھ اخباری کالم اور مضامین بھی شامل ہیں۔ جو اس کی عمدہ تحریر اور شفاف ذہن کی غماز ہیں۔ رحیم کبھی کبھی شاعری بھی کرتے ہیں۔ سیاست بھی کرتے ہیں اور آج کل تجارت کو روزگار بنا کر اس میں جھت گئے ہیں۔

رحیم جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کو نہایت تن دہی، خلوص اور رکھ رکھاؤ سے کرتے ہیں۔ دوستوں کے دکھ سکھ کے ہر حال میں ساتھی بنے رہتے ہیں۔ ہماری دیرینہ دوستی میں اللہ کے فضل سے کوئی رخنہ نہیں پڑا ہے۔ وہ اب بھی اتنی ہی تر و تازہ و توانا ہیں جیسا کہ سورج کی پہلی کرن ہو۔ شیخ سعدی کا یہ شعر ہم پر صادق آتا ہے۔

چہل سال عمرے عزیزیت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

حکیم بلوچ (بال بان سیٹلائٹ ٹاؤن کوئٹہ بلوچستان۔ 25 مارچ 2011ء)

مردم خیز خطہ

مکران کے مردم خیز خطہ نے عہدِ حاضر میں سیاست، ادب اور دانش میں جو دورِ نایاب پیدا کئے ان میں میر عبدالرحیم ظفر کا شمار چند گنتی کے ناموں میں سرفہرست ہوگا۔ بی ایس او کے قیام سے لیکر اب تک انہوں نے ایک شعلہ خیز زندگی گزاری ہے۔ بلوچی ادب وزبان کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ لیکن ان کا بنیادی شعبہ سیاست ہے اور سیاست میں ان کا روش بغاوت ہے۔ اپنی بغاوت کا آغاز انہوں نے بی ایس او (انٹی سردار) کے قیام سے کیا جو ہنوز جاری ہے۔ اگرچہ انہوں نے سیاسی طور پر پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا اور ایک بہت ہی مشکل اور شعلہ خیز دور میں ریاست کے اولین منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے نائب اور اوایس ڈی رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اوڑھنا بچھونا بلوچ، بلوچ سرزمین اور بلوچ سیاست ہی رہی۔

رحیم ظفر کی باغیانہ افتادہ طبع انہیں عین عالم شباب میں بغداد لے گئی جہاں انہوں نے عظیم تر بلوچستان کی تحریک کے لئے کام کیا۔ لیکن بین الاقوامی حمایت نہ ملنے کے باعث وہ ناکام اور نامراد واپس لوٹ آئے۔ اس طرح یہ تحریک جو آج نظر آرہی ہے اور جس کے موجودہ رہنما رحیم ظفر اور ان کے ساتھیوں کو معطون قرار دیتے ہیں ظفر اور ان کے ساتھیوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان کی زندگی میں جو زگ زیگ نظر آتے ہیں اس کا ایک طویل پس منظر ہے اور اس کے لئے رحیم سے درگزر یا صرف نظر کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ آشفتہ سر نہ ہوتے تو آج یہ تحریک موجودہ مقام اور ہئیت پر نظر نہ آتی۔ رحیم اور ان کے ساتھی ایک طرح سے ملامتی صوفی ہیں جو کسی اچھی چیز کا کریڈٹ نہیں لیتے اور ہر برائی کو اپنے سر لیتے ہیں۔ مکران نے اپنی تاریخ میں جو پڑھے لکھے لوگ پیدا کیے وہ گنتی کے ہیں اور ان میں میر امان اللہ گچکی، میر عبدالباقی بلوچ، میر عبدالحکیم بلوچ اور میر عبدالرحیم ظفر سرفہرست ہیں۔ سیاسی ثمرات سے قطع نظر انہی آشفتہ سروں نے سیاست، ادب اور ثقافت میں ایک انقلاب برپا کیا۔ بلوچ شناخت کو برسر عام کرنے اور اسے بین الاقوامی سطح پر لے جانے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ اگر میر امان اللہ گچکی سرکاری وفد میں شامل ہونے کے باوجود 1972ء میں واجہ اکبر بارکزئی اور واجہ قادر بخش نظامانی سے ملاقات کے اشتیاق میں بغداد نہ جاتے تو انہیں ہر بڑا عہدہ اور حکومتی منصب مل سکتا تھا۔

بلوچ اور بلوچ گلزمین کے لئے عبدالرحیم ظفر اور ان کے مکتبۂ فکر کا اپنا خاص نظریہ، نکتہ نظر اور زاویہ ہے۔ وہ ظاہری طور پر جو کچھ کریں یا ماضی میں جو کچھ کر چکے ہیں اس سے قطع نظر ان کا مقصد اور منشاء وہی ہے جس پر تمام بلوچوں کا ایمان اور ایقان ہے لیکن ان کا راستہ جدا ہے وہ کسی بالادستی کسی کا ڈکٹیشن اور سپر میسی کو تسلیم نہیں کرتے وہ ایک مخصوص طبقہ، سپر میسی سردار کو نہیں مانتے جس کی وجہ سے سیاسی چابکدستوں اور اعلیٰ پیمانے کے بیوپاریوں اور ان کے چمچوں کے ہاتھوں میں ہزاروں ''سنگ'' ہمیشہ نشانہ کے تعاقب میں رہتے ہیں۔

''سنگِ لرزاں'' شاید اسی سبب عبدالرحیم ظفر کی کتاب کا عنوان ہے۔ وہ جوانی میں بلوچی زبان کے ایک منفرد لکھاری تھے۔ لیکن اردو پر ان کی گرفت بھی کمال کی ہے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں مضامین کے ذریعے جن آراء کا اظہار کیا ہے اب انہیں کتابی شکل دے رہے ہیں۔ ان کے موضوعات اگرچہ نئے نہیں مگر متنوع ضرور ہیں جن میں خیال کی گہرائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے برسوں پہلے جو پیشن گوئیاں کی وہ سالوں بعد درست ثابت ہو رہی ہیں جس سے ان کے وژن اور وجدان کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔ ان کے اکثر مضامین انتخاب میں شائع ہوتے ہیں جو ہمارے لئے باعث فخر و اعزاز کی بات ہے۔

انور ساجدی

ایڈیٹر روزنامہ ''انتخاب'' کراچی

مورخہ: 6 اپریل 2011ء

رحیم ظفر کی کتاب پر چند گزارشات

ساٹھ کی دہائی میری زندگی میں بہت اہم رہا ہے۔ میں حصول تعلیم کے لئے کراچی گیا۔ وہاں سے تعلیم حاصل کی۔ سیاسی شعور ملا۔ ان دنوں میں کراچی کے تعلیمی ادارے سیاست کے گہوارے ہوا کرتے تھے اور بائیں بازو کی طلباء تنظیم این ایس ایف بھرپور طریقے سے سرگرم عمل تھی۔ ہم بلوچ طلباء بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ اس تنظیم سے وابستگی پیدا ہوگئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی بلوچ طلباء کی ایک تنظیم بنانے کا خیال بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ بلوچ طلباء تنظیم بن گئی اور بہت جلد فعال ہوگئی۔ مگر این ایس ایف سے سیاسی وابستگی قائم رکھی۔ میں 1966ء کے وسط میں تعلیم سے فارغ ہوا اور 1967ء کے اوائل میں پنجگور میں ملازمت پر مامور ہوگیا۔ تو میری طلباء سیاست سے براہِ راست تعلق منقطع ہوگیا اور جو واقعات بی ایس او تقسیم کے حوالے سے وقوع پذیر ہوئے میں ان سے بے خبر ہی رہا جب رحیم ظفر نے بلوچ طلباء کی سرگرمیوں میں شمولیت اختیار کی تو ہمارے ساتھ دو ڈھائی سال تک رہا اور جتنے دن ہم ساتھ رہے یقیناً ہم نے ان کو ایک مخلص اور بے لوث ساتھی پایا۔ اس موقع پر میں بی ایس او کے قیام کے بارے میں یہ عرض کرتا چلوں کی جب بی ایس او (بی ایس ای او) وجود میں آئی کم وبیش انہی خطوط پر ''ورنا وانندہ گل'' کا کوئٹہ میں قیام میں بھی عمل میں آچکا تھا۔ اس وقت اس کے کئی رکن کوئٹہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور کراچی آئے وہ بی ایس ای او میں شامل ہوگئے۔ اس وقت بی ایس ای او کے ابتدائی نام کے حوالے سے مجھے ایک بات یاد آئی، وہ یہ کہ جب تنظیم کے قیام پر گفت وشنید شروع ہوئی تو اس کے اغراض ومقاصد کے علاوہ اس کے نام پر بھی بڑی لے دے ہوئی۔ اس ضمن میں دو آراء سامنے آئیں، تنظیم کا نام ''بی ایس او'' رکھنے سے کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ اس سے سیاسی تاثر ملتا ہے۔ اس لئے اس میں سوشل یا تعلیم کے لفظ کا اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ ابتدائی طور پر اتفاق رائے کو قائم رکھنے کے لئے اس میں تعلیم یعنی ایجوکیشن کا لفظ شامل کیا گیا اور نام ''بی ایس ای او'' رکھ دیا گیا۔ یہ بات بہت سوں کو کھٹکتی رہی اور جونہی کچھ دوست تعلیم سے فارغ ہوگئے اور نئے دوست کراچی آئے، اس کا نام ''بی ایس او'' رکھ دیا گیا جس کا ذکر رحیم نے کیا ہے۔

ہاں تو ابتداء میں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے جب پنجگور میں ملازمت شروع کی، میرا رابطہ کراچی سے باقی نہیں رہا تھا۔ ایک دن کسی طرح مجھ تک یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ میرے چند ایک دوست مصالحتی عمل شروع کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے یہاں سے میں اور کوئٹہ سے صورت خان مری کراچی چلے جائیں۔ چنانچہ میں کسی طرح کراچی پہنچ گیا۔ پنجگور سے کراچی پہنچنا بڑا محال تھا، کراچی آتے ہی دوستوں سے رابطہ کیا۔ سب سے پہلے صدیق آزاد سے ملاقات کی۔ حال واحوال سے پتہ چلا کہ صورت خان مری آکر چلے گئے تھے اور اب مفاہمت کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ اس لئے معاملہ گھمبیر ہو چکا تھا۔ اگلی صبح اپنی سند کے حصول کے سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کیمپس چلا گیا۔ کام ختم

کر کے شام کو شہر جانے کے لئے بس میں بیٹھ گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ محمد یار، منیر گچکی اور چند دوست بھی اس میں سوار تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ جناح کورٹس ہوسٹل میں ''بی ایس او'' کے دو گروپوں میں لڑائی ہوئی تھی۔ منظور گچکی اور نور احمد آپس میں الجھ گئے تھے اور شاید کچھ مکے بھی چلے۔ یہ دوست اسی وجہ سے بے وقت شہر جا رہے تھے۔ خیر میں شہر آ گیا، شام کو صدیق آزاد کے پاس چلا گیا۔ ہم دونوں مل کر حسبِ معمول ''الفی'' گھومنے نکلے۔ اس چوک پر پہنچے جس کو رحیم، بلوچ کارنر کہتے ہیں۔ کیا دیکھا کہ ہمارے دوستوں کا ایک گروپ موجود تھا اور بڑے غصے کے عالم میں بات ہو رہی تھی۔ ان میں یوسف نسکندی، یار محمد یار بھی شامل تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگ بلوگہ ہو گئے۔ خصوصاً یوسف نسکندی برس پڑے۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔ میں سمجھ گیا کہ میں بھی اس تقسیم میں کسی کے حصے میں پڑ چکا تھا۔ یعنی سرداروں کے۔ خیر بات دوستوں کے مابین تھی۔ پیار بعد میں بھی برقرار رہا اور دوستی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب اس انتہا کی ابتداء ہو چکی تھی جو مختلف شکلوں میں آج بھی جاری ہے۔

''بی ایس او'' کی تقسیم کا یہ واقعہ نہیں بڑا سانحہ تھا۔ رحیم ظفر اس سانحہ کا چشم دید گواہ نہیں بلکہ ایک فعال کارکن بھی تھا اور جو کچھ انہوں نے بیان کیا یہ اس کی آپ بیتی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل انہوں نے جس طرح بیان کئے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ جہاں تک اس کے تجزیہ کی بات ہے اس پر کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں جو کسی وقت کسی احوالے سے اٹھ سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت بلوچستان کی سیاسی قیادت سرداروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ صرف روایتی ہی نہ تھی بلکہ حقیقتاً میں واقع ہوئی تھی۔ وہ ایک سیاسی تحریک کے حوالے سے ابھر کر سامنے آئے تھے۔ زیر بحث واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے ایام میں اسی قیادت کے رشتے ناطے اثر ورسوخ کے حوالے سے چند نوجوان بی ایس او میں شامل تھے۔ جن میں بیزن بزنجو اور امیر الملک مینگل کا نام سرفہرست تھا اور یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انہی نوجوانوں کے احوالے سے بی ایس او کو بلوچستان کی وہ سیاسی قیادت اپنے زیر اثر رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لئے اس طرح کے غیر جمہوری اقدام اٹھائے گئے جس کا رحیم ظفر نے بڑے کرب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یاد رہے کہ یہ ایک سیاسی روایت چلی آ رہی تھی کہ ہر سیاسی گروہ جماعت اپنی ذیلی تنظیم بناتے تھے، جیسا کہ طلباء تنظیم، مزدور تنظیم وغیرہ جو آج بھی جاری ہے، اور بی ایس او کو نیشنل عوامی پارٹی کی بلوچ قیادت یقیناً اپنے حمایتی رکھنا چاہتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کچھ رویوں نے بروہی، مکرانی ناپسندیدگی جو سیاسی وجود کی وجہ سبب سے دھیمی پڑ گئی تھی اب اس طرح بڑے غیر آئینی قدم نے اس کو ہوا دی، نہ صرف یہ بلکہ بلوچ سیاست کے چند اور معتبر شخصیات جو اپنی اندورنی غلط فہمیوں، انا اور ناچاقیوں کی وجہ سے اس طرح قیادت سے علیحدہ یا دور ہو چکے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں سرگرم ہو گئے اور اس کے قیام میں معاون رہے۔ اس واقعہ کے بعد نہ صرف بی ایس او تقسیم ہو گئی بلکہ بلوچ قومی، سیاسی سوچ میں دراڑ پڑ گئے۔ جس کے نتائج بہت دور رس ثابت ہوئے۔

امان اللہ گچکی اور محمد طاہر مرزا جیسے بلوچ سیاسی دانشور بلوچ سیاسی دائرے سے نکل کر پی پی پی میں شامل ہونا ایک نئی سوچ کی بنیاد کا

مظہر ہے۔ وہ بلوچ سیاسی قیادت سے الگ ہوکر ''ہارڈ کور'' پاکستانی سیاست میں شامل ہوگئے اوراس عمل سے بہت سے نوجوان کارکنوں نے بھی یہی نئی سیاسی رخ اختیار کیا۔ کیا یہی وہ نئی سحر تھی جس کی امید لئے بیٹھے تھے۔ اس طرح بی ایس او تقسیم ہوگئی مگر اس سے ایک بڑی ذہنی انتشار بھی پیدا ہوا۔ بی ایس او کی نئی قیادت کو پی پی پی کے سیاسی دائرے میں لانے کی کوشش بھی ہوئی مگر اس میں پی پی میں شامل ہونے والے دوستوں کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ماسوائے چند کے جو نوکریوں کی خاطر شامل ہوئے اور کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ بعد میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے بلوچستان میں فوجی کاروائی شروع کی تو بی ایس او (انٹی سردار) کے بہت سے دوستوں کو آزمائش میں ڈال دیا اور ایک مرتبہ پھر بلوچ سردار سیاسی قیادت منظور نظر ہونے لگی اور قیادت کے لئے ان میں سے چند ایک نے ان کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

جس طرح رحیم ظفر کہتے ہیں کہ متحد ہوکر آل پاکستان نہ بن سکی مگر بی ایس او ہوکر بی ایس او ہی کی مختلف شکلوں میں سامنے آئی اوراس کی تنظیمیں ختم ہوگئیں۔ بی ایس او بٹ گئی۔ مگر پھر بھی ''بی ایس او'' رہی اور ہے۔ بی ایس او ایک مشن کا نام بن گئی تھی اور ہر بلوچ نوجوان اس میں شامل ہونا چاہتا تھا اور ہوا۔ (گو مختلف دھڑوں کی شکل میں) بی ایس او ایک سوچ تھی۔ جو مختلف شکلوں میں آگے بڑھتی رہی اور بڑھ رہی ہے۔ میرے دوست یقیناً مجھ سے اس بات پر اتفاق کریں گے کہ بی ایس او نے عمومی طور پر بلوچ سیاست کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ بلوچ سیاست کو فرسودہ سیاست سے لیکر قومی دھارے میں داخل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے قوم کو ایک سوچ دیا اوراس کو ولولہ دیا۔ ایک جرات دی۔

آخر میں، میں رحیم ظفر کو شاباش دیتا ہوں کہ اس نے ہمت سے کام لے کر تاریخ کے ایک باب کو رقم کیا۔ ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہتا چلوں کہ رحیم ظفر اس جدوجہد سے ہٹ کر ایک گہری سیاسی جدوجہد کا بھی حصہ رہا ہے۔ جس میں کچھ باتیں گفتنی کچھ ناگفتنی ہیں۔ پھر بھی اس امید کے ساتھ میں اپنی تحریر ختم کروں گا کہ وہ کسی وقت کچھ اور رازوں سے بھی پردہ اٹھائیں گے۔

عاقبت باالخیر

ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی

سوردو پنجگور مکران

مورخہ: 10 , 04 , 2011

کچھ کتاب کے بارے میں

زیر مطالعہ یہ کتاب میرے ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مختلف اخبارات، زیادہ تر روزنامہ ''انتخاب'' حب میں قسط وار یا کالم وار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ یقیناً ان کو دھرا کر آپ قارئین کو نہ صرف بور کر رہا ہوں بلکہ آپ کا قیمتی وقت بھی ضائع کر رہا ہوں جس کے لئے میں پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

ان تحریروں کو کتابی شکل دینے میں مجھے سب سے زیادہ اکسانے والوں میں میرا دیرینہ رفیق حکیم بلوچ اور کچھ ہمارے پرانے اور کچھ نئے ''بی ایس او'' والے نوجوان شامل ہیں جو چاہتے ہیں کہ ''بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' اور بلوچستان میں سرگرم سیاسی تنظیموں خاص کر ''نیشنل عوامی پارٹی'' (نیپ) اور اس کی سابقہ مرکزی اور صوبائی قیادت کی ماضی قریب کی تاریخ، کردار، عمل اور سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کر سکیں اور یہ سارا گزشتہ ریکارڈ کتاب کی شکل میں محفوظ رہ سکے۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا بلوچستان کے موجودہ تازہ ترین سیاسی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں 60 کی دہائی سے لے کر 70 کی دہائی تک کے واقعات و حالات، دوستوں کے اصرار پر رقم کئے ہیں کہ قرطاس پر کتابی شکل اختیار کر کے تاریخ کا حصہ بن سکیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اس کتاب میں سارا مواد پرانا ہے کہیں نہ کہیں اس میں کچھ نہ کچھ موجودہ حالات پر بھی خیال آرائی کی گئی ہے خاص کر مضامین میں، لیکن اصل موضوع خصوصی طور پر ''بی ایس او'' اس کی جدوجہد اور اس کی تشکیل سے تقسیم تک کے بنیادی وجوہات پر ہے، تاکہ دور حاضر کے سیاسی اکابرین اور نوجوانوں کو معلوم ہو جائے کہ ''بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن'' کی تشکیل کب اور کن حالات میں ہوئی اور پھر ''بی ایس ای او'' سے ''بی ایس او'' کیسے اور کب بنی کن لوگوں نے بنائی، تاکہ ریکارڈ درست کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد اور غرض نہیں اور نہ ہم خواہ مخواہ کسی کی کردار کشی یا دل آزاری کے لئے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جو گزرا ہے مشاہدے میں رہا ہے اپنی سوچ، یاداشت اور فکر کے مطابق رقم کی ہے۔ باقی جو مزاج یار میں آئے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

میر امان اللہ گچکی، عبدالحکیم بلوچ اور انور ساجدی نے اپنے پیش لفظوں میں ابتدائی حالات و واقعات جو خاص کر کوئٹہ کے طلباء تنظیم ''ورنا وانندہ گل'' اور بلوچستان ''نیپ'' کی قیادت کے بارے میں تفصیلی ذکر فرما کر کتاب کی نفس مضمون کو سمجھنے میں اور آسانی پیدا کی ہے۔ اس

لئے میں ان تینوں حضرات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی کا بھی انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے اس ناچیز اور اس کتاب کے بارے میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر کے مجھے احسان بار کیا ہے۔

آخر میں، میں بلوچستان کے مایہ ناز سیاسی رہنما جناب میر غوث بزنجو کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ اس جیسی بڑی شخصیت نے اپنی کتاب (In search of Solutions) کے صفحہ نمبر 137 میں میرا ذکر بحیثیت رہنما ''بی ایس او'' (انٹی سردار) کیا ہے۔ البتہ میر صاحب نے ''بی ایس او'' کی کنوینشن اور ملک گیر جس الیکشن کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب کی خامیوں یا کمزریوں کے بارے میں آپ کا کوئی بھی مثبت تبصرہ ہمارے لئے رہنمائی کا باعث اور مشعل راہ ثابت ہوگا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

عبدالرحیم ظفر

کراچی، مورخہ: 16/04/2011

سیاسی اختلاف اور شائستگی کی ایک مثال

عبدالرحیم ظفر سے میرا پہلا تعارف ان کی کوئی ایک دہائی قبل شائع ہوئی پہلی کتاب سے ہوا۔ جو بی ایس او کی تشکیل سے تقسیم کی کہانی پر مبنی تھی۔ وہیں سے پتہ چلا رحیم ظفر بی ایس او کی دوسری کابینہ میں مرکزی سیکریٹری جنرل رہے۔ اس کتاب کی حیران بات رحیم ظفر کا مدلل انداز اور شائستہ لہجہ تھا۔ ہماری نسل نے تو سیاسی اختلاف میں ذاتیات اور گالم گلوچ ہی دیکھ رکھی تھی۔ اس لیے یہ انداز بالکل حیران کن تھا۔ مثلاً انھوں نے بی ایس او کی تقسیم کا ذمہ دار بزنجو صاحب کا قرار دیا۔ مگر نہایت احترام سے یہ بھی لکھا کہ بزنجو سے بڑا لیڈر اس خطے نے پیدا نہیں کیا، وہ ہم سب کے سیاسی استاد تھے۔ اسی طرح جب دوسری کتاب لکھی ''آزادی کا سفر''، جس میں ستر کی دہائی میں گوریلا ٹریننگ کے لیے روس کے راستے انھیں عراق پہنچنا تھا۔ روس میں ان کے میزبان جمعہ خان بلوچ نامی شخص تھے، جن کے متعلق انھوں نے اپنی کتاب میں نہایت سخت تنقید کی اور پھر یہی کتاب اسی جمعہ خان کو پیش لفظ کے لیے بھجوادی۔ جمعہ خان نے سو، سوا سو صفحات کی اس کتاب کا تیس صفحات پر مبنی پیش لفظ لکھا اور مصنف کے تمام الزامات کو رد کرتے ہوئے انھیں دروغ گو تک لکھا۔ اس شریف آدمی نے وہ سارا پیش لفظ، لفظ بہ لفظ کتاب میں شامل کیا اور کہا، میں اب بھی اپنے مؤقف پر قائم ہوں اور آپ سے اختلاف رکھتا ہوں، مگر آپ کی رائے کا احترام ہے۔

میں نے ان کی پہلی دونوں کتابوں پر تنقیدی تبصرہ لکھا۔ پہلے تو انھوں نے خط لکھ کر اس تبصرے کی تعریف کی (یہ ایک اور حیرت تھی) پھر انھوں نے فرمائش کر کے پہلے گوادر کتاب میلے میں وہ مضمون مجھ سے پڑھوایا۔ یہ بھی کہا کہ مجھے ان کے کئی نکات سے اتفاق نہیں، مگر انھوں نے جس عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور جس خلوص سے تنقید لکھی، وہ قابلِ احترام ہے۔

ہماری نئی نسل کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین ہوگا۔ ایک طرف ہمارے احباب ہیں جو محض ڈاکٹر کہور خان کا انٹرویو کرنے پر قومی غداروں کی فہرست میں ڈال دیتے ہیں، ایک طرف کہور خان کے ہم عصر یہ بزرگ ہیں جو نہایت شائستگی کے ساتھ ان سے اختلاف کرتے ہیں اور ان پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ مگر اس تنقید میں کوئی ذاتیات نہیں، کوئی ناشائستگی نہیں، کوئی گالم گلوچ نہیں، عامیانہ جملے بازی نہیں، بازاری پن نہیں۔ ہم باہمی احترام کے ساتھ بھی سیاسی اختلاف رکھ سکتے ہیں۔ سیاسی اختلاف بہر صورت قابلِ گردن زدنی نہیں، یہ سیکھنے کو بھی ہمیں ایسے بزرگوں کی تحریریں پڑھنی چاہئیں۔

عابد میر

شال

سنگِ لرزاں.....دوسرا ایڈیشن

میری یہ مذکورہ کتاب ''سنگِ لرزاں'' کی پہلی ایڈیشن 2011ء میں چھپ کر مارکیٹ میں آ گئی تھی۔ اُس وقت اس کتاب کو سوائے چند پڑھے لکھے دانشور اور میرے پرانے رفقائے کار کے باقی تمام لوگوں کی طرف سے خاص پزیرائی نہیں ملی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی اس میں جو مواد بمعہ مضامین کے موجود تھے۔ وہ سب کے سب روزنامہ ''انتخاب'' جب میں پہلے سے چھپ چکے تھے۔ جن کو بعد میں، میں نے کتاب کی شکل میں چھاپ دیا تھا اور اُس کا نام ''سنگِ لرزاں'' رکھا تھا۔ 2011ء اور اس کے بعد جو بلوچ طلباء یا بلوچ دانشور ''بی ایس او'' اور بلوچ سیاسی زعما کے بارے میں حقائق کی تلاش میں سرگرداں تھے اور انہوں نے جب اس کتاب ''سنگِ لرزاں'' کے بارے میں سنا جس میں ان تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور اُن تمام سازشوں پر پردہ اُٹھایا گیا جو ساٹھ (60) کی دہائی میں پیش آئے تھے خاص کر بی ایس او یعنی بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی تاریخ، تشکیل اور تقسیم کے متعلق تو اُن کو اس کتاب ''سنگِ لرزاں'' کو دیکھنے پڑھنے اور اس میں جو مواد موجود تھے جاننے کیلئے تجسس پیدا ہوا۔ لیکن ان کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ پُرانہ ایڈیشن کہیں دستیاب نہیں تھا، نہ گوشہ ادب کوئٹہ میں نہ مرحوم ملا احمد کی تربت کے بک شاپ میں، جن دوستوں کے پاس مذکورہ کتاب کی کاپیاں تھیں وہ اپنی ان کاپیوں کو شیئر کرنے کیلئے اس لئے تیار نہیں تھے کہ اکثر لوگ کتاب کو واپس نہیں کرتے۔

بہر حال میرے کمپوزر اختر قاضی جو کہ کراچی یونیورسٹی کا خود طالب علم ہے اُس کے دوست احباب اور دیگر بہت سارے بلوچ نوجوان طلباء اور دانشوروں کی بے حد اصرار پر ہم نے ''سنگِ لرزاں'' کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کا فیصلہ کیا کیونکہ بحیثیت مصنف میرے پاس بھی صرف ایک کاپی رہ گئی تھی جو میرے ریکارڈ کا حصہ ہے۔ موجودہ جدید ایڈیشن کو ہم نے زیادہ بہتر، عام فہم، جاذب نظر کچھ اضافی مواد کے ساتھ ہر موضوع کو علیحدہ علیحدہ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ پڑھنے والوں اور قارئین کو نفس مضمون اور اصلی تاریخی حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلے میں ہم کہاں تک کامیاب یا ناکام ہوئے ہیں یہ فیصلہ آپ قارئین کو کرنا ہے۔

والسلام و عافیت بخیر

عبدالرحیم ظفرؔ

گنّز ہاؤس اسلام آباد، 17 جولائی 2020

60 کی دہائی میں پاکستان کے سیاسی حالات

پاکستان کی سیاسی کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی 1951ء میں لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیراعظم کی شہادت کے بعد ایک بیوروکریٹ غلام محمد کے زیر اثر آجاتی ہے۔غلام محمد نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان کی سیاسی ہیئت کو مکمل تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ان کی کوشش تھی کہ سول بیوروکریٹ،ٹیکنوکریٹ اور ملٹری کی آمیزش سے اس ملک کو چلایا جائے تاکہ سیاست دانوں کا اثر رسوخ ریاستی معاملات میں کم سے کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہو سکے۔اس لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنے محسن خواجہ ناظم الدین، ملک کے دوسرے سیاسی وزیر اعظم کو برطرف کرتے ہوئے اس کی جگہ ایک ٹیکنوکریٹ محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم نامزد کر دیا۔حالانکہ لیاقت علی خان نے قائداعظم کی وفات کے بعد بنگال کے ایک معتبر ترین سیاست دان خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کیا تھا۔لیکن بنگال کے اس معتبر ترین سیاست دان نے خود لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اس بیوروکریٹ غلام محمد کو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کر کے خود وزیراعظم بن گئے تھے۔

محمد علی بوگرہ بھی ایک بنگالی تھے لیکن وہ سیاست دان نہ تھے بلکہ ایک ٹیکنوکریٹ تھے۔اسی بوگرہ کے دور میں مغربی پاکستان کے قدیم صوبوں، ریاستی علاقوں اور قبائلی علاقوں کی حیثیت ختم کر کے ون یونٹ بنایا گیا تھا۔ان تمام علاقوں پر مشتمل مغربی پاکستان کے نام سے ایک صوبہ وجود میں لایا گیا تاکہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی اکثریت کا مقابلہ کیا جا سکے۔اس کو مختصر کرتے ہوئے ہم یہ وضاحت کیلئے لکھ دیتے ہیں کہ غلام محمد گورنر جنرل جو لقوا اور فالج کے مریض تھے ایک ملٹری بیوروکریٹ اسکندر مرزا نے برطرف کرتے ہوئے اس کی جگہ خود گورنر جنرل بن گئے۔اس کے بعد اقتدار کی غلام گردشوں میں ہلچل جاری رہی لیکن اس ہلچل میں سیاست دانوں کا کردار صفر کے برابر تھا۔اسی دوران اسکندر مرزا جنہوں نے پارلیمانی طرز حکومت کو ختم کرتے ہوئے 1956ء کے آئین کے مطابق اپنے آپ کو صدر منتخب کرا کر ملک میں صدارتی طرز حکمرانی نافذ کی۔آخر کار 7 اکتوبر 1958ء میں اسی اسکندر مرزا نے ملک میں مارشل لاء لگا کر 1956ء کے آئین کو بھی معطل کر دیا اور ایوب خان جو افواج پاکستان کے پہلے ملکی کمانڈر انچیف تھے، چیف مارشل لاء ایڈمینسٹریٹر مقرر کر دیا۔پھر تین ہفتوں کے بعد یعنی 26 اور 27 اکتوبر 1958ء کو رات کے اندھیرے میں ایوب خان نے اسکندر مرزا کو برطرف کرتے ہوئے ایک ہوائی جہاز میں بیٹھا کر لندن جلاوطن کر دیا اور خود نہ صرف صدر پاکستان بن گئے بلکہ اپنے آپ کو فیلڈ مارشل کے عہدے تک بھی خود ہی پہنچا دیا۔ جنرل ایوب خان کا دور بہت ہی استبدادی دور تھا۔ان کو ایک طرف پوری افواج پاکستان کی مکمل حمایت حاصل تھی دوسری طرف مملکت کا سب سے بڑا عہدہ یعنی صدر پاکستان کا بھی ان کے پاس تھا۔

انہوں نے آتے ہی تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کردی، مشرقی اور مغربی پاکستان کے تمام نامور سیاست دانوں کو ایک مارشل لائی حکم نامے کے ذریعے ایبڈو قرار دیا گیا۔ اس ایبڈو (EBDO) کا مطلب ہے (Elective Bodies Disqualitcation Order) اس کے علاوہ 1960ء میں پریس آرڈیننس میں ترمیم کر کے پریس کو مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں رکھا۔ ٹریڈ آرگنائزیشن، لیبر یونین اور طلباء پر گہری نظر رکھ کر وقتاً فوقتاً ان کو سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ تمام مساجد کے امام کو بھی تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے خطبے اور واعظ میں سیاست پر بات نہیں کر سکتے۔ ان حالات میں بلوچوں اور بلوچستان کی سیاست کرنا بہت ہی کٹھن مشکل کام تھا۔

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن

یہ غالباً 1960ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب بلوچستان کے کچھ طلباء کوئٹہ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے کراچی آئے۔ ان میں سے کچھ ڈاؤ میڈیکل کالج، این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں کچھ کراچی یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں ماسٹر کرنے کیلئے داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں کراچی میں دو طلباء تنظیمیں ایک نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) دوسری جمعیت طلباء جو جماعت اسلامی کی ذیلی طلباء تنظیم تھی۔ یہ دونوں تنظیمیں ایک دوسرے کی ضد الگ الگ مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ این ایس ایف کے طلباء کی سیاسی وابستگی فکر و فلسفہ بائیں بازو کی سیاسی تنظیموں سے تھی اور اس میں زیادہ رہنما اور سرگرم ممبرز مارکیسٹ، لینسٹ تھے۔ جبکہ جمعیت دائیں بازو کے مذہبی اور سرمایہ دارانہ طرز معیشت اور سیاست کی پرچار کرتی نظر آتی تھی۔ یہ دونوں طلباء تنظیمیں کراچی کے ان تمام مشہور و معروف درسگاہوں بشمول کراچی یونیورسٹی اپنی اپنی اثر و رسوخ رکھتی تھیں۔ چونکہ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے یہ بلوچ طلباء بھی بائیں بازو کی ترقی پسند جدید دور کے فکر و فلسفہ سے متاثر تھے اس لئے انہوں نے ابتدائی طور پر این ایس ایف سے وابستگی اختیار کی اور اس کی پلیٹ فارم سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان دونوں طلباء تنظیموں کے درمیان مختلف سرگرمیوں کے دوران کراچی یونیورسٹی، ڈاؤ میڈیکل کالج، این ای ڈی انجینئرنگ کالج اور دیگر تعلیمی درسگاہوں میں وقتاً فوقتاً آپس میں جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب بلوچستان، لیاری اور کراچی کے بلوچ طلباء اور سیاسی کارکنوں نے این ایس ایف کو سپورٹ کرنا شروع کر دیا تو این ایس ایف کی صفوں میں زیادہ خود اعتمادی آ گئی اور پھر انہوں نے ان تمام درسگاہوں میں اپنی جارحانہ سیاسی سرگرمیوں کو زیادہ شدت سے جاری و ساری رکھا۔ ان بلوچ طلباء کو بھی اس دوران سیاسی سرگرمیوں کے متعلق تجربہ اور زیادہ جان کاری حاصل ہوئی۔ یہ سینئر بلوچ طلباء جناب مرحوم طاہر محمد خان یا طاہر مرزا، مرحوم چنگیز عالیانی، مرحوم محمد قاسم، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی، محمد یعقوب بزنجو، غالباً سردار فتح محمد بزدار بھی اسی بیچ میں شمار ہوتے ہیں۔ این ایس ایف کے جو سینئر طلباء رہنما تھے ان کے نام یہ تھے۔ حسین نقی، جوھر بٹ، شیر افگن اور ان کے بعد معراج محمد خان (مرحوم)، ڈاکٹر رشید، محمد امین فاروقی اور دیگر بہت سے نام جو یاد نہیں آ رہے ہیں۔

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور اعلان تاشقند

جولائی 1965ء میں اسلامیہ کالج کراچی کے فرسٹ ائیر کے میرے کچھ دوستوں نے بشمول میرے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے خرچے پر پنجاب اور سرحد کے دورے کا پروگرام بنایا۔اس پروگرام کو آخری شکل ہمارے ایک کلاس فیلو دوست شیخ ریاض نے دی جن کا تعلق پنجاب کے شہر چنیوٹ سے تھا۔شیخ صاحب کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق ہمارا پہلا پڑاؤ لائل پور (فیصل آباد) میں ہوا۔لائل پور ان دنوں بیک وقت ایک زرعی اور صنعتی شہر کی حیثیت سے بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔لائل پور سے تھوڑے فاصلے پر ہمارے دوست کا آبائی شہر چنیوٹ واقع تھا اس لئے لائل پور سے ایک دن کے لئے ہم چنیوٹ گئے ہمیں بتایا گیا کہ چنیوٹ میں قادیانی فرقے کے لوگ اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں لیکن وہاں جو دیکھنے کی چیز ہے وہ ہے ایک قدیم چھوٹی سی مسجد جو مغلوں کے دور میں تعمیر کی گئی تھی اور اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس کا اکلوتا گنبد ''سنگِ لرزاں'' سے بنایا ہوا ہے۔اس لئے ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لئے دلچسپی کا مرکز بنایا ہے۔یقیناً ہمارے ذوقِ تجسس کا مرکز بھی وہی مسجد تھی جس کو عملی طور پر دیکھنے کے بعد ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔فنِ تعمیر کی حیران کن بات یہ تھی کہ اس کا ایک ہی گنبد تھا جو مسجد کے سامنے والی دیوار کے بیچوں بیچ تعمیر کیا گیا تھا جو اچھے خاصے حجم کا دکھائی دیتا تھا اس پر چونے کا موٹا پلستر کیا ہوا تھا ہم مسجد کے موذن اور نگران کی رہنمائی میں سیڑھیاں چھڑ کر چھت پر پہنچے اور جوں ہی سب نے اس کو مل کر اپنے ہاتھوں سے دھکا دیا تو وہ ایسا ہلنے اور جھولنے لگا جیسے کہ درخت کی ٹہنی ہو ہم یہ عمل دہراتے رہے اور گنبد لرزتے ہلتے اپنی جگہ پر آ کر ساکت ہوتے رہے۔ہمارے استفسار پر موذن نے بھی بتایا کہ اس کی تعمیر ''سنگِ لرزاں'' سے کی گئی ہے۔یعنی وہ پتھر جو لرزتے ہیں۔یہ مسجد ہمارے لئے ایک عجوبہ سے کم نہ تھی یہ تو مجھے بعد میں اپنے ایک ایرانی بلوچ دوست سے معلوم ہوا کہ یہ ایرانی فنِ تعمیر کا ایک عام ڈیزائین ہے اسی قسم کی ایک بڑی مسجد ایرانی شہر مشہد میں بھی ہے جس کے چار مینار ہیں کسی بھی ایک مینار کو ہلانے سے باقی تین مینار خود بخود ہلنے لگتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ مغلوں کے دور میں جتنی تعمیرات ہوئیں ان کے تعمیراتی ماہرین ایرانی تھے اس لئے فنِ تعمیر کے حیران کن نمونے پورے برصغیر میں آج بھی سیاحوں کی دلچسپی اور توجہ کے مراکز بنے ہوئے ہیں۔

ہم لائل پور سے لاہور، لاہور سے پشاور تالنڈی کوتل وہاں سے راولپنڈی، اسلام آباد اور مری کی سیر و تفریح سے بھرپور ٹور مکمل کر کے جب ستمبر میں کراچی واپس پہنچے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کا بقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔اگر کچھ دن اور دیر سے پہنچتے تو ہم شاید پنجاب میں پھنس جاتے کیونکہ اس دوران آمد و رفت کے ذرائع محدود ہوتے جا رہے تھے۔چونکہ پاکستانی مسلح افواج کا تعلق پنجاب سے ہے اس لئے جنگ کا زور بھی پنجاب پر تھا جہاں سخت قسم کی بلیک آؤٹ نافذ رہتی تھی۔لیکن کراچی بھی کچھ کم متاثر نہ تھا اس لئے کہ کراچی

پاکستان کا واحد پورٹ نیول بیس اور سب سے زیادہ آمدنی مہیا کرنے والا صنعتی وتجارتی شہر ہے جس پر پورے پاکستان کی معیشت کا دارو مدار ہے اس لئے کراچی بھی پوری طرح ریڈ الرٹ تھا۔

جب ہم چھٹیاں گزارنے کے بعد (کچھ لیٹ) کالج پہنچے تو دیکھا کہ کچھ فوجی جوان پرنسپل جی ایم سید کے دفتر کے سامنے کھڑے ہیں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ فوجی آفیسر پرنسپل سے رضا کار طلباء کی ٹیم مانگ رہے تھے جو کراچی کی آرمی کے بھرتی کے دفتر میں فرائض انجام دیں گے۔ چونکہ ہم کچھ لڑکے کالج میں ''این ایس ایف'' کے حوالے سے زیادہ سرگرم ہوتے تھے اس لئے میرا نام بھی ان رضا کاروں میں شامل کیا گیا تھا۔ دوسرے دن صبح جب میں اور کچھ طلباء ساتھی آرمی کے بھرتی کے مرکز پہنچے تو ہمیں ان تمام سول انجینئرز، مکینک، ڈرائیور، ڈسپنسرز، الیکٹریشن وغیرہ کے تفصیلی کوائف جمع کرنے پر مامور کیا گیا جو اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کر رہے تھے یا جن کے نام مختلف ایجنسیز کی طرف سے بمعہ اس شخص کے پیش کئے گئے تھے۔ ہمارا کام ان کے تفصیلی کوائف جمع کر کے افسر مجاذ کو پیش کرنا تھا۔ ہم اپنے اس کام میں مشغول تھے کہ ایک دن ایک ماہر مکینک جو درمیانی عمر کا شخص تھا میرے سامنے پیش ہوا اور میں حسب معمول اس سے سوال وجواب میں مصروف تھا کہ اچانک اس نے بڑا معصوم چہرہ بنا کر روتے ہوئے مجھ سے دستہ بستہ گزارش کی کہ میں اس کے کوائف افسر مجاذ تک جانے سے روکوں، یعنی گول کر دوں میں نے کہا تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مروانہ چاہتے ہو، یہ بہت بڑا جرم ہے، ملک حالت جنگ میں ہے ایمرجنسی نافذ ہے، ہر شہری کو اپنا فرض اور حق ادا کرنا ہے اور ایک تم ہو کہ، اس سے پہلے کہ میں اپنا جملہ مکمل کرتا، اس نے کہا نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں آپ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتے جو میرے بس سے باہر ہیں میری ضعیف والدہ بستر مرگ پر ہے، میرے گھر میں کوئی اور نہیں میں ہی اس کا واحد کفیل اور واحد شخص ہوں اگر میں مجاذ جنگ پر گیا تو وہ جیتے جی مر جائے گی اور اگر میں زندہ بچ کر واپس آجاؤں تو میں بھی یہ بوجھ لے کر زندہ نہیں رہ سکوں گا، اس نے اپنا دکھڑا اس انداز سے بیان کیا اور اس کے الفاظ میں اس قدر اثر تھا کہ میرا دل بھی پسیج گیا کیونکہ آخر میں بھی انسان ہوں اور میں نے سوچا ایسا واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے، رشتہ بھی ایسا مقدس ماں اور بچے کا ،قدرت کے اس تخلیق کا جس پر شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ رشتہ ایک دوسرے سے ایسا پیوست رشتہ ہے جس کو جدا کرنا بہت مشکل ہے یعنی اگر ماں کے پیٹ سے ایک ایسے بچے کو مارنا ہے جس نے سانس لینا شروع کر دیا ہے تو ضروری نہیں کہ ماں بچ جائے اور فقط بچہ مر جائے اس میں دونوں کی زندگیاں داؤں پر لگی ہوتی ہیں اور یہی ایک ایسا رشتہ ہے جس پر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ باپ تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ خدا معلوم وہ شخص اداکاری کر رہا تھا، لیکن مجھے اس نے متاثر کیا اور میں نے اس کو کہا تم رفو چکر ہو جاؤ تمہارے لئے میں یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوں ۔ وہ میرا ہاتھ چوم کر چلا گیا اور میں نے اپنے دل سے ایک بوجھ کو ہلکا ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

1965ء کی جنگ زور پکڑتی گئی، عوام میں بڑا جوش وجذبہ تھا۔ ریڈیو پاکستان کے شکیل احمد نے اپنے گرجدار الفاظ کے زور سے ہلواڑہ اور ہندوستان کے بہت سے مقامات کو فتح کیا۔ مادام نور جہاں اور دوسرے گوئیوں نے ''جنگ کھیڑنیں ہندی زنانیاں دی''، ''

میرے ڈول سپاہیاں تینوں رب دیاں رکھاں'' گا کر عوام کے جذبہ جہاد کو اور جلا بخشی، پریس پر حکومت کا کنٹرول تھا اس لئے اس نے بھی اپنی غیر حقیقیت پسندانہ خبروں سے عوام کو اندھیرے میں رکھا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ کچھ دنوں میں پاکستانی افواج کا دہلی اور ہندوستان کے دیگر شہروں پر قبضہ ہو جائے گا لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ حقائق کا علم محض چند جرنیلوں کو تھا اور ان کو جلد اس بات کا احساس ہوا کہ یہ جنگ اگر مزید چند دن جاری رہی تو ان کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی سپر طاقت سویت یونین نے جوں ہی مداخلت کر کے جنگ بندی کے لئے ہندوستان اور پاکستان سے رابطہ کیا تو دونوں جنگ بندی کے لئے راضی ہو گئے، سویت یونین کی پختہ قیادت کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ یہ جنگ اس کے حریف امریکہ کے مفادات کی خاطر شروع کی گئی ہے اس لئے اس کے مفاد کو زچ کرنے کے لئے اس جنگ کو روکنا ضروری ہے اور یہی بات پاکستانی جرنیلوں کے مفادات میں بھی تھی وہ بھی اس انتظار میں تھے کہ کوئی تو آ کر ان کی عزت بچائے۔ چنانچہ جنگ بند ہو گئی اور دونوں فریق روس کے کہنے پر تاشقند میں مزاکرات پر آمادہ ہو گئے۔

جب وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری اور پاکستان کے مطلق العنان صدر چیف مارشل ایوب خان مذاکرات کے لئے تاشقند پہنچے تو پاکستان کے عوام انتہائی سراسیمگی کی حالت میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے کہ جب ہماری افواج کا پلہ (بقول حکمرانوں کے) بھاری تھا تو جنگ بندی اور مذاکرات کی کیا ضرورت ہے۔ عوام یہ سوچنے میں اس لئے حق بجانب تھی کہ ان کو مکمل طور پر اندھیرے میں رکھا گیا تھا اس لئے جب ایوب خان نے تاشقند معاہدے پر ہندوستانی شرائط کے مطابق فیصلہ کرنے کی حامی بھر لی تو یہ تاثر عام ہوا کہ جنگ پاکستان میدان کارزار میں جیت چکا تھا وہ تاشقند کے مذاکرات کی میز پر ہار گیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو (شہید) جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے بحیثیت وزیر خارجہ اس معاہدے پر دستخط کر دیتے تو اس کا سیاسی مستقبل بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا اس لئے انہوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور یہیں سے اس جنگ کا آغاز ہوا جس نے دو قومی نظریہ کی غیر منطقی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔

پاکستان اور اسرائیل دنیا کے دو ایسے ممالک ہیں جو مذہب کو اپنی مملکت کا بنیادی وجہ جواز تصور کرتے ہیں اور دونوں آج تک مشکلات کے شکار چلے آ رہے ہیں معاشرتی علوم کی روشنی میں کسی مملکت کے وجود کا محض مذہبی بنیاد نا کافی ہے اس لئے اس میں اور بہت سے عوامل کا بھی کارفرما ہونا ضروری ہے اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح مذہب اسلام براعظم ایشیاء، براعظم افریقہ اور کسی حد تک براعظم یورپ کے بہت سے ممالک میں قائم دائم ہے حتیٰ کہ روس جیسے سابقہ کمیونسٹ ملک میں بھی مسلمانوں کو اپنے مذہبی رسومات ادا کرنے کی مکمل آزادی تھی لیکن یہ سارے ممالک ایک مملکت میں ضم نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک جن میں مشرق وسطیٰ کے بہت سے اسلامی ممالک ایک خدا، ایک رسول ایک کتاب حتیٰ کہ ایک ثقافت ایک زبان ایک مذہب پر یقین رکھتے ہیں لیکن پھر بھی مختلف ممالک کی شکل میں الگ الگ اقتدار اعلیٰ کے ساتھ نظام حکومت چلا رہے ہیں چنانچہ ثابت ہوا کہ محض مذہب کی بنیاد پر کسی ملک کا وجود زیادہ دیرپا

نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس ملک کے باسیوں کو عملی طور پر یہ احساس نہ دلایا جائے کہ اس ملک یا ممالک کے تمام شہری حقوق اور وسائل میں ان کا برابر مساویانہ حق ہے۔

پورے ملک میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ جو جنگ پاکستان میدان جنگ میں جیت رہا تھا وہ تاشقند کی میز پر ہار گیا ہے اور اس کی ساری زمہ داری جنرل ایوب پر ہے ذوالفقار علی بھٹو اعلان تاشقند کی مخالفت کی بنیاد پر وزارت خارجہ کے منصب سے ہاتھ دھو بیٹھا لیکن پاکستانی عوام بالخصوص پنجاب کے لوگوں نے اس کو اپنا ہیرو بنالیا، ہندوستان کا پلہ نہ صرف میدان جنگ میں بھاری تھا بلکہ وہ تاشقند کی میز پر بھی وہ جنگ جیت چکا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری کا ہندوستان جاتے ہوئے خوشی کے مارے راستے میں ہی ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔

ہمارا پہلا مظاہرہ

ہم ان دنوں ''نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' (این ایس ایف) کے پلیٹ فارم پر سرگرم عمل تھے جس کے قائدین شیر افگن، جوہر، نواز بٹ، معراج محمد خان وغیرہ تھے ہمیں ہمارے ایک عزیز دوست اور کلاس فیلو محمد امین فاروقی نے ''این ایس ایف'' کا اس وقت ممبر بنایا تھا جب ہم میٹرک میں ''جامعہ ملیہ ملیر'' کے اسکول میں زیر تعلیم تھے امین فاروقی کا ''این ایس ایف'' کے مرکزی قائدین سے قریبی رابطہ تھا۔ امین فاروقی نے مجھ سے رابطہ کر کے اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم لوگ اعلان تاشقند کے خلاف اسلامیہ کالج سے جلوس نکالیں۔ غرض صبح کالج پہنچ کر ہم چند دوستوں نے اپنی کاروائی شروع کی۔ طلباء کو ویسے بھی پڑھائی سے زیادہ ہنگامہ پسند ہوتا ہے اس لئے کالج کے طلباء کو کالج کے مین گیٹ پر جمع کرنے میں ہمیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی کہیں سے خالی ڈرم لا کر اس پر چڑھ گیا اور تقریر شروع کر دی لوگوں میں اعلان تاشقند کے خلاف پہلے سے غصہ بھرا ہوا تھا اور ہمارا حدف بھی تاشقند معاہدے کے خلاف تھا اس لئے تھوڑی دیر میں ایک اچھا خاصا مجمع لگ گیا، میں نے اعلان کیا کہ یہ جلسہ یہاں ختم نہیں ہوگا بلکہ ہم لوگ جلوس کی شکل میں مزار قائد سے ہوتے ہوئے صدر جائیں گے اور وہاں جلسہ کریں گے۔ چنانچہ ہم چند لڑکے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ اعلان تاشقند مردہ باد، ایوب خان مردہ باد، ہندوستان مردہ باد، پاک چین دوستی زندہ باد وغیرہ وغیرہ۔

جلوس رواں دواں تھا جوں ہی ہم آگے بڑھتے گئے مجمع میں بھی اضافہ ہوتا گیا انتظامیہ کے بڑے بڑے اہلکار کمشنر، ڈی سی، ڈی آئی جی مجسٹریٹ وغیرہ پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ دور دور جلوس کے ساتھ چل رہے تھے لیکن انہوں نے کہیں بھی رخنہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور جلوس بھی ابھی تک بڑا پُر امن تھا جب ہم پرانی نمائش کے قریب پہنچے تو اچانک میری نظر معراج محمد خان پر پڑی جو جلوس کی قیادت کرنے کے لئے پہنچ چکے تھے شاید امین فاروقی نے اس کو پیشگی اطلاع دی تھی وہ میرے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور مجھے کہا کہ جلوس کو صدر سے سیدھا چین کے سفارتی مشن پر لے جانا ہے جو فریئر ہال کے پچھلے حصہ میں واقع تھا معراج کے آنے کے بعد میں نے دیکھا کسی نے وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری کا ایک پُتلا اٹھایا ہوا ہے اور آگے چلنے کی کوشش کر رہا تھا ہم میں اس قدر سیاسی پختگی نہ تھی اس لئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ معراج یہ جلوس چین کے سفارتی مشن تک لے جا کر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے، شاید چین نواز اور ماسکو نواز کے جراثیم پاکستان کے بائیں بازو کے طلباء تنظیموں میں آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔

جلوس چین کے سفارتی مشن کے سامنے پہنچ چکا تھا اور ہم کچھ قائدین دربان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمیں کونسل جنرل یا سفیر سے ملنے دیا جائے۔ دربان نے آ کر اطلاع دی کہ آپ چند لڑکے اندر آ سکتے ہیں ہمارے ساتھ دس پندرہ لڑکے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے باقی

لڑکوں کو لان میں کھڑا کر کے میں اور معراج جب ہال کے اندر پہنچے تو ایک شخص صفائی میں مشغول تھا اس نے ہم کو اشارتاً کچھ دیر انتظار کے لئے کہا اور خود اندر چلے گئے، جب کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے واپس آیا تو وہی شخص تھا اور اس کے ساتھ ایک اچھی خاصی اردو بولنے والے چینی ترجمان بھی تھے اور وہی شخص غالباً کونسل جنرل تھا جو تھوڑی دیر پہلے خود سفارت خانے میں صفائی کر رہا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ لان میں آیا اور ہمارے مدعا سمجھنے کے بعد دربان سے کہا دروازہ کھول دیں، جب دروازہ کھلا تو پورے سفارت خانے کا گیٹ اور روڈ تک مکمل پیک ہو گیا۔ کچھ منچھلوں نے اس کو کندھے پر اٹھایا اور اس نے چینی زبان میں تقریر کی، اس سے پہلے کہ ترجمان کچھ کہتا، ہم سب نے بغیر سمجھے زوردار تالیاں بجائیں اور پاک چین دوستی زندہ باد کے زوردار نعرے شروع کر دیئے جب معراج نے ترجمان کے ذریعہ اس سے کہا کہ ہمیں شاستری کا پُتلا جلانے کے لئے کچھ پیٹرول دیدیں تا کہ یہ پُتلا ہم باہر گیٹ کے سامنے نذر آتش کر دیں تو اس نے کہا تیل بے شک لے لیں لیکن پُتلا یہاں نہیں کہیں اور جا کر جلائیں۔ ہم بڑی دھکم پیل کے بعد وہاں سے باہر آئے اور اعلان کیا کہ جلوس صدر سے گھومتے ہوئے برنس روڈ جائے گی ایسا لگ رہا تھا جیسے معراج ضرور پولیس کے ساتھ کچھ جھڑپ کرانا چاہتے تھے جب ہم ریکس سنیما کے قریب پہنچے تو کچھ لڑکوں نے زبردستی قریبی پیٹرول پمپ سے ایک گیلن پیٹرول لیا اور ریکس سنیما کے سامنے پُتلے کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس نے جو بہت ہی صبر و تحمل سے کام لے رہی تھی آنسو گیس اور لاٹھی چارج شروع کر دیا اور پھر جلوس تتر بتر ہو گیا۔

بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن

دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ عبدالغفار ندیم رنچھولائین کے سندھی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ اس وقت ''بی ایس ای او'' کے صدر تھے۔ عبدالغفار ندیم سے میری رشتہ داری بھی ہے اس لئے میں اس سے ملنے ہوٹل چلا گیا تا کہ اس کو اپنے کل کے کارنامے کے بارے میں بھی بتاؤں، میں ناپختگی کی وجہ سے یقین کی حد تک یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی مجھے داد ملنی چاہئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ غفار کے ساتھ صدیق آزاد بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہیں پہلی مرتبہ صدیق آزاد سے ملاقات ہوئی، صدیق ملیریا کی وجہ سے بہت کمزور لگ رہے تھے۔ حال احوال کے بعد جب میں نے اعلان تاشقند کے خلاف کل کے جلسہ جلوس کا قصہ بیان کرنا شروع کیا اور داد تحسین کا منتظر تھا کہ اچانک حسبِ معمول غفار ندیم نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری ذہنی سطح اور معلومات کیا ہیں، غفار نے مجھے خوب ڈانٹا۔ ان کا استدلال تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل غلط کیا ہے کیونکہ بلوچ قوم پرست تنظیمیں اعلان تاشقند کی حمایت کرتی ہیں۔ چونکہ یہ معاہدہ روس نے کرایا ہے جو ساری دنیا کی مظلوم قوموں کا ہمدرد اور مددگار ہے ان کی جدوجہد میں ہر قسم کا تعاون کرتا ہے اس لئے ہم بلوچ طلباء اور بلوچ سیاست دان معاہدہ تاشقند کو مکمل سپورٹ کرتے ہیں۔ وہاں چین نواز جراثیم پھیل چکے تھے اور یہاں ماسکو یا روس نواز جراثیم نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ جناب ہم نے جو کچھ کیا اپنی تنظیم ''این ایس ایف'' کے حوالے سے کیا اور ایوب خان کے خلاف کیا، جو سب کا دشمن ہے وہ بلوچ سیاستدان اور بلوچستان کا بھی دشمن ہے انہوں نے بلوچ لیڈروں کو بھی اذیتیں پہنچائیں وغیرہ وغیر۔ بہت سی مثالوں اور دلائل کے بعد انہوں نے (دونوں) نے مجھے قائل کر لیا اور یہیں سے مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اپنی بھی ایک طلباء تنظیم ''بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن'' کے نام سے موجود ہے جو کہ کوئٹہ کے ''ورنا وانندہ گل'' کا تسلسل ہے جس کو بلوچستان کے سینئر طلباء نے تشکیل دیا ہے۔ اس کے بعد غفار اور صدیق آزاد کے توسط سے اس تنظیم کے دوسرے بانی ارکان سے بھی میری ملاقات ہوئی جو میری یادداشت کے مطابق یہ تھے۔ طاہر محمد خان، مرحوم چنگیز عالیانی، ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی، یعقوب بزنجو، مرحوم ڈاکٹر موسیٰ، مرحوم محمد قاسم (سیوا کنج) وغیرہ، یہیں سے میں بھی بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن کا رکن بنا اور میرا نام بھی بی ایس او کے ابتدائی ارکان میں شامل ہو گیا۔ اس زمانے میں بلوچ طلباء بہت محنت کرتے تھے وہ نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرتے تھے اور اس سے اپنے پڑھائی کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دن رات اپنی قوم کی نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرنے میں بھی مصروفِ عمل رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر ریڈیو پاکستان کراچی کے بلوچی شعبہ خبر نامہ میں ملازمت کرتے تھے۔ یاد رہے کہ ان دنوں روزانہ شام تقریباً ۵ بجے ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی، سندھی، پشتو اور کشمیری زبانوں میں

خبریں نشر ہوتی تھیں، سنا ہے کہ یہ علاقائی زبانوں کی نشریات شروع کرنے کا سہرا سید ظہور شاہ ہاشمی اور اس کے چند لیاری کے دوستوں کے سر جاتا ہے۔

بلوچستان کے یہ سینئر طلباء جو این ایس ایف کے پلیٹ فارم سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے، انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بلوچ طلباء کیلئے ایک علیحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ اس طرح کا ایک پلیٹ فارم ''ورنا وانندہ گل'' کے نام سے کوئٹہ میں موجود تھی اور کوئٹہ ڈگری کالج میں انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھی ہوئی تھیں۔ ورنا وانندہ گل کے پہلے صدر عبدالحکیم بلوچ تھے۔ اس کے ساتھ صدیق آزاد، صورت خان مری اور کچھ طلباء تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں سرگرم عمل تھے اور ان کو نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کی حمایت بھی حاصل تھی۔ کوئٹہ والے طلباء کی خواہش تھی کہ کراچی کے بلوچ طلباء تنظیم کا نام بھی ''ورنا وانندہ گل'' رکھ دیا جائے۔ لیکن کراچی میں زیر تعلیم سینئر بلوچ طلباء کا خیال تھا کہ کراچی کے بلوچوں کیلئے یہ نام مشکل ہوگا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ملیر، لیاری اور دیگر مصافاتی علاقوں میں جو بلوچ طلباء زیرِ تعلیم ہیں ان کو بھی اس نئی تنظیم کے پلیٹ فارم پر لا کر سرگرم کیا جائے۔

چنانچہ کافی سوچ و بچار اور مشاورت کے بعد انہوں نے ''بلوچ ایجوکیشنل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' کے نام پر اتفاق کرتے ہوئے اس تنظیم کی بنیاد اکتوبر 1962ء کو رکھ دی۔ اس میں لفظ ''ایجوکیشنل'' اس لئے شامل کی گئی تھی کہ حکومت کو یہ سیاست کے بجائے محض تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف طلباء تنظیم لگے۔ اس علیحدہ تنظیم کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ بلوچ طلباء کے مسائل باقی دیگر طلباء سے یکسر مختلف تھے۔ ان کے کراچی کے درسگاہوں میں داخلے کے مسائل، ان کے حکومت کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ کے مسائل، ان کے کراچی میں رہنے کے مسائل، کراچی یونیورسٹی، ایس ایم کالج وغیرہ میں ان کے ہاسٹل کے داخلے اور دیگر مسائل تھے جن پر دوسرے مسائل سے ہٹ کر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

میری یادداشت کے مطابق ''بلوچ اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل آرگنائزیشن'' (بی ایس ای او) اکتوبر 1962ء میں تشکیل پا گئی تھی جس کا پہلا صدر مرحوم چنگیز عالیانی 63-1962ء دوسرا صدر سردار فتح محمد بزدار 64-1963ء اور تیسرا صدر مرحوم عبدالغفار ندیم 65-1964ء تھے جس کے دور صدارت کے دوران جنرل باڈی کے اجلاس میں جو انتخابات کے لئے بلایا گیا تھا تو ایک قرارداد کے ذریعہ متفقہ طور پر بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن سے لفظ ''ایجوکیشنل'' کو حذف کر کے صرف ''بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' (بی ایس او) نام کی منظوری دی گئی تھی۔ چونکہ اسٹوڈنٹس کا تعلق ہی ایجوکیشن سے ہے اسی لئے ایجوکیشن لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جس وقت بی ایس ای او تشکیل پا گئی تھی اس وقت ایوب آمریت کا سخت ترین دور تھا اور سیاسی سرگرمیوں پر سخت ترین پابندی عائد تھی اس لئے بی ایس ای او کے بانی ارکان نے کسی قدغن اور پابندی سے بچنے کے لئے لفظ ایجوکیشن کا اضافہ حکومت وقت کو یہ تاثر دینے کے لئے کیا تھا کہ اس تنظیم کی سرگرمیاں محض تعلیمی

معاملات تک محدود رہیں گی۔اس لئے بی ایس او نام کی منظوری 66-1965ء میں دی گئی تھی۔جو لوگ بار بار لکھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ بی ایس او 1967ء میں بنی تھی یہ بالکل غلط ہے۔1967ء میں بی ایس او نہیں بنی تھی بلکہ اس کی تقسیم کا عمل شروع ہو گیا تھا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

بی ایس او ایک فعال منظّم تنظیم

(بھرپور جدوجہد کا آغاز)

بی ایس او میں شمولیت کے بعد میری شعوری سیاست کا سمت متعین ہو گیا تھا اور ہم نے بھرپور جدوجہد کا آغاز کر لیا تھا۔ اسلامیہ کالج کا یونٹ انچارج بننے کے بعد میں نے اپنے اسلامیہ کالج، ملیر کے دوستوں، جاننے والوں سے بڑی سرگرمی سے رابطہ شروع کر دیا اور ان کو ''بی ایس او'' میں شامل کر کے سرگرم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ پورے کراچی خاص کر لیاری میں ہماری تنظیم کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ''قافلہ چلتا گیا کارواں بنتا گیا'' کے مصداق ہم لوگ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود آگے بڑھتے گئے اور ایک وقت آیا کہ ''بی ایس او'' اس قابل ہوا کہ کراچی یونیورسٹی جیسے بڑے ادارے میں ''بلوچی دیوان'' منعقد کرنے میں کامیاب ہوئی، بی ایس او ''بلوچی دیوان'' کے ذریعہ نہ صرف بلوچی ثقافت موسیقی یعنی ساز و زیمل کو متعارف کرانے میں کامیاب ہوئی تھی بلکہ بلوچستان کے سیاسی معاشرتی و معاشی مسائل کو بھی ملک کے سب سے بڑے تعلیمی درسگاہ میں اجاگر کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ نہ صرف بلوچ طلباء کے مشکلات ملکی اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں کے سامنے آشکار ہوتے تھے بلکہ بلوچستان کے متعلق عالمی سطح پر حقائق کا بھی پتہ چلتا تھا اس لئے کہ کراچی یونیورسٹی میں اچھی خاصی تعداد میں غیر ملکی طلباء زیرِ تعلیم تھے۔ میری یادداشت کے مطابق دوسری بلوچی دیوان عبدالغفار ندیم کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اس وقت جناب اشتیاق حسین قریشی کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس دیوان میں بلوچستان اور کراچی کے نامور فنکاروں کو مدعو کیا گیا تھا فیض محمد مرید بلیدئی جاڈک شفیع ستار عزیز خاص فنکاروں میں شامل تھے۔ یونیورسٹی کی کنوکیشن حال ملکی اور غیر ملکی طلباء اور دیگر مہمانوں سے کچا کچ بھرا ہوا تھا۔ جب موسیقی کا پروگرام شروع ہوا تو اس قدر شور شرابہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور نہ کسی کو سُجائی دے رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ مجبوراً اسٹیج سیکریٹری کو فیض محمد کو بلانا پڑا حالانکہ اس وقت شفیع اور ستار بہت ہی خوبصورت دھن پر ایک بلوچی سوت گا رہے تھے لیکن ان کو اس دھیمے سُر میں طلباء سننے کے لئے تیار نہ تھے گانا بھی ان کو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جب فیض کا اعلان ہوا تو پھر بھی شور میں کمی نہیں آئی لیکن جوں ہی فیض اپنے تمبورہ کے ساتھ مائیک پر آیا اور ایک زوردار اونچی آواز میں الہان کیا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا تو پورے مجمع کو جیسا سانپ سونگھ گیا۔ پورے ہال میں ایک مکمل سوکت طاری ہو گئی۔ جوں ہی وہ اپنے ''لے'' کے ساتھ ''مکھڑے'' سے ''انترا'' اور انترا سے ''مکھڑے'' پر آیا تو پورا مجمع اس کے ساتھ جھوم گیا اور بغیر کچھ سمجھے اس کے دُھن پر طلباء خاص کر عرب اور بلوچ طلباء ناچنے لگے اور اس طرح مجمع قابو میں آ گیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ فیض کے علاوہ کسی اور کو سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ جوں ہی فیض جانے لگے تو ایک شور بلند ہوا فیض وانٹڈ (Faiz Wanted) کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ ہر لحاظ سے یہ

دیوان ایک یادگار دیوان تھا۔اس کے علاوہ بی ایس او کی طرف سے اس دیوان کے موقع پر ''پجار'' کے نام سے ایک چھوٹا رسالہ بھی شائع ہوا تھا بلکہ پجار کی ابتداء بھی اسی دن سے ہوئی۔ پجار کا مطلب ''تعرف'' اس میں بلوچ شعراء کا مستند کلام ادبی اور سیاسی مضامین بھی شائع ہوئے تھے۔غرض بی ایس او ایک مکمل فعال تنظیم بن چکی تھی۔ بی ایس او کے پلیٹ فارم سے پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ سلجھے ہوئے دانشوروں کی ایک ایسی ٹیم تیار ہو رہی تھی کہ اگر اپنوں کی سازشیں کارگر ثابت نہ ہوتیں تو بلوچستان کو مستقبل میں ایک بہترین فعال قیادت میسر آ جاتی۔ میں یہ بات پوری وثوق سے کہتا ہوں کہ بلوچستان اور بلوچ قوم کی رہنمائی کا صحیح اور پائیدار سمت متعین ہوتا تو آج جو ہمارا حشر ہو رہا ہے وہ بھی نہ ہوتا یہ بلوچ مقولہ بالکل سچ ثابت ہوا کہ

''پہ واھشت ءِ پدانہ بنت جوانیں کار''

لیاری میں ضمنی انتخابات اور بابا بزنجو

(سازش کی ابتداء)

''کھا کے جو تیر دیکھا کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی''

ستمبر 1965ء کی ہندو پاک جنگ کے بعد ایوب آمریت کے غبارے سے ہوا نکلنی شروع ہوگئی تھی اس میں بہت سے سوراخ ہو چکے تھے۔ایک طرف ایوب بھٹو کے اختلافات دوسری طرف ایوب خان کے دستِ راست نواب امیر محمد خان (آف کالاباغ) جو اس وقت مغربی پاکستان کے مطلق العنان گورنر تھے کے اختلافات زبان زد عام ہونے شروع ہو گئے تھے۔ان اختلافات کے بیج سیاست کی زر خیز زمین پر پڑ چکے تھے اور شاطر لوگ بڑی مستعدی سے ان بیجوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے، ہر وقت کھاد اور پانی مہیا کر رہے تھے۔ان پودوں نے زمین سے اس وقت پوری طرح اپنا سر باہر نکال دیا جب لیاری کی قومی اسمبلی کے سیٹ پر ضمنی انتخاب کا اعلان ہوا۔اس ضمنی انتخاب کے لئے مسلم لیگی (کنویشن) امیدوار کے نام پر ایوب خان اور نواب کالاباغ کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کر لی۔ ایوب خان نے سیف اللہ پراچہ کے والد خان بہادر حبیب اللہ پراچہ کو اپنا امیدوار نامزد کیا جب کہ نواب کالاباغ اور اس کی ٹیم ایک ایسے امیدوار کی تلاش میں تھے جو ایوب خان کے امیدوار کو شکست فاش سے دچار کر سکے۔نواب کالاباغ کی ٹیم میں محمود ہارون جو اس وقت بہت ہی با اثر مرکزی وزیر تھے جس نے وزیر بننے کے بعد قومی اسمبلی کے اس نشست سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کا حلقہ انتخاب بھی لیاری تھا جام آف لسبیلہ مرحوم میر غلام قادر جام جیل خانہ جات کے وزیر تھے اور وہ بھی لیاری میں اثر رکھتے تھے، پنجاب سے سردار ملک محمد حیات ٹمن جو ریلوے کے مرکزی وزیر تھے۔لیکن ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کو کوئی معقول امیدوار دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔اس زمانے میں قومی اسمبلی کے سیٹ کے لئے بنیادی جمہوریتوں کے ممبران ووٹ ڈالتے تھے جو محض چند ہزار ہوتے تھے جن کو آسانی سے ڈرایا دھمکایا جا سکتا تھا یا لالچ دیکر خریدا جا سکتا تھا۔

سردار ملک محمد حیات ٹمن کے مطابق اس نے نواب کالاباغ امیر محمد خان کو مشورہ دیا کہ اگر ایوب خان کو اس سیٹ پر شکست دینا ہے تو میر غوث بخش بزنجو کو اپنا امیدوار نامزد کریں اور کسی بھی طرح اس کو اس سیٹ پر الیکشن لڑنے کے لئے آمادہ کریں۔بقول ٹمن کے جب نواب کالاباغ نے یہ تجویز سنی تو خوشی سے اچھل پڑے لیکن! فوراً ہی اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے کیونکہ اپنے گورنری کے دوران انہوں نے میر غوث بخش بزنجو کو بدترین اذیتیں پہنچائیں تھیں۔اس کو قلی کیمپ میں بند کیا تھا۔اس پر طرح طرح کے

مظالم ڈھائے تھے اس لئے انہوں نے کہا یہ شخص میرا امیدوار کیسے بن سکتے ہیں۔لیکن بعد میں متفقہ فیصلہ ہوا کہ کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ چنانچہ محمود ہارون کے توسط سے میر غوث بخش بزنجو سے رابطہ کیا گیا جو اس وقت نال میں تھے ۔جواب مثبت ملا اور میر صاحب نال سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے ،لسبیلہ اور حب سے ہوتے ہوئے سیدھا کراچی پارک ہوٹل میں آ کر قیام کیا اور الیکشن لڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے ، یہ تفصیل 1976ء میں مجھے سردار ملک محمد حیات ٹمن نے خود اس وقت بتائی جب وہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کے سیاسی مشیر تھے اور میں اس زمانے میں بلوچستان افئیر کے لئے بحیثیت ''او ایس ڈی'' کام کر رہا تھا ۔ہمارا ٹمن صاحب سے قریبی رابطہ رہتا تھا۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ میر صاحب پارک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ہم حسب معمول سلام کے لئے حاضر ہوئے ،اس وقت تک ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ میر غوث بخش بزنجو الیکشن لڑنے کے لئے کراچی آئے ہیں اور وہ بھی نواب کالاباغ کے امیدوار کی حیثیت سے ، جب میں اور میرا ایک دوست (نام یاد نہیں) پارک ہوٹل پہنچے تو ہم نے دیکھا لال بخش رند اور اس کے لیاری کے کچھ ساتھی پولنگ اسٹیشنوں کا پلان اور نقشہ پھیلائے ہوئے میر صاحب کو بریف کر رہے تھے ، ہمارے پوچھنے پر لال بخش رند نے بتایا کہ میر صاحب شاید لیاری کے خالی شدہ قومی اسمبلی کے سیٹ پر الیکشن لڑیں ۔لیکن اس کا ابھی پوری طرح فیصلہ نہیں ہوا ، ساتھیوں سے صلاح ومشورہ جاری ہے۔سردار بلخ شیر مزاری بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اس دوران لال بخش رند نے اوپر کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا اور میر صاحب کو بتایا کہ کے بی (KB) آ رہے ہیں۔معلوم ہوا کہ کے بی (KB) نواب خیر بخش مری کو کہتے ہیں۔ہم نے پہلی بار نواب خیر بخش مری کو دیکھا ،اُس وقت اس کی شخصیت اچھی خاصی متاثر کن تھی شاید اب بھی ہو لیکن اس وقت وہ بہت ہی ہینڈسم لگتے تھے۔ہم نے دل ہی دل میں اس طرح کی طلمساتی شخصیت کے اپنے قائد ہونے پر فخر محسوس کیا۔حال احوال کے بعد اصلی مقصد پر آتے ہوئے وہ سب جھجک رہے تھے اسکی بہت ساری وجوہات میں سے ایک خاص وجہ ہماری موجودگی تھی چنانچہ ہم نے ماحول کی نزاکت کو محسوس کیا اور وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

میر صاحب نیپ (NAP) بلوچستان کے ایک سرکردہ زمہ دار رکن تھے اس کے علاوہ اس کے اپنے بلوچستان کے بہت ہی بااثر قریبی ساتھی جن میں نواب خیر بخش مری سردار عطاء اللہ مینگل اور میر گل خان نصیر کو اعتماد میں لینا بھی ضروری تھا جس میں میر غوث بخش بزنجو کو بہت مشکل پیش آ رہی تھی ۔بی ایس او کے سینئر ساتھی میر صاحب کے اس فیصلہ کی بھنک پا کر حیران و پریشان حقائق معلوم کرنے کے لئے سرگرداں تھے۔یہ ایک بہت ہی نازک وقت تھا کیونکہ جس شخص کی مدد سے میر صاحب الیکشن لڑنا چاہتے تھے اس کا نام پورے بلوچستان میں ایک گالی بن چکا تھا۔بلوچستان کی عوام ایوب خان سے زیادہ نواب کالاباغ سے نفرت کرتے تھے اور یہ نفرت خود میر صاحب نے پھیلائی تھی ۔لیکن حقائق ہمیشہ تلخ ہوتے ہیں اور یہ تلخ حقیقت تمام مخلص سیاسی کارکنوں کا منہ چھڑا رہی تھی ۔ان پر سکتہ طاری تھا یہ بات ایک دوسرے سے کہتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی یہیں سے اس سازش کا نہ صرف آغاز ہوا جس نے بعد میں بلوچ قوم کی تحریک آزادی کے

سارے خواب چکنا چور کر دیئے بلکہ بی ایس او جیسی فعال، منظّم تنظیم کی تقسیم کا بھی سبب بن گیا۔

نواب خیر بخش مری اور میر غوث بخش بزنجو کی ملاقات کے بعد اڑتے اڑتے یہ خبر ہم تک پہنچی کہ نواب خیر بخش مری نے انتخاب لڑنے کی سخت مخالفت کی تھی اور جو پیشکش میر صاحب کو ایوب خان نے کی تھی اس کو قبول کرنے کی تائید کی تھی۔ وہ پیشکش یہ تھی کہ ایوب خان الیکشن نہ لڑنے کی شرط پر میر غوث بخش بزنجو کو مبلغ دس لاکھ روپے نقد اور کسی بھی ملک میں سفارت کا عہدہ دینے پر آمادہ تھے۔ جس کو میر غوث بخش بزنجو نے ٹھکرایا تھا۔ نواب خیر بخش مری کی دلیل یہ تھی کہ میر صاحب الیکشن جیت بھی جائیں تو اس سے محض بلوچستان کے دشمنوں کی انا کو تسکین پہنچے گا بلوچستان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور میر صاحب اسمبلی میں ایک دو تقریروں کے بعد جیل چلے جائیں گے اس سے بہتر ہے کہ وہ سفیر بن کر دنیا کی سیر کرتے پھریں اور رقم تحریک چلانے کے لئے وقف کر دیں۔

میر غوث بخش بزنجو بہت ہی زیرک سیاست دان تھے ان کو اچھی طرح علم تھا کہ سفارت کا عہدہ قبول کر کے وہ ہمیشہ کے لئے سیاسی خودکشی کر لے گا جبکہ وہ ملکی اور قومی سیاست کے دھارے میں رہنا چاہتے تھے حالانکہ دونوں طرف آگ کے شعلے یکساں تھے۔ لیکن ایک طرف پھر بھی جل کر نشان چھوڑنے کے آثار تھے جبکہ دوسری طرف جل جل کر زندہ رہنا پڑتا تھا۔ کچھ بھی ہو یہیں سے آپس میں اختلافات کا آغاز ہو چکا تھا۔ دوسرے دن شام کو میں ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اور صدیق آزاد ریڈیو پاکستان سے خبریں پڑھنے کے بعد سیدھا پارک ہوٹل گئے اور میر غوث بخش بزنجو سے ملاقات کی۔ چونکہ میر صاحب کے اس فیصلے سے بی ایس او کے سینئر ساتھیوں کو اختلاف تھا اس لئے اس موضوع پر ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی نے بات شروع کی۔ بڑے مودبانہ انداز سے بلوچ طلباء کے تحفظات، شکوک وشبہات اور اس فیصلے کے متعلق اختلاف کا اظہار کیا۔ لیکن ہمیں اس وقت بہت سخت تعجب ہوا جب میر صاحب بجائے اس کے کہ اپنے انتخاب لڑنے کی کوئی معقول وجہ بتاتے اور ہمیں سیاسی طور پر قائل کرتے، الٹا بہت سخت الفاظ میں بہت ہی غصے کے ساتھ ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ''تم مکران والوں کو سوائے ملازمت کرنے اور تنخواہ بٹورنے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔'' میں نے پہلی مرتبہ میر صاحب کو بہت سخت غصے میں سرخ ہوتے ہوئے دیکھا۔ حالانکہ ملازمت شاید اس وقت یعقوب بزنجو بھی کر رہے تھے جو میر صاحب کے قریب ترین عزیز تھے جبکہ مکران والے اپنے تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے لئے محض پارٹ ٹائم ملازمت کر رہے تھے۔ میرے دونوں سینئر ساتھی بالکل خاموش ہو گئے تھے ظاہر ہے میر صاحب کے اس رویہ پر محض افسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں عطاء اللہ مینگل کی اس بات سے کچھ تشفی ہوئی کہ ''الیکشن میر صاحب کی کمزوری ہے اور میر صاحب سکرات میں بھی ہو اور الیکشن کا اعلان ہو جائے تو وہ ملک الموت سے ہاتھ جوڑ کر کہے گا مجھے اس قدر مہلت دو کہ میں الیکشن لڑ سکوں بعد میں بے شک مار دینا'' نہ جانے یہ بات یاروں نے خود بنائی ہے یا واقعی عطاء اللہ مینگل نے کہی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میر صاحب سیاست میں کسی چیز کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے بعد کے حالات وواقعات نے بھی یہ ساری باتیں سچ ثابت کر دیں۔

چونکہ میر غوث بخش بزنجو کے مذکورہ الیکشن کا معاملہ بہت ہی گھمبیر انتہائی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا اس لئے بی ایس او کے سینئر ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اس نازک مرحلے میں ہمارا کوئی بھی مخالفانہ رویہ ساری بلوچ قومی تحریک کو نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ میر صاحب کے الیکشن مہم میں بھرپور حصہ لیں گے اور الیکشن جیتنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس وقت ہماری صفوں میں ذرا سی انتشار محض دشمن کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ الیکشن مہم کا باقاعدہ آغاز ہوا ہم سب ساتھیوں نے دن رات کام کیا۔ ساری ساری رات الیکشن کیمپوں میں رہے لیاری کے گلی کوچوں میں بی ڈی ممبران کے دروازے کھٹکھٹاتے کنونسنگ کرتے ووٹرلسٹوں کو ترتیب دیتے، مخالف پروپیگنڈے کا توڑ کرتے غرض جو ہم لوگوں سے ہوسکا ہم بی ایس او کے ممبران وکارکنان نے کیا۔ اس دوران ایک پمفلٹ تقسیم ہوا جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ میر غوث بخش بزنجو کراچی کو تاریخی طور پر بلوچستان کا حصہ سمجھتے ہیں اور میر صاحب کے مطابق کراچی کا اصل نام کلانچی تھا۔ اس لئے میر صاحب الیکشن جیتنے کے بعد کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کی تحریک شروع کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ مخالف پروپیگنڈہ کا مقصد لیاری کے غیر بلوچ بی ڈی ممبران کو میر صاحب سے بدظن کرنا تھا۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے تحقیق کے بعد یہ رپورٹ دی کہ یہ معراج گروپ یعنی چین نوازوں کی شرارت ہے۔ جس کی بھی شرارت تھی اس کا بی ایس او اور لیاری کے سیاسی ساتھیوں نے بڑی تیزی سے توڑ کیا اور اس کو حکومت کا مخالف پروپیگنڈہ قرار دے کر ووٹروں کو مطمئن کیا۔ غرض نواب کالاباغ، محمود ہارون اور ان کی ٹیم کی ضد اور ہم سب سیاسی کارکنوں کی کاوش سے میر صاحب الیکشن جیت گئے اور الیکشن جیتنے کے بعد جیت کو Celebrate کرنے کے لئے ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں میر صاحب کو پورے حلقہ انتخاب لے جایا گیا۔ اس جلوس کے دوران بھی چین نوازوں نے کوشش کی کہ پورے جلوس کے شرکاء اور پولیس میں جھڑپ ہوجائے لیکن بی ایس او کے ساتھیوں نے اس سازش کو بھی ناکام بنادیا۔

اسی دوران غالباً 1966ء کو مکران میں ایک بہت بڑا ہنگامہ شروع ہوا گوادر میں مقامی انتظامیہ اور نیپ کے حمایتی سیاسی کارکنوں کے درمیان شدید قسم کی جھڑپیں شروع ہوگئیں تھیں۔ اس وقت پورا مکران یعنی پنجگور سے لے کر اور ماڑہ تک ایک ضلع تھا۔ گوادر کے مقامی اسکول میں حسین اشرف کے بیٹے اشرف اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے درمیان کسی بات پر جھگڑا شروع ہوا اور جھگڑا اس قدر بڑھا کہ پورے گوادر شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت گوادر میں حسین اشرف، عبدالمجید سہرابی، ملا عبدالصمد، غلام حیدر مرحوم، استاد عبدالغفور، ماسٹر عبداللہ دیوانہ، یوسف مجاہد اور عبداللطیف سرگرم سیاسی کارکن تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نیشنل عوامی پارٹی کے حمایتی تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی اور حکومت کے درمیان شدید قسم کی سیاسی محاذ آرائی ہوئی اور اسکول کے اساتذہ کا تعلق پنجاب سے تھا اس لئے اس معمولی جھگڑے نے سیاسی جھگڑے کی شکل اختیار کی اور پورے مکران کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چونکہ جھگڑے کی بنیاد گوادر سے شروع ہوئی تھی اس لئے اس کا زور بھی گوادر ہی میں تھا۔ گوادر کی مقامی نتظامیہ مکمل طور پر مفلوج ہوکر رہ گئی۔ پورے شہر کا کنٹرول مقامی سیاسی کارکنوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اساتذہ اور انتظامیہ کے اہلکاروں کی اچھی خاصی پٹائی ہوئی جس کی وجہ سے پوری حکومت کی صفوں میں ہل چل مچ گئی۔ مکران ضلع

کا ہیڈ کوارٹر تربت تھا اور ڈپٹی کمشنر ملک وارث جو کہ بہت ہی گھاگ قسم کا چالباز افسر تھا۔ اس نے تربت سے نیم فوجی دستے روانہ کئے اور خود بھی گوادر پہنچ کر مقامی قیادت کو بات چیت اور افہام و تفہیم سے معاملہ ختم کرنے کی پیشکش کی۔ اس دوران مسلح دستوں نے پورے گوادر شہر کو پوری طرح گھیرے میں لے کر گشت شروع کر دی اور پورے شہر میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا۔ جب حسین اشرف، عبدالمجید سہرابی اور ان کے ساتھی مذاکرات کے لئے ڈی سی کے دفتر پہنچے تو اس نے سب کو گرفتار کر کے بیڑیاں پہنا دیں اور سب کو لاک اپ میں بند کر دیا۔ یہ وہی سیاسی کارکن تھے جنہوں نے سلطنت آف عمان (مسقط) کے خلاف 1958ء میں مظاہرہ کر کے گوادر کو پاکستان میں شامل کرنے کی جدوجہد کی تھی تاکہ پاکستان میں ان کو زیادہ سے زیادہ شہری اور سیاسی حقوق ملیں۔ لیکن کم علمی کی وجہ سے شاید ان کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پاکستانی سیاست کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے محسنوں کو اسی طرح نوازتے ہیں۔ شاید ان کو خان آف قلات مرحوم میر احمد یار خان کے ساتھ پاکستانی حکمرانوں کے ذلت آمیز سلوک کا بھی علم نہ تھا۔ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو خان مرحوم نے اپنے دیوان عام اور دیوان خاص کے ممبران کی مخالفت کے باوجود ریاست قلات کو پاکستان میں شامل کر لیا تھا اور بعد میں پاکستان کے فوجی مسلح دستوں نے ایوان قلات پر چھڑائی کی۔ حتیٰ کہ قلات کے اندر مسجد کی عمارت کو بھی گولیوں سے چھید کر لیا تھا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں خان آف قلات بلوچستان کے گورنر بنے تو اس زمانے میں، میں بھی وزیراعظم ہاؤس میں بحیثیت او ایس ڈی بلوچستان افیئر ملازمت کر رہا تھا۔ جب میں قلات کے اپنے سرکاری دورے پر گیا تو خان صاحب بھی ان دنوں قلات میں قیام پذیر تھے انہوں نے پی آر او اختر بلوچ کی توسط سے ملاقات کی، ملاقات بہت ہی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ ملاقات سے پہلے میں نے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ اس مسجد پر گولیوں سے چھید کئے ہوئے سوراخ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔ مختلف موضوع پر بات چیت کے بعد جب میں نے مسجد پر گولیوں کے نشانات کے بارے میں خان صاحب سے پوچھا تو خان صاحب کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا کرب اور پریشانی نمایاں ہوتی ہوئی دکھائی دی اور جب انہوں نے پورا واقعہ بیان کیا تو ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر انہوں نے بڑے پیار سے کہا (My Son Keep It Off The Record) یعنی یہ رپورٹ کرنے والی بات نہیں ہے۔

گوادر اور پورے مکران کے اس ہنگامے کے دوران بہت سے نوجوانوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے اور ان میں سے کچھ بھاگ کر کراچی پہنچے۔ میرے ایک دوست غلام رسول (ملا غلام رسول) بھی ان میں شامل تھے۔ ان کے ذریعے ہمیں سارے واقعہ کا تفصیلی احوال معلوم ہوا اور بی ایس او کے سینئر عہدیداروں سے بھی ان کی ملاقات کرائی گئی۔ چنانچہ بی ایس او نے فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے متاثرین کے حق میں عملی جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی اور ایک ساتھی پر ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ فوری طور پر لاہور جا کر مغربی پاکستان اسمبلی کے حزبِ اختلاف کے رہنماؤں سے ملاقات کریں اور اس سارے واقعہ کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھائیں اس وقت اسمبلی میں حزبِ اختلاف کا رہنما خواجہ صفدر تھا۔ حکومت کے اس اقدام اور بلوچستان میں دوسرے مظالم کے خلاف ایک سخت پمفلٹ

چھاپا گیا اور مجھے یہ ذمہ داری دی گئی کہ میں اس کو لے جا کر گوادر اور مکران کے دوسرے شہروں میں تقسیم کراؤں۔ اس کا مقصد ان علاقے کے لوگوں کو احساس دلانا تھا کہ اس مشکل وقت میں وہ تنہا نہیں ہیں ہم سب ان کی اس جدوجہد میں ان کے ساتھ ہیں۔

اس زمانے میں رسل ورسائل کے ذرائع محدود تھے۔ پی آئی اے کی ہفتے میں ایک پرواز کراچی سے جیونی جاتی تھی۔ پورے مکران میں جیونی ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں پر برطانیہ کے دور سے ایک قدرتی رن وے موجود تھا سول ایوی ایشن اتھارٹی، محکمہ موسمیات ائیر پورٹ سے متعلق دوسرے ضروری ادارے موجود تھے۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں خود جا کر یہ پمفلٹ محض پہنچاؤں تقسیم کرنے کی ذمہ داری مقامی لوگوں کو دوں اور خود جلد سے جلد کراچی واپس پہنچ جاؤں تا کہ میری تعلیم کا ضیاع نہ ہو۔ اس زمانے میں ہمارے سینئر ساتھی حتی المقدور یہ کوشش کرتے تھے کہ کارکن جیلوں میں جانے کے بجائے باہر رہ کر اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ تنظیم کے لئے کام کر سکیں۔ اس زمانے میں ائیر پورٹ پر چھان بین یا ایکسرے مشین کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ میں اپنے ٹین کے صندوق میں حکومت وقت کے خلاف یہ خطرناک پمفلٹ چھپا کر جیونی پہنچنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن میرے لئے اس پمفلٹ کو تقسیم کرنے کا بندوبست کرنا خاصا مشکل تھا۔ اس وقت ان علاقوں میں بی ایس او کا کوئی ایسا ذمہ دار کارکن نہ تھا جس پر یہ ذمہ داری سونپی جا سکے جو تھوڑے بہت ساتھی تھے وہ وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد سب روپوش تھے یا وہاں سے بھاگ کر کراچی پہنچ چکے تھے۔ اس ہنگامے کی وجہ سے حکومت نے ہر طرف سی آئی ڈی کا عملہ پھیلا دیا تھا پورے علاقے میں سخت قسم کی نگرانی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں جبکہ اس پمفلٹ کو تقسیم کرنا یا پھیلانا بہت ضروری تھا۔

آخر کار کافی سوچ وبچار کے بعد لیویز کا ایک اہلکار مراد کامریڈ کو اپنے اعتماد میں لیا اور جب مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ کامریڈ یہ کام بخوبی رازدارانہ طریقہ سے کر سکتا ہے تو میں نے اس کو یہ سمجھا کر پمفلٹ اس کے حوالے کئے کہ ان کو زیادہ تر ان جگہوں تک پھیلاؤ جہاں حکومت کے اہلکار رہتے ہیں، زیادہ حصہ گوادر اور اگر ہو سکے تو تربت پسنی تک یہ پمفلٹ کو پہنچانا چاہیے۔ لیکن یہ سارا کام کمال ہوشیاری سے کریں تا کہ اس کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ کامریڈ نے بالکل ویسا ہی کیا جیسا میں نے اس کو سمجھایا تھا۔ چونکہ وہ لیویز کی وردی میں ہوتا تھا اس لئے اس پر نہ کسی کی نظر گئی اور نہ کسی کو شک ہوا۔ اس نے یہ عظیم قومی کارنامہ انجام دیکر اپنے آپ کو تاریخ میں امر کر لیا۔ میں آج بھی اس کو سلوٹ کرتا ہوں۔ نہ معلوم ایسے کتنے دلیر سپاہیوں نے اس قومی جدوجہد کے دوران کیا کیا خطرناک کام انجام دئے جن کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں یا بالکل نہیں جانتے ہیں ان کو ہم صرف گمنام سپاہی کہہ سکتے ہیں۔

جب میں مکران سے اور ڈاکٹر نعمت گچکی لاہور سے اپنا کام انجام دے کر واپس کراچی پہنچے تو ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے کچھ ساتھی کچھ عجیب قسم کے تناؤ اور کچاؤ کا شکار لگ رہے تھے۔ بی ایس او کے کچھ ممبران کو ہماری ان سرگرمیوں پر اعتراض تھا اور اس کو محض پیسوں کا ضیاع سمجھ رہے تھے ان معززین میں امیر الملک مینگل اور قادر چنال پیش پیش تھے۔ انہوں نے برملا اظہار تو نہیں کیا لیکن اپنی حرکات اور زیرِ بحث گفتگو کے دوران یہ تاثر پھیلانا شروع کر دیا کہ مکران میں ایسا کچھ نہیں ہوا جس کے لئے اتنی تگ ودو کی گئی یہ سب محض اس وجہ سے

کیا گیا کہ بی ایس او پر مکرانیوں کا قبضہ ہے۔ان کی ان حرکتوں سے بلوچ بروہی کے اختلافات کا زہر بھی آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا جو ایک خطرناک بات تھی۔حالانکہ مکران کے کسی بھی نوجوان کے ذہن میں اس قسم کی باتوں کا گمان تک نہیں تھا وہ اپنی جدوجہد میں مخلص تھے اوراس کو پورے بلوچستان کے حقوق کا جنگ سمجھ کرلڑ رہے تھے۔

ایک طرف میر غوث بزنجو کے دشمنوں کی حمایت سے الیکشن لڑنے کی چہ میگوئیاں دوسری طرف ہمارے ان ساتھیوں کی ہر بات پر ہماری مخالفت اور یہ اعتراض کہ مکران کے ہنگاموں پر پمفلٹ بازی اور لاہور یاترا محض پیسوں کی ضیاع تھا۔ان باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اندر ہی اندر بی ایس او کی صفوں میں دراڑ کی آگ سلگنی شروع ہوگئی۔بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کیا کہ یہ محض اس سازش کی ابتداء تھی۔جس کا مقصد درمیانی طبقے کے اس تمام فعال قیادت کا صفایا کرنا تھا جو بی ایس او کو قبائلی سیاست سے ہٹا کر ایک قومی جدوجہد کی بنیاد پر منظّم کرنے کی جدوجہد کررہے تھے۔کیونکہ بڑوں نے اپنی سیاست کا رخ کسی اور قبلہ کی سمت کردیا تھا۔

بی ایس او کے سالانہ انتخابات قریب آرہے تھے۔دوستوں کو صدر اور سیکریٹری جنرل کے عہدے کے لئے دو مخلص ذمہ دار کارکنوں کی تلاش تھی۔عبدالحکیم بلوچ کوئٹہ سے کراچی آچکے تھے اور کراچی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔چونکہ حکیم بلوچ کوئٹہ میں ''ورنا وانندہ گل'' کے ذمہ دار عہدے پر فائز رہ چکے تھے،اس لئے بی ایس او کی صدارت کے لئے سینئر ساتھیوں کی نظر انتخاب حکیم بلوچ پر پڑی اور سکریٹری جنرل کے لئے مجھے نامزد کیا گیا۔مولوی خیر محمد ندوی کے اسکول میں 66-1965ء کے لئے بی ایس او کے انتخابات بہ خیر خوبی سے انجام پا گئے حکیم بلوچ صدر اور میں سیکریٹری جنرل چن لئے گئے۔اس طرح بی ایس او کے کارواں کا بارگران ہمارے کندھوں پر آن پڑا۔چونکہ ہم اکثریت میں تھے اس لئے ہمارے لئے دبے دبے مخالفین کا اس الیکشن میں حصہ لینے اور بی ایس او کے عہدوں پر فائز ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

ہم نے بڑی جانفشانی،محنت لگن اور انتہائی دیانتداری سے بی ایس او کی تنظیم کاری کی۔اس کی صفوں کو منظّم کیا اور بلوچستان کے سیاسی مسائل اور بلوچ طلباء سے متعلق دیگر تعلیمی مشکلات کو مختلف فورم پر اجاگر کیا۔جس زمانے میں وڈھ اور مری قبائل پر پاکستانی حکمرانوں نے فوج کشی کی تو نیپ کے ساتھ ساتھ بی ایس او واحد طلباء تنظیم تھی جس نے حکومتِ وقت کے ان جابرانہ اور ظالمانہ اقدام کی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مذمت کرنے اور ظالم حکمرانوں کا پردہ فاش کرانے میں اہم کردار کیا۔مختلف ذرائع سے بلوچوں کے حقوق،بلوچستان کی استعماری قوتوں سے آزادی اور دوسرے مسائل کے بارے میں پوری دنیا کے میڈیا کو آگاہ کرنے کی حتیٰ المقدر کوشش کی۔یہی وجہ ہے کہ ایوب آمریت کے دور میں جنرل برکی نے خضدار میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔''بلوچستان کے پہاڑوں میں قبائلوں سے لڑنے کے لئے پنجاب کے پاس بے انتہا افرادی قوت موجود ہے لیکن ان بلوچ طلباء اور نوجوانوں سے لڑنا قدرے مشکل ہے جو شہروں میں رہ کر اس مسئلے کو بین الاقوامی اہمیت دلانے کی جہد کررہے ہیں۔''

ہمارے سامنے ایک واضح مقصد تھا ایک فکر تھی جدوجہد کی سمت متعین تھی کسی کارکن میں کوئی دوغلہ پن نہیں تھا، ہر شخص ہر دم قربانی دینے کے لئے تیار رہتا تھا۔ کسی کو لیڈر بننے کا شوق نہیں تھا بلکہ سب کے سب اپنے آپ کو معمولی کارکن سمجھتے تھے۔ بی ایس او کی تقریباً ہر ماہ باقاعدہ ایگزیکٹو باڈی کے اجلاس منعقد ہوتے تھے جس کا میری یاداشت کے مطابق کورم ہمیشہ پورا ہوتا تھا۔ اس میں گذشتہ اجلاس کے فیصلے اور ساری کاروائی میں بحیثیت سیکریٹری جنرل تفصیل سے سناتا تھا اور موجودہ اجلاس کے سارے منٹس باقاعدگی سے لکھتا تھا۔ اجلاس کی منظوری سے مختلف ایشوز پر پریس ریلیز جاری کرتے تھے جس کو بی ایس او کے صدر حکیم بلوچ اکثر انگریزی میں لکھتے تھے جو اس قدر بھر پور مدلل اور سیاسی اخلاقیات کے دائرے میں ہوتے تھے کہ کبھی کسی اخبار والے کو ایک لفظ کم کرنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی۔ غرض ہماری سرگرمیاں بڑی زور وشور جاری تھیں۔ تنظیم کی مالی ضروریات ہم ممبران اور عام بلوچوں سے چندہ وصول کر کے پورا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چندہ اکھٹا کرنے کی مہم میں بی ایس او کا صدر عبدالحکیم بلوچ راقم اور کچھ دوست ملیر گئے۔ گھومتے گھومتے ایک زمین دار کے ڈیرے پر پہنچے اس وقت عصر کی نماز کا وقت تھا سارے لوگ تیزی سے جماعت میں شامل ہونے کے لئے مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم تقریباً سب کے سب بے نمازی تھے فوراً فیصلہ کیا کہ ہم بھی نماز میں شامل ہوتے ہیں شاید اس وجہ سے کچھ زیادہ مل جائے۔ لیکن شاید اللہ تعالیٰ کو ہماری یہ حرکت پسند نہ آئی اس لئے مسجد سے باہر آ کر جب بڑے زمیندار سے ہم نے اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے کہا کہ ہم خود اس انتظار میں ہیں کہ کوئی آ کر ہماری مسجد کے لئے چندہ دے جو زیرِ تعمیر ہے۔ اس آستانے سے تو ہم خالی ہاتھ لوٹے لیکن اور جگہوں سے ہمیں معقول چندہ وصول ہوا۔ یہ چندہ غالباً ہم لوگ کراچی یونیورسٹی میں دوسری بلوچی دیوان منعقد کرنے اور ''پجار'' کا رسالہ شائع کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ بعد میں لیاری کے شمشاد بلوچ (مرحوم) فیض بلوچ وغیرہ جب بی ایس او میں سرگرم ہوئے تو ہم لوگ بلوچوں کے شادی بیاہ کے محفلوں میں پہنچ کر لوگوں کو ماسٹر عبدالمجید کا لکھا ہوا بلوچی ترانہ ''ما چکیں بلوچانی، ما گُلڑیں شیرانی'' گا کر سناتے تھے اور بلوچ اس قدر جذبے میں آتے تھے کہ نوٹوں کے ہار ساتھیوں کے گلے میں ڈالتے اور بنڈل کے بنڈل ان پر نچھاور کرتے تھے اور یہ پیسہ ہم بی ایس او کے فنڈ میں جمع کرتے تھے۔ استاد شفیع مرحوم اور عبدالستار بھی اس مقصد میں طلباء کی بہت مدد کرتے رہتے تھے لیکن ان ساری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کے طلباء تمام تر غریب الوطنی کے باوجود اپنے اصلی فرض یعنی حصولِ علم سے کبھی بھی غافل نہیں رہے۔

اس دوران چین روس اختلافات نے پوری دنیا میں بائیں بازو کی سیاسی تنظیموں کو دو حصوں میں واضح طور پر تقسیم کر دیا تھا۔ پاکستان کی سیاسی اور طلباء تنظیمیں بھی اس کی زد میں آ چکی تھیں۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ روس نواز گروپ کا سربراہ خان عبدالولی خان جس کا اثر زیادہ تر صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختون خواہ) اور بلوچستان میں تھا جس میں ہمارے بلوچ رہنما میر غوث بخش بزنجو نواب خیر بخش مری عطاء اللہ مینگل اور میر گل خان نصیر نمایاں طور پر شامل تھے۔ چین نواز دھڑے کا سربراہ مولانا عبدالحمید بھاشانی تھے جس کا تعلق سابقہ مشرقی پاکستان سے تھا۔ لیکن اس کا اچھا خاصا اثر مغربی پاکستان میں بھی تھا۔ اس طرح نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (این ایس

ایف) بھی دو واضح گروپ میں تقسیم ہو چکی تھی۔ چین نواز دھڑے کی رہنمائی معراج محمد خان ڈاکٹر رشید وغیرہ کر رہے تھے اور یہ دھڑے آپس میں دستِ گریباں ہونے شروع ہوئے تھے۔ لیکن قدرت کی مہربانی سے بی ایس او ابھی تک ان بلاؤں سے محفوظ تھی۔ کیونکہ بی ایس او کے تمام عہدیدار اور ممبران ماسکو نواز اور سویت یونین کی بائیں بازو سیاست کی مکمل حمایت کرتے تھے۔ یہاں معاملہ کچھ اور تھا جس کا ادراک بہت بعد میں جا کر ہوا میر غوث بخش بزنجو مرحوم نواب خیر بخش مری سردار عطاء اللہ مینگل میر گل خان نصیر اور نواب محمد اکبر بگٹی چونکہ نیپ کے حمایتی تھے اس لئے یہ سب کے سب ہمارے غیر متنازعہ لیڈر تھے۔ جن پر بلوچ طلباء ایمان کی حد تک یقین رکھتے تھے۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ لیڈر صاحبان ہمت ہار جائیں گے اپنے اپنے محدود قبائلی تضادات کا شکار ہو کر ہر قسم کی سودا بازی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یہ سوچنا بھی ہم گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن تاریخ کے جبر اور فطری زمینی حقائق کو ٹالا نہیں جا سکتا بہر حال بی ایس او کے اراکین سب کو پوجنے کی حد تک چاہتے تھے۔

یہاں میں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بی ایس او کے سرگرم اراکین کا تعلق زیادہ تر مکران اور لیاری سے تھا۔ لیاری کے دوستوں میں لطیف بلوچ (ڈان والے) عبدالقیوم بارکزئی، شمشاد بلوچ، فیض بلوچ، محمد اسحاق، مولا بخش مگسی، رزاق بارکزئی، رحیم بخش آزاد، رمضان، اکبر جلال، صدیق جنگیاں، ابراہیم، گلاب بلوچ۔ مشہدی (مرحوم) اور بہت سے جن کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے، بی ایس او کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں اس کے علاوہ سیاسی کارکنوں میں محمد یوسف نسکندی، لال بخش رند، یار محمد یار، گل محمد ہوت وغیرہ ہمارے زمانے میں نیپ کے سرگرم کارکن ہوتے تھے اور بی ایس او کے مددگار معاونین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بیزن بزنجو، امیر الملک مینگل، عبدالقادر چنال، منظور گچکی، خان جان جمالدینی، محبوب جمالدینی، ڈاکٹر عبدالحئی جو کراچی یونیورسٹی اور ڈاؤ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے بی ایس او کے فعال اور سرگرم کارکن رہ چکے تھے۔

1966-67ء کا سال بی ایس او کی سیاست میں بہت ہی سرگرم سیاسی جدوجہد سے بھرپور سال کی حیثیت سے ایسا گزرا کہ اس کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بی ایس او کے پھر سالانہ انتخابات قریب آ رہے تھے اور حکیم بلوچ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے اور واپس کوئٹہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ لیکن میں تھرڈ ائیر میں تھا اور بی اے فائنل کے لئے ایک سال باقی تھا۔ سینئر ساتھیوں کو پھر ان دو اہم عہدوں کے لئے امیدواروں کی تلاش تھی۔ بی ایس او کی ہمیشہ یہ روایات رہی ہے کہ اس کے سینئر ساتھی باہم صلاح و مشورہ سے صدر اور سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے ایسے ساتھی تلاش کرتے تھے جن کی Integrity کسی شک و شبہ سے بالاتر ہوتا اور تنظیم کے لئے ان کی خدمات کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔ کسی ایسے شخص کے لئے وہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جس کے متعلق ان کو مکمل یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ تنظیم کا کس قدر وفادار ہے۔ اس لئے بہت لمبی بحث و تمحیص کے بعد وہ مختلف عہدوں کے لئے اپنا پینل مقرر کرتے تھے اور پھر اس کو آگے لانے کے لئے اچھی طرح ہوم ورک کیا جاتا تھا۔ چونکہ میری خدمات اور گزشتہ ساری کارکردگی ان کے سامنے تھی اس لئے مجھے مجبور کیا گیا

کہ میں سیکریٹری جنرل کے عہدے کو دوبارہ برقرار رکھوں حالانکہ میں ان سے بار بار درخواست کرتا رہا کہ میری مالی مشکلات کی وجہ سے میں پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں ہوں اس لئے مجھے اس ذمہ داری سے فارغ کر دیا جائے لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ سنی البتہ حکیم بلوچ کو فارغ کرنا ان کی مجبوری تھی۔ چنانچہ مجھے دوبارہ 67-1966ء کے لئے سیکریٹری جنرل اور بیزن بزنجو کو بی ایس او کی صدارت کے لئے نامزد کر لیا گیا۔ لیکن جوں جوں انتخابات نزدیک آتے گئے ہمارے وہی سابقہ مخالفت کرنے والے دوستوں کی سرگرمیاں تیز ہوتی گئیں۔

بیزن کی نامزدگی پر تو خوش تھے لیکن میرے خلاف قادر چنال (موجودہ جنرل ریٹائرڈ عبدالقادر بلوچ) کو تیار کر لیا گیا تا کہ سیکریٹری جنرل کے عہدہ پر باقاعدہ الیکشن ہو۔ حالانکہ میں رضا کارانہ طور پر خود اپنی مالی مشکلات کی وجہ سے عہدہ دوبارہ برقرار رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے سینئر ساتھی کسی ایسے شخص کے لئے یہ رسک نہیں لینا چاہتے تھے جن کی سرگرمیوں کو وہ دیکھ چکے تھے اس لئے وہ بضد تھے کہ میں یہ عہدہ برقرار رکھوں اور اگر ضرورت پڑی تو الیکشن بھی لڑیں گے۔ الیکشن لڑنے پر ہمارے لئے کوئی خاص مسئلہ اس لئے نہیں تھا کہ طلباء کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ مولوی خیر محمد ندوی صاحب بہت ہی مہربان اور شفیق استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بی ایس او پر بہت احسانات ہیں ۔ اس نے لیاری کے نوالائن میں قائم اپنے اسکول کو کسی بھی قسم کی فنکشن کے لئے کبھی بھی ہمیں منع نہیں کیا حالانکہ اس دور میں ایسے بہت کم لوگ اس قسم کا خطرہ مول لیتے تھے۔ چنانچہ 67-1966ء کے انتخابات بھی اسی اسکول میں منعقد ہوئے۔ جناب قادر چنال نے اپنے دوستوں کے کہنے پر جنرل سیکریٹری شپ کے لئے اپنا نام تجویز تائید کنندوں کے ذریعے پیش کیا لیکن جب ان کو احساس ہوا کہ وہ جیت نہیں سکتے تو انہوں نے انتخابات ہونے سے پیشتر اپنا نام یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ وہ مزاق کر رہے تھے۔ بہر حال 67-1966ء کے لئے بیزن بزنجو صدر اور میں پھر سے دوبارہ سیکریٹری جنرل منتخب ہوا اور یہی وہ سال تھا جو بی ایس او کے لئے منحوس ثابت ہوا۔ کسی بھی تنظیم کے کسی بھی عہدہ کے لئے الیکشن لڑنا کوئی بری بات نہیں بلکہ ایک صحت مند علامت ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عمل میں اخلاص اور سنجیدگی کا عنصر بھی شامل ہو۔ الیکشن محض دراڑ پیدا کرنے یا نفرت کا اظہار کرنے کے لئے لڑا جائے تو وہ الیکشن یا سیاست نہیں ہوگی بلکہ اس قسم کے عمل سے محض ذاتی عناد کا اظہار ہوگا اور اس سے تنظیم کو بھی نقصان پہنچے گا۔ لیکن بعد کے واقعات سے ایسا معلوم ہوا کہ قادر چنال کو محض مہرے کے طور پر آگے کیا گیا تھا اصل مقصد وہی تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ ویسے بذات خود قادر بہت ہی اچھا ساتھی تھا کچھ عرصہ ہماری سرگرمیاں سابقہ ادوار کی طرح جاری رہیں لیکن ٹیم ورک اس طرح نہ بن سکی جس طرح حکیم بلوچ کے دور میں تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بلوچستان کے سیاسی قائدین بی ایس او پر مکمل غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان کی یہ کوشش تھی کہ بی ایس او ان کی ذیلی تنظیم کے طور پر کام کرے اور ان کے ہر جائز و ناجائز فیصلوں پر لبیک کہے۔

بیزن بزنجو میر غوث بخش بزنجو مرحوم کے بڑے بیٹے ہونے کے ناطے میر صاحب کے جانشین سمجھے جاتے تھے چونکہ میر غوث بخش بزنجو

بلوچستان کی سیاست میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے اس لئے بیزن کی بی ایس او کی صدارت پر فائز ہونا افتخار کی بات سمجھی جاتی تھی طلباء اور نوجوانوں کے توقعات بھی ان سے بہت زیادہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ اب بی ایس او پہلے سے زیادہ فعال کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوگی لیکن! افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ بیزن بزنجو بی ایس او کے دیئے ہوئے مینڈیٹ پر قائم نہیں رہ سکے اور بی ایس او بجائے مزید فعال ہونے کے بیزن بزنجو کی صدارت کے دوران تقسیم ہوگئی جس کی تقسیم در تقسیم عمل آج تک جاری ہے۔ اس تقسیم کے تفصیلی وجوہات اور واقعات کا ذکر تو آگے بیان کیا جائے گا لیکن یہاں میں یہ بات کہنے کی جسارت کروں گا کہ اگر بیزن اور اس کے کچھ حمایتی خاص کر منظور گچکی اور ڈاکٹر عبدالحئی اس وقت ہماری بات مانتے تو نہ صرف بی ایس او تقسیم نہ ہوتی بلکہ بعد میں میر غوث بخش بزنجو کو بی این پی بنانے کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ وہ 1988ء کے الیکشن ہارتے اور نہ اس مخصوص سازشی ٹولے کو پنپنے کا موقع ملتا جو بیرون ملک بیٹھ کر بلوچستان کے مفادات کا سودا کرنے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتے ہیں۔

میر غوث بخش بزنجو مکمل طور پر کھلے عام محمود ہارون اور اس کے بگ باس نواب امیر محمد خان آف کالا باغ کے کیمپ میں شامل ہو گیا تھا۔ محمود ہارون نے میر صاحب کو گارڈن میں ایک بنگلہ مہیا کیا تھا (یہ بنگلہ میر حمل کا تھا یا محمود ہارون کا واضح نہیں ہو سکا لیکن آشیر باد محمود ہارون کی تھی) تاکہ میر صاحب اس میں آرام سے بیٹھ کر سیاست کر سکیں کیونکہ اس سے پہلے میر غوث بخش بزنجو جب کراچی آتے تھے تو پارک ہوٹل جو جامعہ کلاتھ مارکیٹ میں واقع تھا ٹھہرتے تھے اور اس کا کرایہ اور دوسرے کھانے پینے کے اخراجات مختلف بلوچ آفیسرز ادا کرتے تھے۔ چونکہ بی ایس او کے نوجوانوں اور عہدیداروں نے ان بدلتے ہوئے موسموں کے اثرات کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے ان سب حالات و واقعات کے خلاف عجیب قسم کے بحث و مباحثے اور اختلاف رائے کے اظہار کا آغاز ہو چکا تھا اور اس میں لیاری اور مکران کے طلباء پیش پیش تھے۔ جب ان باتوں کا علم گارڈن کے بنگلے کے مقیموں کو ہوا تو انہوں نے بھی بڑی تیزی سے بی ایس او پر قبضہ کرنے کی آخری منصوبہ بندی مکمل کر لی۔ میر غوث بخش بزنجو نے اپنی سوانح عمری ''In Search Of Solutions'' کے صفحہ نمبر 137 میں لکھا ہے:

''In 1968 BSO held its first National Convention and conducted countrywide elections . A dispute arose over the election results , as Dr abdul Hayee's election was challenged and BSO split into two . The abdul Hayee-bizan faction which was in majority continued as BSO and the minority group under the leadership of Rahim Zafar separated and formed the BSO (anti Sardar Group) which was later renamed BSO (awami)''

اس سارے واقعہ کی حقیقی تصویر کچھ یوں ہے کہ ایک دن صدر کے پیراسین ہوٹل میں بیزن کی صدارت میں بی ایس او کے اجلاس کے دوران بیزن نے یہ تجویز بحث کے لئے پیش کی کہ اب وقت آ گیا ہے بی ایس او کو آل پاکستان کی بنیاد پر منظّم کیا جائے۔ پاکستان کے جن جن شہروں میں بلوچ طلباء رہتے ہیں یا زیرِ تعلیم ہیں ان کی زونل تنظیمیں بنائی جائیں۔ اس معقول تجویز پر کافی بحث ومباحثہ کے بعد ہم سب نے اپنے اپنے تجاویز کے ساتھ اتفاق کیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ کراچی میں قومی سطح پر ایک کنوینشن منعقد کریں گے جس میں بلوچستان سندھ اور ہو سکے تو پنجاب سے بلوچ طلباء کے وفود کو مدعو کریں گے اور اس کنوینشن میں بی ایس او کے آل پاکستان بنیاد پر عہدیداروں کا اعلان کریں گے اس کے اخراجات کے لئے مختلف علاقوں میں چندہ مہم کا آغاز کیا جائے گا یہ فیصلہ بھی ہوا کہ بی ایس او کے روایات کے مطابق صدر اور سیکریٹری جنرل کے عہدوں کے لئے ناموں کا فیصلہ مل کر کریں گے یہ آخری تجویز میں نے پیش کی جو کچھ لوگوں کو ناگوار تو گزری لیکن چونکہ اکثریت کی رائے یہی تھی اس لئے مصلحتاً وہ خاموش رہے۔ اس متفقہ فیصلے کے بعد رابطے شروع ہو گئے چندہ مہم کا بھی آغاز ہوا ہم نے اپنے کوئٹہ کے سینئر ساتھیوں کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور ان سے گزارش کی کہ چندہ کے ساتھ ساتھ وفود کو بھی روانہ کریں اور وہ ایسے لوگ ہوں جو قبائلی اثر ورسوخ سے آزاد ہوں بلکہ اپنی سیاسی سوچ رکھتے ہوں اس کام میں صورت خان مری سب سے زیادہ سرگرم رہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ان کا مقصد بی ایس او پر قبضہ کرنا تھا اور اس کو ان تمام اراکین سے صاف کرنا تھا جو اپنی آزادانہ سوچ یا رائے رکھتے تھے۔ اس لئے امیر الملک مینگل اور اس کے ساتھی کوئٹہ پہنچ چکے تھے۔ جمع کیے ہوئے چندہ کو قابو کر کے اپنی پسند کے کچھ وفود ترتیب دے کر کراچی روانہ کر دیا ان تمام لڑکوں کو ڈراپ کیا گیا جن کو ورنا وانندہ گل کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا۔ ان وفود کو کراچی لا کر محمود ہارون کے دئے ہوئے بنگلے پر ٹھہرایا اور اپنی میٹنگیں شروع کر دیں۔ یہ ساری کاروائی انہوں نے خفیہ رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے بھی بحیثیت سیکریٹری جنرل بی ایس او اس بات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

ایک شام حسبِ معمول میں کچھ دوستوں کے ساتھ صدر کے بلوچ کارنر میں خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ منظور گچکی وہاں پہنچا۔ منظور گچکی گارڈن والے بنگلے سے ہو کر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرانگی سے کہا کہ وہاں میر صاحب کے بنگلے میں بی ایس او کا اجلاس ہو رہا ہے اور تم سیکریٹری جنرل ہوتے ہوئے یہاں صدر میں تفریح کر رہے ہو۔ منظور کی یہ بات سن کر ہم سب سکتے میں آ گئے، میں نے کہا مجھے اس اجلاس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور نہ کسی نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ منظور گچکی نے مزید حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا وہاں تو باہر کے وفود بھی پہنچ چکے ہیں۔ کنوینشن کی تیاری ہے اور تم کہتے ہو کہ تمہیں معلوم نہیں چلو ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں نے کہا منظور یہ تو بے عزتی کی بات ہے اس طرح میں کیسے جاؤں اس کا مطلب ہے وہ کچھ اور کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی یہی منشاء ہے تو کرنے دو ہم اس کو تسلیم نہیں کریں گے۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی منظور کی تائید کی اور منظور نے مجھے بزور گھسیٹتے ہوئے رکشہ میں بٹھا کر گارڈن میں میر صاحب کے بنگلے لے گیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو واقعی باقاعدہ اجلاس جاری تھا۔ بیزن صدارت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحئی اور غالباً مولا بخش مگسی کے علاوہ بی ایس او کراچی کے مرکزی کونسل کا کوئی عہدیدار موجود نہ تھا۔ حسین بخش بنگلزئی بھی اجلاس میں شریک تھے جس کا بی ایس او میں کوئی عہدہ نہیں تھا اور باقی کوئٹہ سے آئے ہوئے وفود جو انتہائی ناپختہ لگ رہے تھے جن کا فی الحال اس اجلاس سے کوئی تعلق نہیں تھا بھی شریک تھے۔ جوں ہی ہم اندر کمرے میں پہنچے تو مجھے دیکھ کر بیزن اچھل پڑا۔ ڈاکٹر عبدالحئی کی بھی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ بیزن نے کہا یار معاف کرنا تمہیں ہم نے بہت رابطہ کیا لیکن تم نہ مل سکے اچھا ہوا تم خود آئے ہو بیٹھو میٹنگ اٹینڈ کرو۔ منظور گچکی چونکہ نہ عہدیدار تھا نہ ایگزیکٹو باڈی کا ممبر تھا اس لئے وہ مجھے کمرے مین پہنچا کر خود باہر نکل گئے۔ میں نے بیٹھتے ہی سوال کیا کہ واقعی آپ لوگوں کی باضابطہ میٹنگ ہو رہی ہے یا آپ لوگ محض گپ شپ لگا رہے ہیں۔؟ بیزن نے جواب دیا کہ یہ بالکل ہماری باضابطہ میٹنگ ہو رہی ہے۔ میں نے پوچھا یہ کس تنظیم کی میٹنگ ہو رہی ہے۔؟ انہوں نے کہا بی ایس او کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ میں نے پھر سے سوال کیا کہ بی ایس او کے تو آپ محض تین عہدیدار ہو اور پھر یہ حسین بخش بنگلزئی کس حیثیت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔؟ حسین بخش سے مخاطب ہو کر میں نے کہا کہ برائے مہربانی آپ باہر چلے جائیں، حسین بخش بنگلزئی اس زمانے میں اپنے آپ کو بڑا ترم خان سمجھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا قوم پرست سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو نیپ کی اعلیٰ قیادت میں شمار کرتے تھے۔ اس کو میری یہ حرکت بہت ناگوار گزری لیکن جب کسی نے ساتھ نہ دیا تو منہ بنا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں سردار عطاء اللہ مینگل قیام پزیر تھے۔ (یہی حسین بخش بنگلزئی بعد میں پی پی پی میں شامل ہوئے اور پھر مسلم لیگ ضیاء الحق اور سینیٹر سے تھائی لینڈ میں سفیر بن گئے۔)

میں نے باہر سے آئے ہوئے وفود کو معذرت کرتے ہوئے کہا کہ بیزن صاحب یہ اجلاس قطعاً غیر قانونی اور غیر آئینی اجلاس ہے۔ بی ایس او ابھی آل پاکستان کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی ہے۔ اس وقت محض کراچی کی بنیاد پر بی ایس او اپنا وجود رکھتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ گزشتہ اجلاس کے فیصلے کے مطابق پہلے محض بی ایس او کراچی کا اجلاس ہوگا جس میں ہمارے سارے عہدیدار اور کونسل کے ممبران کی شرکت ضروری ہے اور ہم اپنے روایات کے مطابق فیصلہ کریں گے کہ آل پاکستان کی بنیاد پر خاص کر چیئرمین اور سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے کون کون ہمارا امیدوار ہوگا۔ پھر کنونشن سے پہلے مجھے بحیثیت سیکریٹری جنرل اپنی سالانہ رپورٹ تیار کرنی ہے اس کی بی ایس او کی ایگزیکٹو باڈی سے منظوری لے کر کنونشن میں اس کو پڑھنا ہے اس کے بعد ہم کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ بیزن نے کہا کہ اس سارے کاموں کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے کل شام کو کڑک ہال میں ہمارا کنونشن ہے۔ اس لئے آپ کو جو کرنا ہے آپ رات کو کریں۔ میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، میں نے کہا بیزن صاحب آخر آپ لوگوں کو اس قدر جلدی کیوں ہے۔ کون سا آسمان گرنے والا ہے۔ ہماری تکرار جاری تھی کہ اس دوران بی ایس او کے چیدہ چیدہ عہدیدار جن میں عبداللہ بلوچ، قیوم بارکزئی، رسول بخش اور ایگزیکٹو باڈی کے کچھ ممبران پہنچ گئے۔ کچھ کو صدر میں بلوچ کارنر پہنچنے پر معلوم ہوا کچھ کو مختلف ذرائع سے معلوم ہوا اس لئے شاید قدرت ہماری ساتھ دے رہی تھی تقریباً

بی ایس او کا کورم پورا ہو چکا تھا۔ جب یہ سب وہاں پہنچ گئے تو میں نے وفود سے گزارش کی کہ آپ لوگ جا کر آرام کریں اب بی ایس او کی باقاعدہ میٹنگ ہوگی۔

میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہوا چونکہ میرے پاس گزشتہ کاروائی کا ریکارڈ موجود نہیں تھا اس لئے مجھے جو یاد تھا میں نے زبانی سنا دیا اور اس فیصلے پر زور دیا کہ آل پاکستان کی بنیاد پر بی ایس او کا چیئرمین اور سیکریٹری جنرل کون ہوگا۔ میں نے کہا کسی بھی طرح آج رات میں اپنی سالانہ رپورٹ تیار کروں گا اور کنونشن سے پہلے بی ایس او کی مرکزی کونسل سے اس کی منظوری لوں گا۔ اس ناگہانی اجلاس سے ان کا سارا پلان وقتی طور پر چوپٹ ہو گیا۔ کافی لے دے کے بعد سب نے متفقہ طور پر چیئرمین اور سیکریٹری جنرل کے لئے دو ناموں پر اتفاق کیا۔ ان میں بیزن بزنجو بحیثیت چیئرمین اور مشتاق احمد بحیثیت سیکریٹری جنرل آل پاکستان بی ایس او منظور کئے گئے۔ دوسرے دن کا اجلاس ۱۰ بجے اسی جگہ طے کر کے تقریباً رات ڈیڑھ بجے ہم وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

باقی لوگ تو اپنے گھروں کے لئے روانہ ہوئے لیکن میں اور عبداللہ بلوچ وہاں سے سیدھا ناظم آباد ''زمانہ بلوچی'' کے دفتر چلے گئے جہاں صدیق آزاد اس رسالہ کو لکھتے کتاب کراتے پروف دیکھتے اور چھپواتے تھے۔ اس زمانے میں بلوچی زبان کا یہ ایک بہترین رسالہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں بعد میں، میں نے بھی بحیثیت سب ایڈیٹر کام کیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ صدیق آزاد وہاں دیر تک بیٹھے ہیں اس لئے ہم جب وہاں پہنچے تو رات کے دو بج چکے تھے اور صدیق جانے کی تیاری کر رہے تھے ہمیں دیکھ کر پھر بیٹھ گئے اور میں نے اس کی مدد اور رہنمائی میں سالانہ رپورٹ تیار کر لی اس میں بلوچستان نیپ کی قیادت پر اچھی خاصی تنقید کی اشاروں کنائیوں میں بلوچستان کے ان لیڈروں پر بھی سخت تنقید کی جنہوں نے ہماری معلومات کے مطابق امریکی سفارت خانہ سے رابطے استوار کئے تھے اور کچھ مراعات حاصل کی تھیں اس وقت کراچی کے حالات ایسے نہیں تھے جو آج کل ہیں وہ واقعی روشنیوں کا شہر ہوتا تھا اور ساری ساری رات جاگتا تھا اس لئے جب ہم رات تین یا ساڑھے تین بجے زمانہ بلوچی کے دفتر سے نیچے پہلی چورنگی پہنچے تو ہمیں رکشہ مل گیا تھا۔

میری آج بھی یہ عادت ہے کہ جب مجھے صبح جلد اٹھنا ہو یا سویرے کوئی فلائٹ پکڑنی ہو تو مجھے صحیح نیند نہیں آتی۔ اگر سو بھی جاؤں تو ہر ۱۵ تا ۲۰ منٹ بعد میری آنکھ خود بخود کھل جاتی ہے اس عادت کے زیر اثر میں صبح سات بجے اٹھ کر تیار ہو گیا۔ ایک نظر اپنی رپورٹ پر ڈالی اور ۸ بجے گھر سے روانہ ہوا اس زمانے میں، میں کھارادر کے ایک پرانے فلیٹ میں رہتا تھا، جو کسی میمن سیٹھ کی ملکیت تھی اس فلیٹ کی بھی ایک داستاں ہے جس کا ذکر اگر وقت نے ساتھ دیا تو آگے ضرور کریں گے۔ میں پاکستان کوارٹرز سے عبداللہ کو اٹھاتے ہوئے ٹھیک ۹ بجے میر صاحب کے بنگلے میں پہنچ گیا۔ وہاں پورا بنگلہ سنسان تھا اور اس کے مکین سو رہے تھے۔ زندگی کا کوئی آثار نظر نہیں آ رہا تھا کچھ دیر انتظار کے بعد ہم بیزن تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے جو اپنی خواب گاہ میں سو رہے تھے کسی طرح اٹھ کر ہمارے ساتھ باہر لان تک آئے اور آنکھیں مکتے ہوئے ہمیں یہ دردناک خبر سنائی کہ حکومت نے ہماری کنونشن پر پابندی لگائی ہے۔ میں نے اور عبداللہ نے ایک دوسرے کو ایسا دیکھا

جیسے ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہو کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا آخر یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ رات تک تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے حکومت سے اجازت لے لی ہے۔ بیزن نے کہا کہ کل امیر محمد نواب آف کالا باغ کا پنجاب میں قتل ہوا ہے اس کے پیش نظر حکومت نے تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگائی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو ہم یہیں بند کمرے میں بیٹھ کر اپنا اجلاس کرتے ہیں۔ سالانہ رپورٹ پیش کریں گے اور شام کو اپنے انتخاب بھی کر لیں گے۔ بیزن نے انگڑائی لیتے ہوئے برخستہ جواب دیا کہ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم نے یہ سارا کام آپ لوگوں کے جانے کے بعد رات ہی کو کر لیا ہے۔ آل پاکستان کی بنیاد پر بی ایس او کے عہدیدار بھی ہم نے مقرر کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحئی کو چیئرمین اور مجھے (یعنی بیزن کو) جنرل سیکریٹری چن لیا گیا ہے۔ اس جواب سے ہمیں تو جیسا سانپ نے سونگھ لیا ہمارا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جیسا ہمارے بہت قریب کسی نے کوئی زوردار دھماکہ کر لیا ہو اور چاروں طرف جیسے لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی ہوں جن میں ہماری اپنی لاشیں بھی شامل ہوں۔ جب کچھ دیر بعد ہمارے حواس بحال ہوئے تو میں نے کہا بیزن صاحب آخر کار آپ لوگوں نے وہی کیا جس کا ہمیں خدشہ تھا لیکن یہ نہیں چلے گا کم از کم میں تو اس تنظیم کو تسلیم نہیں کروں گا۔ عبداللہ نے جواب دیا آپ نہیں اس تنظیم کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا بیزن صاحب خدارا یہ نہ کریں، بی ایس او تقسیم ہو جائے گی ہم سب کی محنت رائیگاں جائے گی آپ کو معلوم ہے ہم کل سوئے نہیں ہیں اور پھر یہ کوئی مہذب طریقہ بھی نہیں ہے۔ بیزن نے کھسیانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''دیکھو رحیم اس کو مسئلہ مت بناؤ یہ فیصلہ ہم سب نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس میں ہمارے قائدین میر صاحب اور سردار عطاء اللہ مینگل جو یہاں موجود ہیں ان کی مرضی شامل ہے، باہر سے آئے ہوئے وفود کی رائے بھی شامل ہے آخر عہدوں میں کیا رکھا ہے ہم سب ساتھی ہیں ہمیں مل کر کام کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔'' میں نے کہا بیزن صاحب ہمیں طفلانہ تسلی نہ دیں یہ یک طرفہ فیصلہ ہے اس کے خلاف ہم بھرپور احتجاج کریں گے اور شام کو کڑک ہال جانے کی بھی کوشش کریں گے اور اگر ہم ہال تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو ہم یہ ساری صورتحال ممبران اور لوگوں کے سامنے رکھیں گے اور اس سازش کو بے نقاب کریں گے یہ کہہ کر میں اور عبداللہ بوجھل قدموں کے ساتھ روانہ ہونے والے تھے کہ مولا بخش مگسی، رسول بخش، قیوم بارکزئی اور کچھ دوست وہاں نکلتے ہوئے گیٹ پر ہمیں ملے اس دوران بیزن اندر جا چکے تھے ہم نے ساتھیوں کو ان کے اس غیر آئینی فیصلے سے آگاہ کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل کے لئے جب ان سے رائے لی تو سوائے مولا بخش مگسی کے باقی سب نے ہم سے اتفاق کیا، میں اور عبداللہ وہاں سے ایس ایم ہاسٹل آئے اور ساتھیوں کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ شام ۴ بجے کڑک ہال آنے کی کوشش کریں۔ شام ۴ بجے کے قریب کافی لڑکے مختلف سمتوں سے کڑک ہال کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ چکی تھی۔ پورے ہال کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا میں عبداللہ اور کہدہ امداد (مرحوم) صدر میں ایک کونے میں کھڑے دور سے حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھے کہ ایک سائیکل سوار یکدم ہمارے سامنے آ کر رک گیا اور ہم سے بلوچی میں مخاطب ہو کر کہا ''کوشش بیکار ہے، چپکے سے اپنے اپنے گھر چلے جاؤ اگر تم لوگوں

نے کوشش کی تو بہت مار کھاؤ گے۔'' ہم نے بھی اس سے بلوچی میں پوچھا بھائی آپ کون ہیں؟ آپ کو کیسے معلوم کہ ہم یہاں کس لئے کھڑے ہیں؟ اس نے کہا'' چونکہ آپ لوگ بلوچ ہیں اس لئے میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں۔ میرا نام صدیق ہے لیاری میں رہتا ہوں اور پولیس ہی میں کام کرتا ہوں اور برادرانہ مشورہ دے رہا ہوں۔'' ہم نے کہا ٹھیک ہے آپ کی مہربانی ہم چلے جائیں گے لیکن ہمیں اتنا ضرور بتا دیں کہ جب حکومت نے ہمیں یہاں اپنا کنونشن اور جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دی ہے تو دوبارہ کیوں منع کر رہی ہے۔ اس نے بڑے ڈپلومیٹک انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ'' یہ بات آپ اپنے بلوچستان کے لیڈروں سے معلوم کریں اجازت انہوں نے لی تھی جب وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں تو آپ لوگ کیوں ادھر اُدھر سونگھتے پھر رہے ہو اس کو کچھ گھنٹہ پہلے ہمارے آپس کے اختلافات کا پتہ نہیں تھا۔ کچھ کچھ بات ہماری سمجھ میں بھی آئی اس لئے کہدہ امداد نے مشورہ دیا کہ بندہ سچ کہہ رہا ہے بہتری اسی میں ہے کہ ہم لوگ یہاں سے کھسک جائیں یہ کہہ کر کہدہ امداد فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن میں اور عبداللہ کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر سوچتے رہے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک بہت بڑی سازش ہے ہمیں یہاں اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے باہر رہ کر اس سازش کا مقابلہ کرنا چاہیے اس لئے ہم بڑی احتیاط سے ادھر اُدھر گھوم پھر کر جن ساتھیوں سے رابطہ کر سکے ان کو واپس جانے کو کہا اور خود صدر کے ایک نیم اندھیرے ریسٹورنٹ میں آئے جہاں کہدہ امداد پہلے سے ہمارا منتظر تھا۔

میں نے اور میرے قریبی دوست عبداللہ نے اس وقت مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو ہم اس سازش کا مقابلہ کریں گے اور ان کے اس غیر قانونی فیصلہ کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ یقیناً اس وقت کے حالات میں یہ ایک بہت ہی کٹھن کام تھا اس وقت میر غوث بخش بزنجو، سردار عطاء اللہ مینگل اور نواب خیر بخش مری بلوچستان کے غیر متنازعہ مضبوط ترین لیڈر تھے جن کا نہ صرف ملک میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک ساکھ تھی بی ایس او کی اس غیر قانونی فیصلے کے دوران نواب خیر بخش مری تو موجود نہ تھے لیکن سردار عطاء اللہ مینگل اور میر غوث بخش بزنجو دونوں اس محمود ہارون کے دیئے ہوئے بنگلے میں موجود تھے وہ چاہتے تو ان کو روک سکتے تھے اس لئے صاف ظاہر تھا کہ ان کا آشیر باد بھی ان کو حاصل تھا۔ اس لئے اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھانا دیوار سے اپنا سر پھوڑنا ہے لیکن ہم نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ سر تو پھوٹے گا لیکن ان پتھروں پر خون کے نشان تو باقی رہیں گے جو اس بات کی گواہی دیتے رہیں گے کہ کچھ تو سر پھرے تھے جو اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہے۔ یہ واقعہ 68-1967ء کا ہے۔ آج سے 30 سال پیشتر کا یعنی جو بات ہم کچھ لوگوں کی سمجھ میں آج سے 30 سال پہلے آئی وہی بات ہمارے کچھ ساتھیوں کی سمجھ میں تھوڑی بہت 1988ء میں یعنی 21 سال بعد اور شاید پوری طرح 1990ء میں آئی، 23 سال بعد جب ڈاکٹر عبدالحئی کو اپنا'' بی این ایم'' الگ کرنا پڑا جو ہمیشہ ہمارے خلاف ہوتے تھے اور کچھ دوستوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے اور وہ اب بھی آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہی لوگ سابقہ قائدین بلوچستان کے درد کا مداوا بنیں گے حالانکہ اب تو ہر چیز صاف نظر آ رہی ہے۔ بقول نواب اکبر بگٹی'' اب تو وہ سارے قوم پرست محض لاپ (پیٹ) پرست بن چکے ہیں'' اب تو مقابلہ یہ ہے کی کون کس

طرح زیادہ سے زیادہ کرپشن کا عالمی ریکارڈ توڑ کر ''گینیز بک'' میں اپنا نام شامل کرائے گا کون کس سے اچھے انداز میں پنجاب کے حکمرانوں کے آگے کورنش بجال لائے گا۔لیکن ہم کچھ ساتھیوں نے تو 1967ء میں شعوری طور پر محسوس کرلیا تھا کہ یہ لوگ اپنے مخصوص قبائلی اور ذاتی مفادات کا تحفظ کررہے ہیں اس سے آگے ان کا کوئی اور وژن نہیں۔

بلوچ طلباء اور نوجوان ''ورنا وانندہ گل'' اور ''بی ایس او'' کی پلیٹ فارم سے بلوچ قومی تحریک میں ایک بہت ہی فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں سب کی یہ کوشش اور جدوجہد رہی ہے کہ یہ تحریک مکمل سیاسی تحریک کی شکل میں منظّم ہو، ہر رکن کو محض سیاسی بنیاد پر اہمیت حاصل ہو نہ کہ قبائلی بنیاد پر اُس سوچ کو آگے بڑھانے میں اہم کردار مکران اور کسی حد تک لیاری سے تعلق رکھنے والے کارکن کررہے تھے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں علاقوں میں قبائلیت اپنا دم توڑ چکی تھی اس بات کو شاید ہمارے سیاسی سردار محسوس کرچکے تھے اس لئے انہوں نے بھی پیش بندی شروع کردی تھی اور اپنا پہلا وار بی ایس او پر کرکے اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔

دوسرے دن ہم نے بھرپور طریقہ سے بی ایس او کے اراکین سے رابطہ شروع کردیا ان کے سامنے کھل کر اپنے مؤقف کا اظہار کیا اور سارے حقائق بیان کئے، شروع شروع میں ہمیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بہت کم لوگوں کو ہماری ان باتوں کا یقین ہوتا تھا کیونکہ اس قسم کی غیر قانونی فیصلوں کو وہ ان لوگوں سے توقع ہی نہیں رکھتے تھے طلباء اور سیاسی کارکنوں میں ایک سراسیمگی پھیل گئی لیکن جوں جوں حقائق آشکار ہوتے گئے طلباء اور سیاسی کارکنوں کی اکثریت کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ بڑھتی گئیں۔ ہمارے مؤقف کی حمایتیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا مختلف کالجوں اور کراچی یونیورسٹی میں طلباء نے ڈاکٹر عبدالحئی اور بیزن بزنجو سے چبھتے ہوئے سوال شروع کردیئے اور بحث و تکرار کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا بلوچ طلباء کی اکثریت آل پاکستان بی ایس او کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی کیونکہ یہ چند لوگوں نے خود بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں ایک بند کمرے میں تشکیل دی تھی جس کا باقی طلباء کو علم نہ تھا۔اس تنظیم کا محض علم کوئٹہ سے آئے ہوئے ان چند وفود کو تھا۔البتہ کراچی میں زیر تعلیم کچھ طلباء اس غیر قانونی تنظیم کی حمایت کرتے تھے۔جن میں امیر الملک مینگل جو خود اس سارے منصوبے کا حصہ تھے۔منظور گچکی، قادر چنال، لیاری سے لطیف بلوچ، صدیق جنگیاں، سیاسی کارکنوں میں لال بخش رند، قادر مطاہر (مرحوم) وغیرہ تھے، البتہ لیاری کے ہمارے دو ساتھیوں کا رول واضح نہیں تھا ایک اسحاق اور دوسرا مولا بخش مگسی ہمارے سامنے ہمارے مؤقف کو درست مانتے تھے اور ان کے سامنے ان کی تائید کرتے تھے لیکن ان کی حقیقی ہمدردیاں بیزن وغیرہ کے ساتھ تھیں۔

اس دوران میں نے بحیثیت سیکریٹری جنرل بی ایس او کراچی کا ایک اجلاس طلب کیا، جس میں بیزن اور ڈاکٹر عبدالحئی کے علاوہ باقی تمام اراکین نے شرکت کی، مخصوص ایجنڈا اسی تنازعہ کو رکھا گیا تھا جس پر تفصیل سے بحث و تمحیص ہوئی اور تمام اراکین نے متفقہ فیصلہ کیا کہ بیزن بزنجو صدر بی ایس او اور ڈاکٹر عبدالحئی جو اس وقت بی ایس او کراچی کے خزانچی کے عہدہ پر کام کررہے تھے اس غیر قانونی عمل پر ان سے جواب طلب کیا جائے لیکن کسی سخت اقدام سے پہلے ایک اجلاس اور بلاتے ہیں، ان کو ایک موقع اور دیتے ہیں تاکہ آکر اپنی صفائی پیش

کرسکیں اور اگر پھر بھی نہیں آئے تو پھر باقاعدہ تحریری طور پر شوکاز نوٹس جاری کر کے ان کی رکنیت معطل کر لیں گے، چنانچہ دوسرے اجلاس کے بارے میں بیزن اور عبدالحئی کو تحریری طور پر لکھ کر اجلاس کی جگہ اور وقت کے بارے میں مطلع کیا گیا اور تحریری طور پر پہنچانے والے کو تاکید کی کہ ان سے جواب بھی تحریری طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دوسری میٹنگ کے لئے جب میں وقت سے پہلے صدر پہنچا تو میں نے بیزن اور عبدالحئی کو پہلے سے وہاں موجود پایا۔اس زمانے میں ٹیڈی پتلون کا رواج تھا۔ میں نے بھی اس دن سوٹ ٹائی وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ہم بڑے گرم جوشی سے ملے ہنسی مذاق کے بعد بیزن نے اپنا کالا چشمہ اتارتے ہوئے ایک طنزیہ نگاہ میرے سوٹ پر ڈالتے ہوئے کہا'' لگتا ہے آج کل تمہارے پاس بہت مال ہے''۔ میں نے کہا مال ہی تو ہے اس لئے اس گرمی میں، میں نے سوٹ پہنا ہوا ہے۔سوٹ کا قصہ کچھ یوں تھا کہ کپڑا میرے کزن نے گلف سے میرے لئے روانہ کیا تھا جو میرے پاس درزی کا کرایہ نہ ہونے کی سبب دو مہینے سے اُس کے پاس پڑا ہوا تھا اس دن صبح صبح میں درزی کے پاس گیا اور اپنی سیکو گھڑی گروی رکھ کر سوٹ چھڑایا کیونکہ میں نے نہ جانے کس وجہ سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آج سوٹ پہن کر جاؤں گا۔ہم بلوچ کارنر صدر میں کھڑے دوسرے ممبران کا انتظار کر رہے تھے۔یاد رہے کہ بی ایس او کے اجلاس اکثر صدر کے پیراسین ریسٹورنٹ کی بالائی منزل پر منعقد ہوتے تھے ۔بیزن نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک طرف لے گیا اور انتہائی سنجیدگی سے کہا کہ'' دیکھو رحیم یہ پھڈے بازی چھوڑ دو میٹنگ وغیرہ کا سلسلہ ختم کرو تمہیں اگر کوئی نوکری وغیرہ چاہیے تو میں کوشش کر کے تمہیں ''ڈان اخبار'' میں لگوا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا کہ بیزن صاحب آپ مجھے بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں یہ سب کچھ محض ملازمت یا نوکری حاصل کرنے کے لئے نہیں کر رہا ہوں۔ملازمت کی واقعی مجھے سخت ضرورت ہے لیکن اس کا اس مسئلے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے اگر مجھے ملازمت دلا بھی دیں تو تب بھی میں اس اصولی مؤقف سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں آپ بی ایس او کے صدر ہیں۔اجلاس میں آئیں اور اراکین کو مطمئن کریں اگر اکثریت نے آپ کے اس غیر قانونی عمل کی حمایت کی تو میری بات کی وقعت خود بخود ختم ہو جائے گی جو اکثریت کی رائے ہوگی ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ بیزن کو معلوم تھا کہ ایگزیکٹو باڈی کی اکثریت اس کی حمایت نہیں کرے گی۔اس لئے وہ میری ان باتوں سے سخت خفا ہو گئے اور دھمکی آمیز لہجہ میں کہا'' Mind Rahim if you go against me . Then i also go against you ''اس کے بعد ہم سب میٹنگ کے لئے روانہ ہوئے۔اجلاس سخت تناؤ کی کیفیت میں شروع ہوا اکثریت نے بیزن اور ڈاکٹر حئی کی اس غیر قانونی اقدام کی سخت مخالفت کی اور ان پر شدید تنقید کی اور ڈاکٹر حئی کو تنبیہ کی گئی کہ وہ محض اپنے آپ کو بی ایس او کراچی کا خزانچی تصور کریں اور اگلے اجلاس میں سارا حساب و کتاب ایگزیکٹو کمیٹی کے سامنے پیش کر کے اس کی منظوری لیں۔ بیزن بزنجو کو تاکید کی گئی کہ وہ بی ایس او کراچی کا صدر رہتے ہوئے سالانہ انتخاب کرانے کی تیاری کریں اور جوں ہی نئی تنظیم حلف اٹھائے گی وہ اس بات کی مجاز ہوگی کہ بی ایس او کو آل پاکستان کی بنیاد پر تشکیل دے کر منظّم کرے بے شک اس میں ڈاکٹر حئی چیئرمین ہوں یا کوئی اور لیکن یہ سب کچھ قانونی، آئینی اور مروجہ اصولوں کے

مطابق ہونا چاہیے چونکہ یہ فیصلہ ان کے بڑوں نے کیے تھے اس لئے بیزن اور ڈاکٹر حئی نے ہماری ان گزارشات پر عمل کرنے سے صاف انکار کرتے ہوئے اس بات پر بضد رہے کہ کراچی بی ایس او اپنی وجود کھو چکی ہے۔ ہم نے بی ایس او کو آل پاکستان کی بنیاد پر تشکیل دی ہے ڈاکٹر حئی اس کے چیئرمین اور میں (بیزن) اس کا جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے اور اجلاس کسی حتمی فیصلہ کے بغیر ختم ہو گیا۔ جاتے جاتے ہم نے بھی ان کو واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ہم اس تنظیم کو تسلیم نہیں کریں گے۔

ہم نے اپنی جدوجہد تیز کی طلباء سے رابطہ کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے سامنے اپنی حقیقت پر مبنی مؤقف کو پیش کیا جس کو کافی پذیرائی ملی، نہ صرف ہماری اس مؤقف کی تائید کوئٹہ کے سینئر طلباء نے کی بلکہ ہماری بھرپور مدد و رہنمائی بھی کی ان دنوں ہم ساری ساری رات لیاری کے گلی کوچوں میں طلباء اور نوجوانوں سے رابطہ کرتے اور دن میں شہر کے مختلف کالجوں، کراچی یونیورسٹی اور ہاسٹلوں میں جا کر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ بی ایس او کو اپنی اصل شکل میں برقرار رکھتے ہوئے اس کے سالانہ انتخابات منعقد کرا دیں اور تنظیم کو نئے عہدیداروں کے حوالہ کر دیں اس مہم کے دوران کراچی یونیورسٹی میں بشیر احمد بلوچ، محمد یار، یاسین اور ڈاکٹر نور احمد (مرحوم) کافی سرگرم رہے۔ ملیر کے جامعہ ملیہ میں مشتاق احمد اور ماسٹر پیر بخش شہر کے دوسرے کالجوں میں راقم، عبداللہ بلوچ، بشیر بیدار اور لیاری میں قیوم بارکزئی، شمشاد بلوچ (مرحوم) فیض بلوچ، رمضان، اکبر جلال، ابراہیم، گلاب بلوچ اور قادر مشہدی (مرحوم) دن رات مصروف عمل تھے۔

ایک دن صبح ہم ایس ایم کالج پہنچے تو دیکھا جان محمد دشتی (موجودہ بیوروکریٹ) بیزن کے ساتھ بی ایس او کے مسئلے پر ایسا لڑ رہے تھے جیسا ان کے درمیان زمین یا جائداد کے مسئلے پر کوئی لڑائی ہو۔ جان محمد دشتی اس وقت ہماری مؤقف سے مکمل اتفاق رکھتے تھے۔ زیادہ بحث و مباحثہ کی وجہ سے بیزن کا منہ خشک ہو گیا تھا اور اس کی مزید تکرار کی قوت ختم ہو گئی تھی اور اوپر سے ہم لوگ پہنچ گئے۔ اس لئے بیزن اور اس کے ساتھیوں نے وہاں سے چلے جانے میں اپنی عافیت سمجھی۔ افسر بننے کے بعد جان محمد دشتی ہمارے شدید مخالف بن گئے جب بی این پی (BNP) بنی تو دشتی صاحب تنخواہ دار ملازم ہونے کے جاوجود بی این پی (BNP) کے پالیسی سازوں میں شامل ہو گئے تھے اور آج کل وزیر اعلیٰ اختر جان مینگل کے پرسنل سیکریٹری بنے ہوئے ہیں۔ (اب نہ اختر جان مینگل صاحب ہیں اور نہ جان محمد دشتی صاحب)

جوں جوں ہماری سرگرمیاں تیز ہوتی گئیں ہماری مخالف کیمپ کے صفوں میں ہلچل مچتی گئی وہ اس قدر بوکھلا گئے کہ انہوں نے مار کٹائی کا پلان بنا لیا اس پلان کا پہلا نشانہ میں بنا۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر قادر بخش نظامانی نے اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ میں نے کراچی صدر کے ایک پرانی کتابوں کی بک اسٹال سے ایک کتاب خریدی تھی، جس کا نام ''Breakers of Conventions'' تھا جو کسی انڈین مصنف نے لکھی تھی۔ جنہوں نے اس کتاب کو جواہر لال نہرو کے نام سے منسوب کیا تھا۔ میری اس کتاب کے متعلق لطیف بلوچ کو معلوم تھا۔ ایک رات میں اپنے کھارادر والے فلیٹ میں شب خوابی کا لباس پہن کر اس کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا کہ تقریباً رات ساڑھے دس بجے دروازے پر دستک ہوئی، آواز دینے پر معلوم ہوا کہ لطیف بلوچ ہے۔ اس لئے دروازہ کھول کر اس کو اندر بلایا۔ آمد کی وجہ پوچھی تو انہوں

نے بہانہ بنا کر کہا کہ وہ یہ کتاب لینے آیا ہے۔ میں نے کہا کتاب تو ابھی میں نے شروع کی ہے پڑھ کر آپ کو دے دوں گا۔ انہوں نے ضد کی کہ پھر میں نیچے چل کر اس کو چائے پلاؤں۔ حالانکہ میں بہت ہی تھکا ہارا سونے کے لئے فلیٹ میں آیا تھا۔ لیکن وہ مہمان تھا مجبوراً میں اٹھ کر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہم کھارادر پولیس چوکی کے سامنے والے ہوٹل میں آئے۔ وہاں ایک ٹیبل پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا اور حالات حاضرہ پر بحث شروع کر دی۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ لطیف مجھے مارنے کے لئے چائے کا بہانہ کر کے مجھے فلیٹ سے نیچے لیکر آیا ہے۔ لطیف کاؤبوائے اسٹائل کے کپڑے اور لال رنگ کے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ گرم چائے کے ساتھ ساتھ ہماری بحث ومباحثہ بھی گرم ہوتی گئی اور ہماری آواز بھی اونچی ہوتی گئی۔ اس لئے ہوٹل میں بیٹھے لوگ اور ہوٹل مالک بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ میں جلد سے جلد لطیف کو فارغ کر کے اس دلچسپ کتاب کو پڑھنے کے لئے فلیٹ میں پہنچ جاؤں۔ لیکن وہ مجھے چھوڑنے پر راضی نہیں ہو رہے تھے چونکہ وہ مجھے مارنے کی نیت سے آئے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کو کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہوٹل کا بل ادا کیا اور جب ہم باہر نکلے تو لطیف نے پھر بحث چھیڑ دی، ہوٹل کے باہر سفید ٹائلز سے بنا ہوا ایک تلا جو کباب وغیرہ بنانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اس وقت خالی تھا، میں اس پر دوزانو بیٹھ گیا اور لطیف نے کاؤبوائے اسٹائل بنا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، لڑائی کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر سوال کیا کہ تم غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کی مخالفت کیوں کرتے ہو۔؟ میں نے بڑے دھیمے آواز میں اس کو جواب دیا کہ وہ سیاسی لیڈر ہیں اور سیاسی لیڈر پبلک پراٹی ہیں۔ اس کی تعریف بھی کی جاتی ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا جاتا ہے۔ آپ زبردستی ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ لطیف نے ایک زوردار مکا میرے منہ پر رسید کر دیا اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا دوسرا اور تیسرا.....ہم گھتم گھتا ہو گئے۔ پولیس تھانہ بالکل سامنے تھا ہم سڑک پر فروٹ کے چھلکوں اور کاغذوں پر ملیا میٹ ہو رہے تھے۔ کبھی میں نیچے کبھی لطیف، اس دوران ایک پولیس والا بہت بڑا ڈنڈا لے کر پہنچ گیا۔ اُس زمانے میں پولیس کے پاس بندوق کے بجائے بڑے لمبے ڈنڈے ہوتے تھے۔ جس وقت پولیس نے ڈنڈا گھمایا تو اس وقت میں نیچے تھا اور لطیف اوپر اس لئے جوں ہی لطیف پر ڈنڈا پڑا اس نے مجھے چھوڑ دیا اور پولیس والے نے اس کی گردن پکڑ لی۔ اس کو گھسیٹتے ہوئے پوچھا تم لوگ سڑک پر کیوں بدمعاشی کر رہے ہو کس بات پر جھگڑ رہے ہو۔؟ اب ظاہر ہے پولیس کو ہم دونوں یہ تو نہیں بتا سکتے تھے کہ ہماری لڑائی بلوچستان کی سیاست پر ہو رہی ہے اس لئے ہم دونوں چھپ ہو کر کھڑے رہے۔ اسی طرح منظور گچکی نے ڈاکٹر نور احمد کی کراچی یونیورسٹی میں پٹائی کی تھی لیکن اس زمانے میں مکا بازی چلتا تھا۔ کلاشنکوف، بندوق، پستول کی لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے کافی مرتبہ مذاکرات مصالحتی اجلاس ہوئے لیکن مخالفین ہماری اصولی مؤقف کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ دکھ اور افسوس کی بات یہ تھی کہ نیپ کی اعلیٰ قیادت خاص کر میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کراچی میں موجود ہونے کے باوجود کبھی بھی انہوں نے ان دو متحارب گروہوں کو منانے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کی البتہ نواب خیر بخش مری ہم سے اس وقت ملے جب وہ سب سے آخر میں مغربی پاکستان کے نئے گورنر ائیر مارشل نور خان سے ملنے کے لئے لاہور

جارہے تھے لیکن نواب صاحب نے بھی اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ نیپ بلوچستان کی یہ تمام معتبر بلوچ قیادت نے لاہور میں گورنر سے ملاقات کی اور دوسرے دن اخباروں میں یہ لیڈ لگ گئی کہ ''ہماری سرداریاں بحال کی جائیں۔''

ان حالات میں ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم بی ایس او کے جنرل باڈی کا اجلاس طلب کریں اور انتخابات کرا کے تنظیم کو نئے عہدیداروں کے حوالے کر دیں لیکن اس میں ہمارے لئے سب سے مشکل بات یہ تھی کہ سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے کوئی معقول امیدوار دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے قریب ترین ساتھیوں میں زیادہ تر ایسے تھے جو تعلیم سے فارغ ہونے والے تھے کچھ کی مالی مجبوریاں تھیں۔ اس کے علاوہ آگے بہت ہی کٹھن اور سخت مرحلہ آنے والا تھا۔ ہم نے بلوچستان کے بہت ہی نامور قائدین کے سیاسی عمل کو چیلنج کیا تھا جن کو عام لوگ پوجنے کی حد تک چاہتے تھے۔ ایک طرف وہ سیاسی طور پر اپنا رنگ جما چکے تھے دوسری طرف وہ بہت ہی طاقت ور قبائلی سردار تھے۔ پھر میر غوث بخش بزنجو جیسے قد آور سیاسی شخصیت اس کے ساتھ نیپ کے پرانے تجربہ کار سیاسی کیڈر جو ابھی تک ان کے سیاسی سحر سے نکلنے کے لئے تیار نہ تھے ان تمام قوتوں کو بیک وقت چیلنج کرنا ان کے مستقبل کے منصوبوں کو ملیا میٹ کرنا کوئی مذاق کی بات نہ تھی۔ اس سارے کام کے لئے ہمت و جرات کی ضرورت تھی اس لئے سارے ساتھیوں نے ایک مرتبہ پھر مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی کہ میں تیسری مرتبہ سیکریٹری جنرل کا عہدہ برقرار رکھوں۔ میں نے دو بنیادی وجوہات کی وجہ سے صاف انکار کر دیا ایک تو میری مالی حالات بہت خراب تھے جس کی وجہ سے مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔ جس کو حاصل کرنے کے بعد نہ صرف میں اپنا گزر بسر کرنے کے لائق ہوتا بلکہ اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کی بھی مدد کرتا جو اس وقت کراچی این جے وی اسکول میں زیر تعلیم تھا دوسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ اگر تیسری مرتبہ میں سیکریٹری جنرل کا عہدہ برقرار رکھتا تو مجھ پر مخالفین کی طرف سے یہ الزام لگتا کہ یہ سب کچھ میں نے محض عہدہ حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ اس لئے میرا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صدر اور سینئر نائب صدر اور دوسرے عہدوں کے لئے ہمارے پاس معقول امیدوار تھے لیکن سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے ایک ایسے امیدوار کی ضرورت تھی جو ان سارے مشکلات کے سامنے ڈٹ سکے۔

ہم نے لیاری لیبر ویلفیئر سینٹر کے عہدیداروں سے بات کر کے بی ایس او کے انتخابات کے لئے ان کی جگہ حاصل کر لی اور جنرل باڈی کے اجلاس کے لئے وقت اور تاریخ کا اعلان بھی کر دیا۔ لیکن اب بھی ہمیں سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے ایک امیدوار کی تلاش تھی۔ ایک دن حسبِ معمول شام کو میں، بشیر بلوچ اور (مرحوم) رشید عرف بھٹو بلوچ کارنر صدر میں سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے آپس میں بات کر رہے تھے کہ اچانک نذیر اور صابر علی بلوچ سوٹڈ بوٹڈ گھومتے ہوئے ہمارے پاس آئے۔ دونوں کے والد اس زمانے میں اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر تعینات تھے اس لئے ان کی مالی حیثیت باقی طلباء سے زیادہ مستحکم اور بہتر تھی۔ دونوں صدر میں دل پشاوری کرنے آئے ہوئے تھے۔ اسلام علیکم کر کے ایلفی رش کے اندر غائب ہو گئے۔ صابر کو دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ صابر کو سیکریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے راضی کیا جائے۔ جب میں نے اپنے خیال کا اظہار اپنے دونوں ساتھیوں سے کیا تو وہ دونوں رشید اور

بشیر قہقہہ لگا کر میرے اس احمقانہ خیال پر ہنسنے لگے۔اس وقت وہ دونوں اپنی جگہ پر درست تھے کیونکہ صابر علی بلوچ اس زمانے میں سیاست سے ایسے بھاگتے تھے جیسے گندا کوسے جن بھاگتا ہے۔جب ہم ایس ایم کالج کے ہاسٹل میں صابر کے کمرے میں جا کر سیاست کی بات کرتے تھے تو وہ اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے تھے۔اس کے باوجود میں نے کہا کہ کوشش کر کے دیکھتے ہیں کیونکہ اس وقت ہماری جان پر بنی ہوئی تھی چنانچہ میں بشیر بلوچ اور رشید بھٹو، صابر کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔راستے میں اپنے ساتھیوں کو قائل کرتا رہا کہ اگر صابر کو ہم راضی کر سکے تو فائدہ یہ ہوگا کہ اس کو ابھی مزید کچھ عرصہ تعلیم مکمل کرنے کے لئے کراچی میں رہنا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی کوئی مالی مشکلات نہیں، وہ کچھ عرصہ آرام سے بی ایس او میں فعال رہ سکتے ہیں۔ہم صابر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے کچھ دیر ان کے ساتھ چلتے رہے اور پھر صابر سے کہا کہ آج تمہارے لئے ہمیں ایک خاص کام ہے۔صابر نے برخستہ جواب دیا کہ اگر سیاست کی بات ہے تو مجھے معاف کریں۔ہم نے کہا کچھ اور کام ہے۔نذیر معذرت کرتے ہوئے چلا گیا ہم صابر کو گھیر کر ایمپیس ہوٹل لے آئے اور وہاں بڑی مشکل سے رات تقریباً دو بجے صابر کو بی ایس او کے سکیریٹری جنرل کے عہدہ کے لئے راضی کر لیا۔صابر نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کر لیا کہ ذمہ داری ساری ہم سنبھالیں گے وہ فقط عہدہ دار ہوگا۔اس اہم عہدہ کے لئے صابر کو راضی کرنے کے بعد ہم مطمئن ہو گئے اور جا کر آرام سے مزید تیاری میں لگ گئے۔

دوسرے دن شام چار بجے لیاری لیبر ویلفیئر سینٹر میں جنرل باڈی کے اجلاس کے لئے تمام کراچی سے بلوچ طلباء جمع ہونا شروع ہوئے۔اس دوران ہمارے کسی کارکن نے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ مخالفین کیمپ کے کچھ طلباء اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں ان میں سے ایک کا نام قیوم تھا۔میں نے ابراہیم عرف جنگو (جو کہ اچھا خاصا باڈی بلڈر تھا) ڈیوٹی لگائی کہ اگر کسی لڑکے نے ہلنے جھلنے کی کوشش کی تو اس کو خاموشی سے دبوچ کر باہر نکال دیں۔یہ وہی طریقہ تھا جو ہم نے میر غوث بخش بزنجو کے الیکشن جیتنے کے بعد جلوس میں این ایس ایف کے لڑکوں کے ساتھ کیا تھا۔اس نظام سے معاملہ قابو میں آ گیا۔ان لڑکوں کو کچھ کرنے کی جرات نہ ہو سکی۔ہم نے اپنے امیدواروں کا پینل پیش کیا تجویز اور تائید کنندوں نے سیدان مری کو برائے صدر، صابر علی بلوچ کو برائے سیکریٹری جنرل اور مان اللہ مینگل کو برائے سینئر نائب صدر پیش کیا اور اسٹیج سے اعلان کیا کہ اگر ان عہدوں کے لئے کسی کو اپنا نام پیش کرنا ہے تو بلا جھجک وہ پیش کر سکتے ہیں۔سب نے ان کی تائید کی باقی عہدیدار بھی اتفاق رائے سے چن لئے گئے اور اس طرح پہلی مرتبہ ''بی ایس او انٹی سردار'' گروپ وجود میں آ گئی جو آج تک مختلف شکلوں میں ان قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے جو بقول میر امان اللہ گچکی ''اپنے اپنے قبائل میں کٹر نواب سردار، کوئٹہ اور بلوچ نوجوانوں کے سامنے کٹر بلوچ قوم پرست، کراچی لاہور، اسلام آباد اور بیرون ملک کمیونسٹ، سوشلسٹ، ترقی پسند اور انقلابی بنتے ہیں۔'' یہ الگ بات ہے کہ کل کا انٹی سردار یا عوامی گروپ آج سردار گروپ کا حمایتی بن گیا ہے اور سابقہ سردار

گروپ کے حمایتی آج ڈاکٹر عبدالحئی اور ڈاکٹر مالک بلوچ کی قیادت میں انٹی سردار گروپ بن گئے ہیں۔ منظور گچکی تو آج کل سب سے ناراض پی پی پی میں ہوتے ہوئے بھی گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یار لوگوں کی سمجھ بات کافی دیر بعد آئی اور وہ بھی بعد از خرابی بسیار۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ کہتے ہیں ''دیر آید درست آید'' کچھ بھی ہو اسی بی ایس او کی شکل میں ایک قوت اب بھی موجود ہے بالکل اُس سنگِ لرزاں کی گنبد کی طرح جو جھول کر اپنی جگہ پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بی ایس او (انٹی سردار)

بی ایس او (انٹی سردار) تمام تر سازشوں، رکاوٹوں اور مخالفت کے باوجود وجود میں آ چکی تھی۔ کاش ایسا نہ ہوتا ہماری مخالفین ہمارے اصولی موقف کو تسلیم کرتے۔ لیکن کچھ چیزیں انسانی بس سے باہر ہوتی ہیں ان کا فیصلہ تاریخ کرتی ہے کیونکہ تاریخی اور مادی قوتوں کا ٹکراؤ ازل سے جاری وساری ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ کچھ بیماریاں اس وقت پاکستان کی بائیں بازوں کی سیاسی اور طلباء تنظیموں کو روس چین اختلافات کی وجہ سے لائق ہو چکی تھیں۔ لیکن بی ایس او واحد طلباء تنظیم تھی جو اس بیرونی وبا سے محفوظ تھی لیکن وہ اپنے اندر کے ناسور کو نہ روک سکی۔ لیکن یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا ایسے واقعات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس سانحہ کے بعد پہلی بار بلوچستان کی سیاست دو واضح دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک پرو سردار دوسرا انٹی سردار اور بعد میں یہ تقسیم بی ایس او سے نکل کر بلوچستان کی سیاسی تنظیموں میں بھی واضح طور پر نظر آنے لگی جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سرداروں نے اپنا لائحہ عمل تبدیل کیا وہ اب بھی کسی نہ کسی شکل میں بلوچستان پر حکمرانی کر رہے ہیں ان کے آپس میں گہری اور قریبی رشتہ داریاں ہیں۔ مارا گیا بیچارہ عام بلوچ کیونکہ جو لوگ سیاسی یا طلباء تنظیمیں سرداروں سے ہٹ کر عام بلوچ کی سیاست کرنا چاہتے ہیں یا چاہتے تھے ان کے بھی لیڈر شپ یا کسی نہ کسی وجہ جس میں ڈاکٹر نجیب اللہ (مرحوم) کا افغان فیکٹر (Factor) بھی شامل تھا شدید اختلافات کا شکار ہو کر اتنے دھڑوں میں تقسیم ہوئے کہ بلوچ عوام کی قیادت یا خدمت تو درکنار وہ خود آپس میں ہمیشہ دست وگریبان رہے۔

خیر میں ذکر اس وقت کا کرنا چاہتا ہوں جس وقت ہمارے طاقتور مخالفین ہم سب کو بی ایس او سے فارغ کرنا چاہتے تھے ان کو شاید اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ ایوب خان جانے والا ہے اور اس کی جگہ لینے والا شخص جو بھی ہوگا وہ نہ صرف ون یونٹ کو ختم کرے گا بلکہ الیکشن بھی کرائے گا اور اس الیکشن کے نتیجے میں وہ بے تاج بادشاہ بن کر بلوچستان پر بلاشرکت غیرے حکومت اور حکمرانی کریں گے اور اپنی قبائلی اور الیکشن کے مینڈیٹ کے زور پر کسی بھی آنے والی مرکزی حکومت کو اپنے مفادات کے تابع رکھنے میں کامیاب ہونگے۔ ان کا یہ اندازہ تجزیہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ بلوچستان اور سرحد میں نیپ کا طوطا بول رہا تھا۔ لیکن سب سے بڑی مشکل ان کو سندھ اور پنجاب میں یہ پیش آ رہی تھی کہ ان دو صوبوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کو نہ صرف ترقی پسند قوتوں، کسانوں، مزدوروں طلباء تنظیموں کی حمایت حاصل تھی بلکہ سندھ اور پنجاب کے نامور زمیندار، تاجر، صنعت کار اور سیاسی گھرانوں کی حمایت بھی حاصل ہو رہی تھی۔ سندھ سے تالپور مخدوم، چانڈیو، جتوئی خاندان اسی طرح پنجاب سے کھر، قریشی، ٹوانہ، مخدوم خاندان بھی پی پی پی کی حمایت میں نکل پڑے تھے۔ لیکن پنجاب میں پی پی پی کو سب سے زیادہ کامیابی وہاں کے اعلیٰ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ طلباء اور دانشور طبقے نے دلائی۔ جس

میں ڈاکٹر مبشر، معراج خالد، شیخ رشید، خورشید حسن میر، حسین نقی اور این ایس ایف کے طلباء نمایاں تھے۔ پی پی پی کے بانی قائد ذوالفقار علی بھٹو خود بھی اعلیٰ پائے کے بیرسٹر، وکیل دانشور اور دنیا کے اعلیٰ ترین تعلیمی درسگاہوں سے سند یافتہ ایک سرعت الحرکت (Dynamic) لیڈر تھے جو دن رات مصروف عمل رہتے تھے۔ انہوں نے پورے پاکستان کے لوگوں تک اپنی آواز موثر انداز میں پہنچائی جس میں بلوچستان کے عام لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کی پارٹی کے بنیادی دستاویزات و منشور میں ایسے متاثر کن نعرے درج تھے جن کو سندھ اور پنجاب کے جاگیردار و ڈیرے زمیندار اس لئے رد نہ کر سکے کہ وہاں کے لوگوں کی جم غفیر نے ان کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے وہ سمجھ گئے تھے کہ پی پی پی کے ٹکٹ کے بغیر ان دونوں صوبوں میں جیتنا مشکل ہے لیکن بلوچستان میں حالات مختلف تھے اس کی وجہ سخت قبائلی نظام، نیپ کا زور اور سیاسی اثر و رسوخ قوم پرستی کا نعرہ اور آبادی کے فقدان کی وجہ سے پی پی پی کا منشور اور عوامی نعرہ ان سیاسی عمائدین کے لئے قابل قبول نہ تھے اس کے علاوہ اس بات کی اہمیت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا رجحان یا اس کی سیاست کا جھکاؤ چین کی طرف تھا جبکہ بلوچستان کے قبائلی سیاسی قیادت نیپ کی حمایتی بلکہ عہدہ دار جو سویت یونین نواز پارٹی تھی۔ یہ نقطہ بھی ان کے درمیان سیاسی اختلاف کی ایک وجہ ہو سکتی تھی اس کے ساتھ شخصیتوں کے تصادم (Personality Clash) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ان حقائق کے باوجود ان کو یقین نہیں تھا کہ اس وقت کے مغربی پاکستان میں پی پی پی ایک بھاری مینڈیٹ کے ساتھ 1970ء کے الیکشن جیتنے میں کامیاب ہوگی۔ ان کی تجزیہ کے مطابق شیخ مجیب الرحمان کا عوامی لیگ ہی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر پورے متحدہ پاکستان کے سیاسی افق پر چھا جائے گی، لیکن ان کو شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو کہ پاکستان سیاسی، معاشی، معاشرتی میدان میں ترقی نہیں کر سکا لیکن اقتدار پر براجمان ہونے کے لئے مقتدرہ قوتوں کی آشیرباد یا ان کو راضی کئے بغیر ان کے مفادات کے تابع ہوئے بغیر حکمران بننا بہت مشکل ہے یعنی اس میدان میں پاکستان نے بہت ترقی کی ہے۔ شاید یہی طرز فکر اس ملک کے زوال کا سبب بن گیا اور ملک دولخت ہونے سے نہ بچ سکا۔

بلوچستان کے سیاسی محور میں گھومنے والے ان بااثر قبائلی سیاسی قیادت یا تو ان بنیادی سخت ترین حقائق سے بے خبر تھے یا ہو سکتا ہے ان کو اپنے قبائلی اور سیاسی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ کچھ بھی ہو لیکن بی ایس او (انٹی سردار) جو بعد میں بی ایس او (عوامی) بنا اس کے سرکردہ ساتھیوں اور کچھ سینئر سیاسی دوستوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان قبائلی سیاسی قیادت کے موقف کے خلاف لڑنا ہے لیکن لڑنے کیلئے سیاسی ہتھیار، اسٹرٹیجی، پلاننگ مکمل سیاسی فکر و عمل سے آراستہ اور سب سے بڑھ کر بڑی سیاسی مدد و تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت کے معروضی حالات میں اس موقف کے خلاف لڑنا کسی حد تک کراچی، لاہور، راولپنڈی اور مکران میں آسان تھا لیکن کوئٹہ، جھالاوان، ڈیرہ بگٹی، کھان، سبی، کوہلو، جھل مگسی اور دیگر قبائلی علاقوں میں بہت مشکل تھا اس لئے ہمارے کچھ سینئر ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ مغربی پاکستان کی بڑی پارٹی پی پی پی (واضح ہو کہ اس وقت تک پی پی پی اقتدار میں نہیں تھی) کے قائد جناب ذوالفقار علی بھٹو سے رابطہ کیا جائے اگر وہ ہمارے مطالبات

اور شرائط پر راضی ہو جائے تو ہم اس کے ساتھ ملکر بلوچستان میں سیاسی تبدیلی کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اس منصوبہ اور فیصلہ کے پیش نظر ہمارے اس وقت کے دو سینئر ساتھی میر امان اللہ گچکی اور مرحوم طاہر محمد خان لاڑکانہ میں بھٹو صاحب سے ملنے کے بعد کراچی تشریف لائے تھے اور مجھے بلا کر اپنی اس خواہش یا فیصلے کا اظہار کیا۔ میں نے کہا یہ ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے اس کا فیصلہ بی ایس او کی طرف سے میں اکیلا نہیں کر سکتا۔ مجھے آپ کی یہ تجویز ساتھیوں کے سامنے رکھنی ہوگی ان کے اجتماعی فیصلے کے بعد ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں چنانچہ میں ان سینئر ساتھیوں کو رخصت کر کے بی ایس او کے ساتھیوں کی تلاش میں کراچی صدر ''بلوچ کارنر'' پہنچ گیا۔ یہ ہماری طے شدہ میٹنگ پوائنٹ تھی تقریباً روزانہ نہیں تو ہر دوسرے دن اس جگہ پر لازم یکجا ہوتے تھے۔ یہاں پر میری ملاقات بشیر بلوچ اور محمد یار سے ہوئی ادھر ادھر ہانکنے کے بعد جب میں نے ان دو سینئر ساتھیوں کی تجویز ان کے سامنے رکھی تو بشیر بلوچ اور محمد یار دونوں آگ بگولہ ہو کر مجھ پر برس پڑے۔ اس میں ان کا قصور نہ تھا بلکہ اصل بات یہ تھی کہ سیاسی طور پر ہماری تربیت ہی سخت گیر انداز میں ہوئی تھی۔ مفاہمت مصالحت یا سیاسی Compromise کا تصور ہی ہمارے نزدیک محال تھا ہمیں تو کافی عرصہ تک یہ یقین کی حد تک سکھایا گیا تھا کہ بلوچستان کی آزادی کے علاوہ باقی دیگر ہر سیاسی عمل گناہ کبیرہ ہے، مفاہمت کی سیاست کا تصور ہی ناپید تھا۔ اس لئے میرے دونوں ساتھی مجھ پر بگڑ گئے۔ میں نے کہا بھائی یہ میرا فیصلہ نہیں ہے یہ ہمارے چند سینئر ساتھیوں کی ایک تجویز ہے کہ کیا ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ بہتر ہوگا ہم آپس میں الجھنے کے بجائے آپ دونوں خود چل کر ان سے ملیں اور اس معاملہ پر سیاسی انداز سے بحث کریں۔ لیکن وہ دونوں بضد تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں تا کہ میرے سامنے یہ معاملہ زیر بحث آ سکے۔ ہم تینوں یونائیٹڈ ہوٹل پہنچے جہاں امان اللہ گچکی اور طاہر محمد خان ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلام دعا اور کافی بحث و مباحثہ کے بعد ہم اس بات پر متفق ہوئے کہ ہم آپ دونوں کی پی پی پی میں شمولیت کی مخالفت نہیں کریں گے لیکن بی ایس او کے نوجوان اپنے حالات کے مطابق اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہونگے اور نہ بی ایس او پی پی پی کی ذیلی تنظیم کی حیثیت سے کام کریگی، کیونکہ اسی موقف کے پیش نظر ہم نے بہت ہی با اثر بلوچستان کے قبائلی، سیاسی لوگوں کی مخالفت مول لی ہے۔ بی ایس او نہ پہلے کسی سیاسی پارٹی کی ذیلی تنظیم کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے تیار تھی اور نہ اب تیار ہوگی۔ حکومت میں آنے کے بعد پی پی پی بلوچستان میں قبائلی نظام کے خاتمہ کے لئے قانون سازی کریگی، سرداری ٹیکس ''ششک'' کا خاتمہ کیا جائے گا اور عوامی سیاست کی فروغ میں ہماری مدد و تعاون پر آمادہ ہوگی۔ ان بنیادی نقاط پر اتفاق کرنے کے بعد طاہر محمد خان اور امان اللہ گچکی نے پاکستان پیپلز پارٹی میں بقاعدہ شمولیت اختیار کی اور یہیں سے بلوچستان میں پی پی پی کی سیاسی اثر و رسوخ کا آغاز ہوتا ہے۔

بی ایس او (انٹی سردار جو بعد میں عوامی بنا) کے الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد اور ''بی اے'' کرنے کے بعد مجھے ملازمت کی اشد ضرورت تھی۔ کیونکہ میں کراچی یونیورسٹی میں ''ایم اے'' کرنے کا پلان بنا چکا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کو بھی اس کی پڑھائی میں مدد دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ کامریڈ یوسف نسکندی اور امیر علی بخش احمد تالپور کی مدد و تعاون سے مجھے سویت یونین کے سفارت خانہ

کے شعبہ نشر واشاعت میں ملازمت مل گئی۔ جہاں سے ''طلوع'' نامی ایک میگزین اور مختلف علاقائی زبانوں جس میں بلوچی سندھی، براھوی ،اردو وغیرہ میں بلٹن شائع ہوتے تھے جن کو ترقی پسند دیگر مطبوعات کے ساتھ ہم پورے پاکستان میں بذریعہ پوسٹ مختلف لوگوں کو روانہ کرتے تھے۔اس شعبے کا سربراہ میر قادر بخش نظامانی (مرحوم) تھے جس نے میرے علاوہ نامور دانشور سیاسی استاد عبداللہ جان جمالدینی اور بلوچی زبان کے نامور شاعر مراد ساحر اور اکبر بارکزئی کے چھوٹے بھائی قیوم بارکزئی، رمضان بلوچ، یوسف بلوچ، ظہور بلوچ، امام بخش بلوچ کے علاوہ بہت سارے ڈرائیور اور چھوٹے موٹے کام کرنے والے بلوچوں کو بھی ملازمت دلوائی تھی۔اردو بولنے والوں میں سے آغا مسعود نمایاں تھے جو بعد میں سندھ کے نگراں حکومت میں اطلاعات کے صوبائی وزیر رہے۔ہم ملازمت کے ساتھ ساتھ فارغ اوقات میں اپنے بی ایس او کے ساتھیوں کے ساتھ پس منظر میں (Back Ground) رہ کر طلباء سیاست میں مصروف عمل رہے اور ہمارا سیاسی سفر جاری و ساری رہا۔بی ایس او گو کہ ایک طلباء تنظیم تھی وقت، حالات تجربات اور مسلسل سیاسی جدوجہد کے حوالے سے وہ ایک نیم سیاسی تنظیم بن چکی تھی۔اس میں اجتماعی قیادت کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔اس کی قیادت جو سیاسی لائحہ عمل تربیت دیتے اس میں اجتماعی سوچ کی گہری چھاپ ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ ان مثبت پروگرام کو پورے بلوچ معاشرے کے طلباء اور پڑھے لکھے باشعور طبقے کی حمایت حاصل تھی۔وہ کوئی عقل و شعور سے ماروا یا موجزاتی پروگرام نہیں ہوتے تھے جن کو آنکھیں بند کر کے وہ عمل کرتے تھے بلکہ ان میں انتہائی سنجیدگی، پختگی اور اخلاص کا عنصر مسلسل جہد و عمل کا عمل دخل ہوتا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بی ایس او (عوامی یا انٹی سردار) محض سرداروں یا قبائلی شخصیتوں کے ذات یا ان کے قبائل کے خلاف ہرگز نہیں تھی بلکہ وہ اس موقف کے خلاف تھی جو بغیر کسی سیاسی تنظیم کے محض اپنی قبائلی حیثیت کی بنیاد پر بلوچستان کی سیاست کو اپنی انا پرستی کے بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ان کی سیاست میں عوامی رائے یا اجتماعی قیادت کا ہمیشہ فقدان رہا تھا کیونکہ اگر صرف مخالفت برائے مخالفت کی بات ہوتی تو نواب نوروز ہرگز بی ایس او عوامی کا ہیرو (Hero) نہ بنتے۔حالانکہ نواب نوروز خان چاہتے تو وہ بھی دوسرے نوابوں سرداروں کی طرح حکومت وقت سے بقدر جثہ مراعات حاصل کر کے زندہ رہ سکتے تھے۔اپنے قبیلے سے بجار اور نزرانہ وصول کر کے باقی ماندہ زندگی آرام سے گزار سکتے تھے۔لیکن جو انہوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر خان قلات کے غیر دانشمندانہ بے وقت فیصلے کی وجہ سے کیا وہ ان کے لاشعور کا ایک ایسا شعوری فیصلہ تھا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔قبائلی نظام میں خان قلات کو پورے بلوچستان کی یکجہتی، خودمختاری، آزادی اور عزت و وقار کا نشان (Symbol) سمجھا جاتا تھا۔اس کی تذلیل بے حرمتی بے عزتی تمام قبائل کی تذلیل اور بے حرمتی سمجھی جاتی تھی اور اس اجتماعی تذلیل کے تصور نے نواب نوروز کو الم بغاوت بلند کرنے پر مجبور کیا جو اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔اب اگر چند انا پرست تنقید پسند لوگ ان کی اس بے مثال قربانی کو محض خان آف قلات کی خاطر جان دینے کی توجیل قرار دیکر مخالفت کریں تو میرے خیال سے یہ ایک تاریخی زیادتی ہوگی یہ لوگ اپنی سرزمین، اپنی ثقافت، رسم و

رواج تاریخ اور سماجی اقدار سے مخلص تھے جس کی تازہ ترین مثال شہید نواب اکبر بگٹی کی شہادت ہے۔

بی ایس او (عوامی) نے محض ان سیاسی سرداروں کی مخالفت کی ہے جن کے قول وفعل میں تضاد تھا۔انہوں نے نوجوانوں میں آزادی کا جو تصور دیا تھا جو شمع روشن کی تھی۔ان توقعات وامیدوں کو جو وسعت دی تھی ان پر اس وقت وہ پورا نہ اتر سکے ان کی کیا مجبوریاں تھیں ان سے عام طلباء یا نوجوانوں کو سروکار نہیں تھا۔کیونکہ انہوں نے وقت سے پہلے جذبہ جہاد کی چنگاریوں کو دھکتا ہوا شعلہ بنا دیا تھا ان شعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے دیوتاؤں کی طرح دمکتے چمکتے پاک وشفاف نظر آتے تھے۔ان کے پیروکار اور ماننے والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے دیوتاؤں کی مجبوریاں بھی ہوسکتی ہیں یا کوئی غلطی کر سکتے ہیں۔ہوسکتا ہے یہ ان کی ماننے والوں کی غلطی یا خوش فہمی تھی جنہوں نے اس قدر توقعات وابستہ رکھے تھے لیکن ان توقعات کو بڑھاوا دینے والے بھی وہی محترم قیادت تھی۔بلوچستان میں سردار تو بہت تھے لیکن یہ مخصوص نامور سردار یا سیاسی لوگ تھے جن سے امید ثمر وابستہ تھی اس لئے جو سخت ترین ردعمل آیا وہ انہی کے خلاف آیا تھا کسی شخصیت یا مخصوص اشخاص سے لاتعلقی یا ان سے برگشتہ ہونا آسان ہوتا ہے۔اسکے لئے کسی قربانی جدوجہد تپسیا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن محبت پیار اور چاہت کے لئے بہت جتن کرنے پڑتے ہیں۔بڑے صبر آزما کھٹن دور سے گزرنا پڑتا ہے۔بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے تب جا کر چاہنے والا، پوجنے والا تپسیا کرنے والا کسی معراج پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنے معصوم ذہین میں اپنے نجات دھندہ کی ایک ایسی تصویر بناتا ہے جو اس کے تمام امیدوں توقعات کا محور بن جاتا ہے اور جب اس کے تصورات، توقعات اور امیدوں کا یہ محور اس کے اپنے متعین کردہ سمت سے یکدم ہٹ کر یوٹرن لے لیتا ہے تو یقیناً ان کے پوجاریوں کو صدمہ پہنچتا ہے اور اتنے بڑے صدمے کے بعد ان پوجاریوں کا کچھ بھی ردعمل ہوسکتا ہے۔مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے غالباً 1969ء کی بات ہے جنرل یحییٰ خان کا مارشل لاء تھا اور 1970ء تک الیکشن کی باتیں زوروں پر تھیں ہمیں معلوم ہوا کہ نواب خیر بخش مری کراچی تشریف لا چکے ہیں اور عبداللہ جان کانسی کے یہاں قیام پذیر ہیں۔شیر محمد مری عرف جنرل شیروف بھی پہاڑوں سے اتر آئے تھے اور کراچی پہنچ کر اسی مکان میں نواب صاحب کے ساتھ ٹھرے ہوئے ہیں۔واضح ہو کہ عبداللہ کانسی کا مکان نیپ کی اعلیٰ قیادت جس میں خان عبدالغفار خان سے لیکر نواب خیر بخش مری اور دوسرے زعما کے لئے ہمیشہ مہمانداری کے لئے کھلا رہتا تھا۔ہم چند ساتھی ''طلوع'' کے دفتر سے چھٹی کے بعد نواب صاحب اور شیر محمد مری سے ملنے کے لئے ناظم آباد روانہ ہوئے ہمارے ساتھ آغا مسعود بھی تھے جو ''طلوع'' میں کام کرتے تھے۔وہاں پہنچنے کے بعد سیاسی حال احوال کا سلسلہ شروع ہوا۔ہم خاموش رہے لیکن آغا مسعود نے جو اپنے آپ کو ایک کامریڈ کہتے تھے نواب صاحب سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔موضوع یہ تھا کہ آیا آنے والے الیکشن میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کو حصہ لینا چاہیے یا نہیں؟ آیا الیکشن ہمارے مسائل کا حل ہے یا نہیں؟ حسب معمول کافی دیر خاموش رہنے کے بعد محترم نواب خیر بخش مری نے آغا مسعود کے سوالوں کا بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا۔انہوں نے کہا ''استحصالی ٹولے کیلئے کسی بھی میدان کو خالی چھوڑنا شکست کے مترادف ہے۔ہمیں ہر محاذ پر ان سے لڑنا چاہئے

وہ محاذ جنگ ہو یا الیکشن کا میدان جس طرح استحصالی ٹولہ اپنا اسٹریجی (Strategy) تبدیل کرتا ہے ہمیں بھی اس کے مطابق منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔'' اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے نواب صاحب خود اٹھے سامنے الماری سے ایک کتاب بالکل اس طرح نکال کر لائے جس طرح کوئی عالم دین یا مبلغ اپنی بات کو منوانے یا درست ثابت کرنے کیلئے کوئی حدیث یا مذہبی کتاب نکال کر حوالہ دیتے ہیں۔ کتاب کھولتے ہوئے نواب صاحب نے کہا'' یہ دیکھیں، یہ میرا نہیں دنیا کے سب سے بڑے عملی انقلابی لینن کا قول ہے(One step forward two step back) اگر جنرل ایوب خان کی فوجی آپریشن کا ہم کامیاب مزاحمت کر سکتے ہیں تو جنرل یحییٰ خان کے ہونے والے الیکشن کا میدان خالی چھوڑ کر ہم کیسے کامیاب مذاکرات کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں استحصالی ٹولے کے ہر پسند کئے ہوئے محاذ پر مزاحمتی جنگ جاری رکھی چاہیے جس جذبے کے ساتھ ہم نے میدان جنگ میں لڑائی کی تھی۔ دشمن کو Walk over کا موقع نہیں دینا چاہیے یہی ہماری تھیوری ہے اور یہی بائیں بازو کی سیاست کا محور ہونا چاہیے۔'' بحث کو سمیٹتے ہوئے نواب صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا'' لیکن اس تمام عقلی و منطقی دلائل کے باوجود میرا یہ نوجوان ساتھی مجھ سے اتفاق نہیں کرتا۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، میرے مہاجر ساتھی آغا مسعود نے واہ واہ کرتے ہوئے تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیئے اور نواب صاحب کے اس تھیوری سے مکمل اتفاق کیا۔ لیکن میں نے بہتر یہی سمجھا کہ نواب صاحب کے احترام میں خاموشی اختیار کروں لیکن نواب صاحب کی متجسس نگاہوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میری زبان سے بھی کچھ نہ کچھ سننے کا منتظر تھا اس لئے مجبوراً میں نے مختصراً اتنا کہا کہ نواب صاحب یہ بھی کر کے دیکھ لیجئے۔ میرے کہنے کا مقصد یا اشارہ محض یہ تھا کہ آپ لوگوں نے وقت سے پہلے عوام خاص کر پڑھے لکھے نوجوانوں کو وہ سنہرا خواب دکھایا تھا جس کی اصل تعبیر کے بغیر وہ کسی اور چیز پر مطمعین نہیں ہونگے اور نواب صاحب یہ آپ ہی کا قول رہا ہے کہ الیکشن ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے یہی موقف آپ نے میر غوث بخش بزنجو کے لیاری کے ضمنی الیکشن کے سلسلے میں اپنایا تھا اور اسی موقف کی وجہ سے آپ بی ایس او کے پسندیدہ ترین شخصیت قرار پائے تھے لیکن آج اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پارلیمانی سیاست میں حصہ لینا چاہیے اور اس کے ذریعہ آپ بلوچستان کے بنیادی مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں چند منتخب نمائندوں کو چند وزارتیں کچھ مراعات ضرور مل جائیں گے لیکن بلوچستان کا جو بنیادی مسئلہ ہے جس کی نشاندہی آپ حضرات عرصہ دراز سے کرتے چلے آرہے ہیں وہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اس کے بعد نواب صاحب نے فرمایا'' دیکھا میں نے پہلے کہہ دیا تھا کہ میرا یہ نوجوان ساتھی مجھ سے اتفاق نہیں کرے گا'' کاش اس وقت بھی نواب صاحب اپنے اسی پہلے والے موقف پر قائم رہتے کیونکہ بعد میں بالکل وہی ہوا جس کا خدشہ مجھ جیسے ناقص العقل کارکن نے ظاہر کیا تھا(نواب خیر بخش مری نے ایک انگریزی روزنامہ کے نمائندہ کو 2008ء میں انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) میں شمولیت تھی آخر کار بعد میں جنرل یحییٰ خان نے وہی کیا جس کا اندازہ نیپ (NAP) کے قائدین پہلے سے لگا چکے تھے صوبے بن گئے 1970ء کے الیکشن ہوئے لیکن ان کے توقع کے برعکس مغربی پاکستان کے دو بڑے آبادی والے صوبوں میں پی پی پی بڑی اکثریت سے

سیٹیں لیکر میدان میں آ گئی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں سوئپ کیا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا مقتدرہ قوتیں اقتدار منتقل کرنے میں رضامند نہ ہوئے فوجی آپریشن پھر ہندوستان کی مداخلت اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ اسی دوران کہتے ہیں کہ نواب بگٹی نے جو مذاکرات شیخ مجیب الرحمٰن سے ڈھاکہ جا کر کئے تھے ان کو بلوچستان نیپ کی اس وقت کے ترجمان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ نواب بگٹی کا نیپ سے کوئی تعلق نہیں اور ان مذاکرات کو نواب صاحب کا ذاتی عمل قرار دیا تھا نواب بگٹی نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ میں نیپ کا نہیں بلوچوں کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔ دوست دشمن بن گئے اور دشمن دوست، مولانا بھاشانی بھی مغربی پاکستان والوں کو خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ کے لئے مشرقی پاکستان چلے گئے جواب بنگلہ دیش بن چکا تھا۔

مغربی پاکستان جواب صرف پاکستان رہ گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی قائد ذوالفقار علی بھٹو کے رحم و کرم پر تھا۔ شکست کے بعد مقتدرہ قوتیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شرائط منوا سکیں۔ جس طرح میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک سرعت الحرکت (Dynamic) لیڈر تھے انہوں نے بہت تیزی سے اپنے کارڈ کھیل کر 21 اپریل 1972ء کو ایک عبوری آئین اتفاق رائے سے منظور کرایا اور اسی عبوری آئین کے تحت تمام منتخب اراکین اسمبلی نے حلف اٹھایا جس میں بلوچستان اور صوبہ سرحد سے نیپ (NAP) کی قیادت بھی شامل تھی۔ میر غوث بخش بزنجو نے بحیثیت گورنر بلوچستان، عطا اللہ مینگل نے بحیثیت وزیر اعلیٰ بلوچستان، ارباب سکندر خلیل نے بحیثیت گورنر صوبہ سرحد اور مولانا مفتی محمود نے بحیثیت وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد حلف اٹھایا۔ اس کے بعد جب قانون ساز یا آئین ساز اسمبلی نے 14 اگست 1973ء کا متفقہ آئین منظور کیا تو اس میں بھی صوبہ سرحد سے جناب عبدالولی خان نے نیپ کی طرف سے مولانا مفتی محمود نے جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے اور بلوچستان سے میر غوث بخش بزنجو نے نیپ کی طرف سے اور مولانا عبدالحق نے جمعیت کی طرف سے بحیثیت پارلیمانی لیڈر دستخط کئے۔ جن اراکین نے اس رجسٹرڈ پر دستخط نہیں کئے ان میں نمایاں نواب خیر بخش مری، بیگم جفیر موسیٰ، ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ اور پی پی پی کے میر علی احمد تالپور بھی شامل تھے یعنی انہوں نے (Abstain) کیا، نہ ہاں نہ ناں میں شامل رہے۔ یعنی نہ مخالفت کی نہ حمایت، اس لئے 1973ء کے آئین کو متفقہ آئین کہتے ہیں کیونکہ اس کی مخالفت نہیں کی گئی تھی۔

یہاں دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ 15 فروری 1973ء کو بلوچستان میں نیپ کی حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ جس کے برطرفی کے اسباب و وجوہات جہاں اندرونی اور بیرونی بلکہ داخلی اور خارجی ہو سکتے ہیں۔ وہاں ان رہنماؤں کے (دونوں طرف) قبائلی اور جاگیر دارانہ انا پرستی، ضد اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کا رویہ بھی شامل تھا۔ جس کا نقصان نیپ اور پی پی پی کو یکساں طور پر اٹھانا پڑے۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ نیپ کی اعلیٰ قیادت ولی خان اور میر غوث بخش بزنجو نے ان زیادتیوں کے باوجود جمہوری عمل کو جاری رکھنے کے لئے اپنا آئینی کردار ادا کرتے ہوئے 1973ء کے آئین پر دستخط کئے۔ لیکن دوریاں بڑھتی گئیں۔ قبائلی اور جاگیر دارانہ ذہنیت نے ایک مرتبہ پھر بلوچستان کو آگ اور خون میں نہلا دیا۔ وزیر اعلیٰ کے لشکر نے لسبیلہ فتح کیا اور پاکستان کے مسلح دستوں نے

بلوچستان کو فتح کیا۔ اسٹبلشمنٹ نے باقی ماندہ پاکستان میں ایک مرتبہ پھر اپنے گیم پلان کو کامیاب کرایا پھر تباہی مچی پھر قبائلی لوگ پہاڑوں پر چھڑے پارلیمانی سیاست کی دھجیاں بکھر گئیں نیپ پر پابندی عائد کردی گئی۔ حیدرآباد سازش کیس تیار ہوا وہ جو نیپ کے پیارے پیادے تھے ان کا ایک پاؤں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں ہوتا تھا تو دوسرا پاؤں وزیراعظم سیکریٹریٹ میں۔ بابائے بلوچستان میر غوث بخش بزنجو بابائے مذاکرات ہوئے بات بنتی نظر آرہی تھی۔ گوارچ یا گواچ جو زمین سے ہم رنگ دام ہوتا ہے شکاری اس کو اس کمال فن سے بچھاتے ہیں کہ شکار کو وہ بالکل زمین جیسا نظر آتا ہے اور شکاری اُس گوارچ کے پیچھے چھپ کر اپنے شکار کو نشانہ بناتا ہے۔ شاطر اسٹبلشمنٹ نے اس قسم کا ایک جال بچھا دیا تھا جس میں نہ صرف نیپ اور اس کی قیادت آکر پھنس گئی بلکہ آخر کار بڑا شکار ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اُس گوارچ کے پیچھے چھپے ہوئے شکاری نظر نہیں آئے۔ تیسرا مارشل لاء ایک بہت ہی منافق قسم کے جنرل ضیاء الحق کی سربرائی میں لگ گیا۔ سب کچھ ختم ہوگیا پارلیمانی غیر پارلیمانی سیاست کی جگہ کوڑوں، اذیت ناک سزاؤں، کال کوٹھریوں اور پھانسی گھاٹوں نے لے لی۔ البتہ نیپ اور اس کی قیادت کو ریلیف ملا۔ حیدرآباد سازش کیس ختم ہوگیا۔ بلوچستان میں فوجی آپریشن بھی بند ہوگیا اور نیپ کی تمام سیاسی قیادت کو غیر مشروط طور پر رہا کردیا گیا۔ لیکن اس دوران پل کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ رہائی کے بعد نہ صرف نیپ کی مرکزی قیادت خان عبدالولی خان اور بلوچستان کی صوبائی قیادت کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آگئے تھے بلکہ خود بلوچستان کی صوبائی قیادت کے درمیان بھی اختلافات نے سر اٹھالیا تھا۔ پھر ایک وقت آیا میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل اور نواب خیر بخش مری کی راہیں بھی جدا ہوگئیں۔ بزنجو صاحب نے مکمل پاکستانی سیاست شروع کی۔ نواب خیر بخش مری اور سردار عطاء اللہ مینگل خودساختہ جلاوطنی میں چلے گئے اس دوران بلوچستان میں مکمل خاموشی چھائی رہی نہ کوئی مزاحمت نہ جنگ وجدل بلکہ بزنجو کے ساتھ ساتھ ان دونوں بااثر شخصیتوں کے اولاد بھی پارلیمانی سیاست میں جت گئے۔ جو لوگ کل تک ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے جدوجہد کررہے تھے اب وہ متوازی سمتوں کی طرف رواں دواں تھے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے۔ لیکن آخر کار نواب خیر بخش مری اب پھر اپنے وہی اصلی اور پرانی والی موقف پر آکر ڈٹ گئے ہیں آزادی صرف آزادی۔ سردار عطاء اللہ مینگل کی پارٹی ''بی این پی'' حق خودارادیت کا نعرہ لگاتے ہوئے پارلیمانی سیاست میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں اور میر غوث بخش بزنجو کے پسماندگان باقیات اور ان کے سابقہ مخالفین ''نیشنل پارٹی'' کے جھنڈے تلے یکجا ہوکر قومی جمہوری حقوق کا سلوگن دے رہے ہیں۔ سب کے سب بلوچ قوم اور بلوچستان کے روشن مستقبل آزادی خودمختاری اور قومی جمہوری حقوق کے دعویدار ہیں لیکن عام بلوچ حیران وپریشان ہے کہ کون راہِ راست پر ہے اور کون ان کو ایک مرتبہ پھر بھٹکا رہا ہے؟ واللہ عالم بالثواب۔

ایک دلچسپ خبر کو انٹرنیٹ اور موبائل فون پر آج کل پھیلائی جارہی ہے، جس میں میر غوث بخش بزنجو کا یہ قول درج ہے ''بلوچ معاشرے میں میرے اختلافی سیاست اور اختلاف رائے کو اس لئے برداشت کیا جارہا ہے کہ میرا تعلق سردار گھرانے سے ہے۔ یاد رکھو

میرے بعد اختلاف رائے رکھنے والوں کی اس قبائلی وروایتی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں ہوگی اور نہ ہی ہم سیاسی ورکر کی اختلافی سیاسی دخل اندازی کو برداشت کیا جائے گا حالانکہ اختلاف رائے رکھنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔'' یہی باتیں ہم نے 60 کی دہائی میں کہی تھیں لیکن اُس وقت میر صاحب نے ہماری تائید کرنے کے بجائے ہم سے اختلاف کیا تھا اور ہم ورکروں کے اس انسانی بنیادی پیدائشی حق کو ماننے سے انکار کیا تھا جس کی وجہ سے بی ایس او جیسی فعال، منظّم تنظیم تقسیم ہوگئی تھی۔ کاش کہ میر غوث بخش بزنجو جیسا قد آور پختہ سیاسی رہنما اس حقیقت کا ادراک اُس وقت کرتے تو آج حالات مختلف ہو سکتے تھے۔

1969ء کے آواخر میں ہم ملک سے باہر تھے۔ بی ایس او (انٹی سردار) سینئر ساتھیوں کی رہنمائی اور کنٹرول سے آزاد ہوگئی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اختلافات کا شکار ہو کر تقسیم کے عمل سے گزرتی گئی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کچھ ساتھیوں نے تنظیم کو 1970ء کے الیکشن کے بعد پی پی پی کا ذیلی تنظیم بنانے کی کوشش کی۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس سے پہلے ہماری موجودگی میں بھی ہوا تھا لیکن ہم نے اس کو بعد میں سنبھال لیا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہم نے کراچی صدر کے ریگل چوک پر انٹی سردار ڈے منانے کا پروگرام بنایا جس کے لئے ہم سب دوستوں نے بھرپور تیاری کی شام 4 بجے ریگل چوک پر جمع ہوئے اور کچھ ہی دیر کے بعد اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ پروگرام کے مطابق یہاں مظاہرہ اور تقاریر کے بعد ہم جلوس کی شکل میں آئی آئی چندریگر روڈ جانا چاہتے تھے جہاں تمام بڑے بڑے اخبارات کے دفاتر ہیں تاکہ ہمارے اس پروگرام کو صحیح تشہیر مل سکے۔ نمایاں مقررین میں راقم بی ایس او کا سیکریٹری جنرل صابر بلوچ، اسلم گوہر، فیض بلوچ، شمشاد بلوچ شامل تھے۔ ملیر اور لیاری کے بھی بہت سارے ساتھی اس مظاہرے میں شامل تھے اس لئے ایک لمبے چوڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جب ہم آئی آئی چندریگر روڈ پہنچے تو سب سے پہلے ہماری ملاقات ابراہیم جلیس مرحوم سے ہوئی جو اُس زمانے میں جنگ کراچی'' وغیرہ وغیرہ'' میں کالم لکھتے تھے اور بعد میں اخبار ''مساوات'' کے ایڈیٹر بنے۔ ابراہیم جلیس نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے کالم میں اس مظاہرے کا ذکر ضرور کریں گے۔ اس دوران میں اور محبوب جمالدینی ایک قریبی ہوٹل میں بیٹھ کر پریس ریلیز لکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ہم نے دیکھا ہنگامہ شروع ہوگیا اور پولیس بھی پہنچ گئی تھی جو ہمارے جلوس کے لڑکوں کو مار بھگانے میں مصروف تھی۔ میں اور محبوب کسی طرح اخبار ''حریت'' کے دفتر پہنچے جہاں زیادہ ہنگامہ تھا تو دفتر کے فرنیچر، کرسیاں کچھ آلات ٹوٹے بکھرے پڑے تھے اور اس کا ایڈیٹر فخر ماتری چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ آخر یہ تھوڑ پھوڑ صابر بلوچ اور اس کے ساتھیوں نے کیوں کی، ہم تو آپ کی خبر لگوا رہے ہیں۔ پھر یہ ہنگامہ کس لئے۔؟ ہم نے صابر کو ڈھونڈا وہ غائب تھے۔ دوسرے دن ''حریت'' اخبار نے صابر بلوچ کے بڑے بڑے کارٹون چھاپے جس میں صابر کو تھوڑ پھوڑ کرتے ہوئے دکھایا تھا اور اس کے بعد صابر بلوچ گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ ہم حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔؟ صابر اور اسلم گوہر نے یہ کیوں کیا ہے۔؟ خیر ہم نے صابر کی رہائی کے لئے وال چاکنگ اور لیاری میں ہنگامہ آرائی کی اور صابر جیل سے رہا ہو گئے۔ اس کے بعد بی ایس او کی ہنگامی

اجلاس بلائی گئی اوراس اجلاس میں جوحشر صابر بلوچ کا ایوب اور دوسرے ساتھیوں نے کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ بڑی مشکل سے ہم نے صابر کی گلوخلاصی کی اوراس کو وارن کیا گیا کہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہے۔

جب میں نے اور محبوب جمالدینی نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ صابر علی بلوچ بی ایس او کا سیکریٹری جنرل اوراسلم گوہر دونوں شام کو چھپ چھپ کر 70 کلفٹن میں بھٹو صاحب سے ملنے جاتے تھے۔ صابر بلوچ کے بقول (جو کافی عرصہ بعد انہوں نے ہمیں بتایا) کہ ایک دن وہ اوراسلم گوہر حسب معمول 70 کلفٹن گئے تو بھٹو صاحب لان میں بیٹھے تھے۔ ہمیں اپنے پاس بلایا اور کہا کہ ''حریت'' اخبار کے ایڈیٹر فخر ماتری نے ان کے خلاف ایک سخت اداریہ تحریر کیا ہے اس لئے (Somebody should go and teach him a lesson)۔ صابر کے مطابق بھٹو صاحب نے پہلے این ایس ایف کے معراج محمد خان اوران کے ساتھیوں کو کہا تھا لیکن وہ نہ کر سکے صابر اوراسلم نے کر کے دکھا دیا۔

ان تجربات کی روشنی میں ہماری گزارش ہے کہ بلوچستان کی سیاسی پارٹیاں بی ایس او کو اپنی ذیلی تنظیم یا پاکٹ آرگنائزیشن بنانے کا رویہ ترک کریں تو ہوسکتا ہے کہ ان میں دھڑے بندیوں کا سلسلہ کسی حد تک ختم ہو جائے اور نوجوانوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ اپنے معاملات خود اپنے تک محدود رکھیں البتہ جس پارٹی کا اسٹینڈ ان کے معیار کے مطابق ہوگا اس کو وہ ضرور سپورٹ کریں لیکن اپنی آزاد حیثیت میں رہیں کیونکہ سیاسی پارٹیوں کے دم چلہ بننے سے ان کی ساری مفادات کے سیاسی اختلافات خواہ مخواہ طلباء تنظیم میں منتقل ہو جاتی ہیں جو ایک غیر صحت مند علامت ہے۔ آج کل بی ایس او تین واضح دھڑوں میں منقسم ہے۔ بی ایس او (آزاد) بی ایس او (بی این پی مینگل) بی ایس او پجار (نیشنل پارٹی)۔ اپنی اپنی سوچ لائحہ عمل یا فکر وفلسفہ کے مطابق سرگرم عمل ہیں لیکن ان کی ساری توانائیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے صرف ہو رہی ہیں۔ اس لئے معاملات کافی الجھ سے گئے ہیں البتہ بی ایس او (آزاد) والے جس قسم کے مشکل حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور جس طرح ان کی فکر وعمل واضح ہے وہ دوسرے دو دھڑوں میں نظر نہیں آتا بلکہ وہ دہرے معیار کے شکار ہیں۔ ایک بات جو ہم نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ بی ایس او (آزاد) والوں کا وہی موقف ہے جو ہم نے 69-1968ء میں بی ایس او (انٹی سردار) کی پلیٹ فارم سے شروع کی تھی کہ سیاست اور قبائلی انا پرستی میں فرق ہونا چاہیے۔

''شعور ہو تو میری ذلتوں کو سجدہ کر
(کہ) تیری وقار کا بنیاد بن گیا ہوں میں''

شائع شدہ مضامین

گوادر ڈیپ سی پورٹ

حکومت پاکستان نے بلوچستان کے عوام کے دیرینہ مطالبے کی بنیاد پر گوادر ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے پر تیزی سے عملدرآمد کرنے کے لئے ایک بااختیار کمیٹی تشکیل دی ہے جو مرکزی وزارت مواصلات کے زیرنگرانی گوادر ڈیپ سی پورٹ عملدرآمدی سیل (Imlpementation Cell) کے نام سے ابتدائی کام کا آغاز کر چکی ہے، اس بڑے قومی منصوبے کی تکمیل میں سب سے اہم کردار کراچی پورٹ ٹرسٹ کے قدیم تجربہ کار ماہرین کا ادارہ ادا کرے گا، ان ماہرین کی آمدورفت تیزی سے شروع ہو چکی ہے۔ یقیناً اس اہم اور بڑے قومی منصوبے کی تکمیل سے بلوچستان کے لوگ بالعموم اور ساحلی علاقوں اور مکران ڈویژن کے لوگ بالخصوص انتہائی خوشی کا اظہار کریں گے بلکہ حکومت کے مشکور ہونے کے ساتھ ساتھ دست بہ دعا ہیں کہ کم از کم ان علاقوں کے لئے ایک قومی اہمیت کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے کیونکہ سینڈک کے پروجیکٹ اور میرانی ڈیم پروجیکٹ کا حشر دیکھ چکے ہیں۔

یاد رہے کہ اس پروجیکٹ کی ابتداء سابق وزیراعظم (مرحوم) ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اس اعلان کے ساتھ شروع ہوئی تھی کہ یہ ایک سماجی اقتصادی پروجیکٹ ہوگا جو اس علاقے کی معاشی، اقتصادی اور سماجی بدحالی اور پسماندگی دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگا اور بلوچستان کو ملک کے دوسرے صوبوں کے برابر لانے میں مدد ملے گی۔ یہاں کے لوگوں کے لئے کاروبار اور روزگار کے بے شمار مواقع فراہم ہوسکیں گے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا بلکہ پورا ملک مارشل لاء کے عذاب سے گزرا۔ وہ سب کے سامنے ہے بہتر ہے کہ ہم اس اہم منصوبے کے موجودہ منصوبہ بندی پر ایک تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں اور یہ امید رکھیں کہ موجودہ منتخب حکومت پورٹ کے اس بنیادی مقاصد یعنی سماجی واقتصادی پروگرام پر سختی سے کاربند رہے گی لیکن کام کی ابتدا جس انداز سے کی گئی ہے اس سے لوگوں کے خدشات و شکوک میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے کیونکہ ''انفرااسٹرکچر'' یعنی سڑکیں، پانی، بجلی اور تیز رفتار رسل ورسائل کا انتظام کئے بغیر ڈیپ سی پورٹ جیسا اہم اور بڑا منصوبہ قابل عمل ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس سے مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

ان خدشات وشبہات کا اظہار لوگ اس لئے کررہے ہیں کہ گوادر میں پہلے سے ایک فش ہاربر اور منی پورٹ تمام ضروری آلات کے ساتھ موجود ہے اور اس کو مکمل ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک وہ پروجیکٹ کہلاتا ہے۔ آج تک اس کو آزمائشی بنیادوں پر چلایا جارہا ہے، باقاعدہ آپریشنل نہیں ہے، موجودہ منی پورٹ پر معتین تمام ٹیکنیکل ملازم انیس گریڈ تک سب کے سب ایڈہاک ملازمت کررہے ہیں حالانکہ ملک کے تمام اہم منصوبوں پر ملازمین کو مستقبل طور پر ملازمتیں فراہم کی گئی ہیں۔ 1990ء میں مقامی اہل کار، پڑھے لکھے جونواں کی لسٹ متعلقہ حکام کو منظوری کے لئے بھیج دی گئی پھر 1993ء میں حکام بالا کی منظوری سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے

چیئرمین ڈائریکٹر پورٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن تھے۔ جنہوں نے اکتوبر 1993ء میں گوادر فش ہاربر کے آفس میں تمام اہل نوجوانوں کا باقاعدہ انٹرویو لیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ منی پورٹ کے ایک سے لے کر انیس گریڈ تک کے ملازمین کو گوادر ڈیپ سی پورٹ کے لئے از سر نو درخواستیں دینے کی ہدایت کی گئی ہے حالانکہ ان سب کا سروس ریکارڈ وزارت مواصلات کے پورٹ اینڈ شپنگ ونگ میں موجود ہیں۔

موجودہ منی پورٹ / فش ہاربر کے مستقبل کا ابھی تک فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کبھی اس کو پرائیوٹ سیکٹر کو دینے کی افواہ اڑتی ہے اور کبھی پاکستان نیوی کے حوالے کرنے کی خبر سننے میں آتی ہے۔ پورٹ کا ملک کے دوسرے بڑے ترقی یافتہ شہروں کے ساتھ منسلک ہونے کے لئے رسل ورسائل کا کوئی جدید معقول ذریعہ موجود نہیں، کسٹم حکام اور سی بی آر کی طرف سے گوادر اور پسنی پورٹ سے تجارتی بنیادوں پر ہر قسم کے امپورٹ ایکسپورٹ پر پابندی عائد ہے۔ گوادر منی پورٹ کا اپنا کوئی ٹیرف نہیں ہے، پورٹ چارجز کے پی ٹی ٹیرف کے مطابق وصول کئے جاتے ہیں جو سراسر زیادتی ہے، کولڈ اسٹوریج، پانی، بجلی اور فیول سپلائی کا پورٹ کے اندر کوئی معقول انتظام نہیں ہے غرضیکہ کوئی واضح پالیسی نہ ہونے کے سبب اس منی پورٹ کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے حالانکہ اس کو انتہائی منافع بخش طریقے پر چلایا جاسکتا ہے، روزگار اور کاروبار کے مواقع پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ پورٹ اور حکومت کو بہت معقول آمدنی اور محصول حاصل ہوسکتی ہے۔ اب حال یہ ہے کہ نہ حکومت کو کوئی فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور نہ ہی علاقے کے عوام کو کوئی سماجی واقتصادی فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ ان سارے مسائل کے ہوتے ہوئے اوپر سے ڈیپ سی پورٹ کا مژدہ بھی سنایا گیا ہے اور ہماری معلومات کے مطابق براہِ راست ڈیپ سی پورٹ کے پروجیکٹ پر کام کی ابتدا کی گئی ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ بالکل ناجائز ہے جس طرح ہم نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ ڈیپ سی پورٹ شروع ہونے سے پہلے اگر انفراسٹرکچر پر کام شروع ہو، سڑکیں، پانی اور بجلی کا نظام درست ہو، مقامی آبادی کے انجینئرز اور پڑھے لکھے نوجوانوں کو ضروری تربیت دی جائے تو یہ پروجیکٹ شاندار طریقہ پر قابل عمل ہو کر مطلوبہ نتائج حاصل کرسکتا ہے ورنہ اس کا حشر بھی موجودہ منی پورٹ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر ہوسکتا ہے کیونکہ اگر خدانخواستہ یہ قابل عمل نہ ہوسکا تو اس کے اخراجات حکومت اور عوام کے لئے ناقابل برداشت ہوجائیں گے، انہی خدشات وشکوک کی وجہ سے لوگوں نے ابھی سے پمفلٹ بازی شروع کی ہے اس لئے ضروری ہے بلکہ وقت آگیا ہے کہ موجودہ حکومت اس علاقے کے متعلق سابقہ حکمرانوں کی اس علاقے کو پسماندہ رکھنے کی پالیسی کو یکسر ترک کرے اور ڈیپ سی پورٹ پروجیکٹ شروع کرنے سے پہلے یا اگر وسائل اجازت دیں تو اس کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل تجاویز پر بھی فوری عمل درآمد کا آغاز کرے۔

ا۔ کراچی، اورماڑہ، گوادر اور جیونی تک کوسٹل روڈ بنانے کے کام کا آغاز جیونی سے کرے بلکہ اگر ایران گورنمنٹ اجازت دے تو پاک ایران سرحد تک سڑک کو وسعت دے تاکہ وہاں سے ایران اور وسط ایشیائی ممالک تک آسانی سے رسائی حاصل ہوسکے۔ (اب ہو چکا ہے)

۲۔ موجودہ تیار گوادر فش ہاربر اور منی پورٹ کو فوری طور پر اتھارٹی کا درجہ دے کر تمام ملازمین کو مستقل کیا جائے، منی پورٹ کا باقاعدہ افتتاح کر کے اس کو آپریشنل بنایا جائے۔ (اب اطلاعات کے مطابق اس کو ڈیپ سی پورٹ کا حصہ بنا کر فش ھاربر کی حیثیت ختم کی جارہی ہے)

۳۔ پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کے ذریعہ فیری اور کارگو سروس کا آغاز کیا جائے جو کراچی، پسنی گوادر اور کراچی کے درمیان پسینجر اور کارگو لا اور لے جا سکے اس سے لوگوں کو آمدورفت کی سہولت کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بھی فائدہ ہوگا اور پورٹ کے محصولات میں بھی اضافہ ہوگا۔

۴۔ گوادر پورٹ ڈیپ سی پورٹ پروجیکٹ کے لئے گوادر ضلع اور مکران ڈویژن کے مقامی انجینئرز اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی بھرتی اور تقرری کو اولیت دی جائے۔

۵۔ گوادر اور پسنی پورٹ سے ایمپورٹ ایکسپورٹ کی پابندی ختم کی جائے۔

۶۔ غیر قانونی کاروبار اور اسمگلنگ کو روکنے کے لئے دیگر ترقی یافتہ شہروں کے مقابلے میں گوادر پسنی اور پورے مکران ڈویژن میں کسٹم ٹیرف میں کم از کم ۳۰% فیصد کی چھوٹ دی جائے اس سے نہ صرف غیر قانونی کام کی حوصلہ شکنی ہوگی بلکہ حکومت کی آمدنی میں بے تحاشہ اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پورٹ کے محصولات میں بھی اضافہ ہوگا۔

۷۔ ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے اور علاقے کی تیز رفتار ترقی کے لئے ضروری ہے کہ حب انڈسٹریل زون، گدون امازئی انڈسٹریل ایریا، نوری آباد پنجاب انڈسٹریل زون کی طرز پر خاص سہولتیں دینے کے ساتھ ساتھ چند سالوں تک اس کو ٹیکس فری زون قرار دیا جائے۔

۸۔ پانی اور بجلی کا معقول انتظام کیا جائے۔

۹۔ گوادر منی پورٹ یا ڈیپ سی پورٹ چارجز کے لئے ''کے پی ٹی (کراچی پورٹ ٹرسٹ) پی ٹی'' سے ہٹ کر علیحدہ ٹیرف بنایا جائے اور ٹیرف کمیٹی میں مقامی کاروباری افراد کو نمائندگی دی جائے۔

۱۰۔ گوادر میں ایکسپورٹ پروموشن بیورو کا دفتر کھولا جائے تاکہ قانونی تجارت کو فروغ حاصل ہو سکے، تجارتی لائسنس اور دیگر ضروری کاغذات حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

۱۱۔ گوادر میں چیمبر آف کامرس کے آفس کھولنے میں مقامی تاجروں کی مدد و رہنمائی کی جائے۔

۱۲۔ تجارتی بینکوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اپنی فارن ایکسچینج برانچ گوادر میں کھولیں تاکہ مقامی تاجروں کو E فارم کا حصول ''L.C''

اور دیگر ضروری کاغذات بنانے میں آسانی ہو، ساتھ ساتھ آسان شرائط پر قرضوں کی سہولت بھی حاصل ہو۔

۱۳۔ سی مین اور مرچنٹ نیوی آفیسرز کی ٹریننگ کے لئے جدید اکیڈمی کھولی جائے تاکہ یہاں کے نوجوان باقاعدہ ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرسکیں اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکیں۔

۱۴۔ مقامی لوگوں کی سماجی، اقتصادی اور معاشی حقوق کے تحفظ اور ضمانت کے لئے ضروری ہے کہ ضلع گوادر کے باصلاحیت پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ایک دو افراد کو ''عمل درآمدی سیل'' میں نمائندگی دی جائے تاکہ صحیح معنوں میں مددگار ثابت ہوسکیں۔

روزنامہ ''جنگ'' کراچی

21 مارچ 1996ء

نگراں حکومت وقت کی اہم ضرورت ہے

ملک کی موجودہ گوں مگوں کی کیفیت نے پورے معاشرے کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہوتی جارہی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں کوئی ایسا صاحب اختیار شخص یا ادارہ موجود نہیں جس تک عام آدمی کی فریاد پہنچ سکے اور اگر پہنچ بھی جائے تو اس کی صحیح شنوائی ہو سکے جہاں تک ذاتی اور انفرادی مسائل کا تعلق ہے ان پر تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ

''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں''

لیکن اب تو مسئلہ خاصا اجتماعی بن چکا ہے۔اس گھمبیرتا میں سب کے سب سارے صوبے سارا ملک الجھ کر رہ گیا ہے۔اس غیر یقینی کی صورت حال میں مملکت کا سارا کاروبار، لوگوں کا ذریعہ معاش، تجارت، صنعت حرفت آمد و رفت، سرکاری دفاتر سے لے کر نجی دفاتر تک سب کے سب بھاری ٹیکسوں اور آئے دن روپے کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے ٹھپ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔صوبے سرکاری ملازمین کی تنخواہ کے لئے چیخ رہے ہیں اور مرکز ''آئی ایم ایف'' اور ''ورلڈ بینک'' کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔آخر کار یہ سب کیسے ہوا؟ کون اس کا ذمہ دار ہے اور کب تک یہ چلے گا۔؟

ملک کو بنے ہوئے نصف صدی مکمل ہونے والی ہے حکومت نیم دلی سے ''گولڈن جوبلی'' منانے کی تیاریوں میں مصروف ہے اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کا نوید بھی سنا رہی ہے اور وہ بھی خالی ہاتھ، لیکن عام شہری اور ملک میں بسنے والے کروڑوں عوام اب کسی حکومت کے کسی دعوے پر اعتبار کرنے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتی۔جب کسی ملک کے عوام کا اپنے ہی منتخب حکومت پر اعتماد اٹھ جاتی ہے اور اس کے شراکت اقتدار کا حساس ہی ختم ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پورے معاشرے میں جمود کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور یہ کیفیت کسی بھی معاشرے کے لئے بہت ہی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔اس ملک کی عوام نے گزشتہ نصف صدی سے مختلف طرز حکومتیں دیکھیں اور آزمائی ہیں، مخلوط حکومتیں، مارشل لاؤں کی آمر حکومتیں، نام نہاد جمہوریتیں، بنیادی جمہوریتیں، اسلامی نظام لانے کا دعویٰ، اسلامی سوشلزم کا دعویٰ، زرعی انقلاب، صنعتی انقلاب برپا کرنے کا نوید، ایشین ٹائیگر بننے کا خواب، کوڑے، پھانسی، اذیتیں، جلاوطنی، دہشت گردی، لاقانونیت، ہنگامہ آرائی، کرپشن، ماروائے عدالت اقتال، قومی ملکیت، نجی ملکیت، صدارتی طرز حکومت، پارلیمانی جمہوریت، عرضیکہ دنیا میں جتنے بھی نظام حکومت کی تھیوریاں ہیں اور جو نہیں ہیں خود بنا کر آزمائے گئے لیکن اس کے باوجود ہمارے ملک کا معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام ایسا چلتا دکھائی نہیں دیتا جس سے عام آدمی سکھ کا سانس لے سکے اور دنیا تو کجا اپنے ہی ہم وطن بھائیوں کے سامنے فخر سے یہ کہہ سکے کہ اب ہم مطمئن ہیں اور فلاں نظام حکومت ہمارے ملک اور اس کے عوام کے لئے بہتر ہے۔

کوئی بھی نظام نہ خود اچھا ہوتا ہے نہ ہی برا اس کو اچھا یا برا بنانے میں لوگوں کا بڑا کردار ہوتا ہے خاص کر صاحب اقتدار لوگ اس میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام لوگ کسی بھی نظام سے خوش نہیں ہوتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو نظام اپنایا جائے اس نظام کے تحت اصلاحات کو لانے کا عہد کیا جائے کم از کم اس پر ایماندارانہ طریقہ سے عمل تو کیا جائے اور جب کہنے اور کرنے میں تضاد نہ ہو تو خلق خدا کا وہ اجتماع جس نے اپنی محنت اور حق رائے دہی کے ذریعہ جن لوگوں کو امور مملکت کی ذمہ داریاں سونپی ہیں کم از کم وہ تو مطمئن اور خوش ہوں گے ان کی تو تشفی ہوگی۔ لیکن مشاہدے میں ہمیشہ یہ آیا ہے کہ جو کہا جاتا ہے وہ کیا نہیں جاتا، منشور میں کچھ ہوتا ہے عمل کچھ اور ہوتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ جب مخصوص گروہ برسر اقتدار ہوتا ہے تو منزل ان لوگوں کو ملتی ہے جو کبھی ان کے شریک سفر نہ تھے اور یہیں سے پہیہ الٹا گھومنا شروع ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کے خلق خدا کو کیسے مطمئن کیا جائے، اس کو کس طرح اعتبار دلایا جائے کہ اب جو ہوگا بہتر ہوگا۔ آئینی طور سے ہم پابند ہیں کہ اگر صدر محترم اپنے صوابدیدی اختیار کے تحت حکومت کو برطرف کرے تو لازم ہے کہ نوے دن کے اندر انتخابات کرا کر حکومت اکثریت رکھنے والی پارٹی کے حوالے کر دے یہی اپوزیشن اور دوسرے اقتدار سے محروم پارٹی لیڈروں کا مطالبہ بھی ہے یہ مطالبہ اور آئین کا تقاضا اپنی جگہ بالکل بجا لیکن کیا ہم نوے دن کے بعد وہ مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں جس سے اس ملک کی معاشی سیاسی اور معاشرتی نظام کو استحکام مل سکے اور چاروں صوبوں کے عوام کو ان کے بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت مل سکے جو ملک کی سالمیت کی بھی ضمانت ہے۔؟ یقیناً نہیں بلکہ ہماری رائے میں اس غیر یقینی کی کیفیت میں مزید اضافہ ہوگا کیونکہ تین مہینے کے بعد الیکشن کا کم وبیش وہی نتیجہ نکلے گا یا ذرا سا مختلف ہوگا جو پہلے سے موجود ہے اس لئے کہ مافیا پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہوا ہے اس نے اقتدار میں رہ کر ناجائز ذرائع سے بے پناہ دولت اکھٹی کی ہے اور یہ ساری ناجائز دولت الیکشن پر بری طرح اثر انداز ہوگی کچھ لوگ کرپشن کی وجہ سے بلیک میل ہوں گے اور کچھ لوگ دولت اکٹھا کرنے کی خاطر (Status-quo) صورت حال کو برقرار رکھنے کے لئے ریاستی مشینری اور دوسرے ذرائع کو استعمال کر کے الیکشن پر اثر انداز ہوں گے۔ چونکہ عوام کی اکثریت ان پڑھ اور انتہائی سادہ ہے اس لئے ان کو ذات پات اور برادریوں کے چکر میں الجھا کر یا دولت نوکریاں اور مراعات کا جھوٹا وعدہ کر کے آزاد حق رائے دہی سے محروم کر دیا جائے گا اور ہم پھر سے وہیں کھڑے ہوں گے جہاں سے چلے تھے۔

یہ اپنی جگہ حقیقت ہے اور اس ملک کی عوام کی بڑی بدقسمتی ہے کہ ایک ایسی سیاسی پارٹی (پی پی پی) جس نے اس ملک کی سیاست میں 29 سال گزارے، اقتدار بھی دیکھا، اقتدار سے برطرفی بھی دیکھی، پارٹی کے بانی اور قائد کو پھانسی لگتے بھی دیکھا، قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، جلاوطنی کی زندگی گزاری پھانسی چڑھے، کوڑے کھائے لیکن پھر بھی اتنے تجربات سے گزرنے کے باوجود جب اقتدار میں آئے تو نہ صرف ملک کے عوام کو بلکہ اپنے کارکنوں کو بھی بری طرح مایوس کیا۔ امور مملکت چلانے میں جس طرح اس پارٹی کی قیادت ناکام ہوئی شاید

کوئی اور پارٹی ہوئی ہو۔اس پارٹی کے موجودہ قیادت اوراس کے رفقائے کار کے طرز عمل سے شروع دن سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ ان کو ملک میں آئندہ سیاست نہیں کرنی ہے اس کے جو ہاتھ آیا سمیٹتے چلے گئے۔یہی وجہ ہے کہ تین سال قلیل مدت میں سیاسی کارکنوں کے جم غفیر کے باوجود یہ پارٹی دفاعی پوزیشن میں چلی گئی اور حالیہ میر مرتضیٰ بھٹو کے سانحے نے اس کی رہی ساکھ بھی تباہ کر کے رکھ دی۔اس قیادت نے نہ صرف ان لوگوں اور چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہوں کو ناراض کیا جن کا اپنے اپنے صوبوں میں کافی اثر ورسوخ تھا بلکہ اپنے ان ساتھیوں کو بھی لات ماری جو مصیبت کے دنوں میں اپنی جان پر کھیل کر ان کی رکھوالی کرتے رہے اور اب تو اپنے منتخب کئے ہوئے صدر کو بھی اس قدر ناراض کیا ہے کہ بات بنتی نظر نہیں آرہی ہے۔

ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکومت کو چلانا سخت دشوار اور مزید پیچیدگیوں کا سبب بن سکتا ہے اور اگر یہی حالات برقرار رہے تو کوئی بھی طالع آزما یا غیر سیاسی قوت کسی بھی وقت اقتدار پر قبضہ کر کے ملکی معاملات کو مزید پیچیدگیوں اور مشکلات کا شکار بنا سکتا ہے اس لئے ہم بحیثیت ایک ادنیٰ شہری اس سارے گھمبیر تا کا واحد بلکہ دیرپا حل یہ سمجھتے ہیں کہ صدر محترم اپنے صوابدیدی اختیارات جو اسے آئین کے مطابق حاصل ہیں استعمال کر کے موجودہ حکومت کو برطرف کر دیں اور کم از کم دو سال کے لئے ایک قومی نگران حکومت جو تمام پارٹیوں سے اچھی شہرت رکھنے والے افراد پر مشتمل ہو نامزد کرے اور اس نگران قومی حکومت کو ملکی مفاد میں ملک کے سارے گند صاف کرنے کے لئے چند مخصوص ٹاسک پائے تکمیل تک پہنچانے کے بااختیار ذمہ داری سونپی جائے۔اگر اس مرتبہ اس قومی نگران حکومت کا سربراہ بلوچستان سے لیا جائے تو یہ ایک اچھی روایات کی ابتدا ہوگی۔نگران قومی حکومت کو دو سال کے اندر جو چند اہم اور ضروری کام کرنے ہوں گے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایک اعلیٰ اختیاراتی عدالتی کمیشن کے ذریعے 1977ء سے لیکر 1996ء تک ان تمام افراد کا بلا امتیاز احتساب ہو جس پر کرپشن ،ہارس ٹریڈنگ اور دوسرے بدعنوانیوں کے الزامات ہیں۔الزامات ثابت ہونے پر قانون کے مطابق سزا اور انتخابات سے نااہلی۔

۲۔ تمام صوبوں کے ازسرنو جغرافیائی حدود کا تعین۔

۳۔ تمام جعلی شناختی کارڈز اور پاسپورٹوں کی تنسیخ اور نئے کمپوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کا اجراء۔

۴۔ تمام افغان مہاجرین اور غیر قانونی تارکین وطن کو کیمپوں میں منتقل کر کے نئے مردم شماری کا اختمام۔

۵۔ قومی اور صوبائی اسمبلی کے لئے تمام امیدواروں کے معیار کا آئین کے مطابق تعین اور اضافی اس شرط کے ساتھ کہ قومی یا صوبائی اسمبلی کے امیدوار کا کم از کم تعلیمی معیار ''بی اے'' ہو۔

۶۔ غیر جانبدار، شفاف اور منصفانہ انتخاب کا انعقاد۔

۷۔ نئے منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے تمام امیدواروں سے چاہیے وہ حکومت میں ہو یا اپوزیشن میں ملکی مفاد کی خاطر یہ عہد لیا

جائے کہ وہ کثرت رائے سے آئین میں ترمیم کر کے اس شق کا اضافہ کریں گے کہ آئندہ ملک کی صدارتی امیدوار ہر چار یا پانچ سال بعد (جو بھی میاد ہو) باری باری چاروں صوبوں سے منتخب کی جائے گی۔ صدارتی امیدوار کے لئے جس صوبے کی باری ہوگی محض اس صوبے کے اعلیٰ شہرت رکھنے والے امیدوار انتخاب میں حصہ لیں گے اس دورانیے (Tenure) میں دوسرے صوبے کے امیدوار کاغذات نامزدگی داخل نہیں کر سکیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں ہماری اس آخری اور لازمی تجویز پر عمل درآمد سے نہ صرف چھوٹے صوبوں کے لوگوں کی حساس محرومی ختم ہوگی بلکہ ملکی یکجہتی اور پاکستانی قومیت کے رجحان کو بھی فروغ ملے گا اور عملی طور پر یہ احساس جڑ پکڑتا جائے گا کہ یہ ملک سب کا ہے اور سب کو اس کی اہلیت اور قابلیت کے مطابق ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ مزید یہ کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے صوبائی تعصّبات اور منافرت پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ بات ہم اس لئے زور دے کر لکھ رہے ہیں کہ جب سے پاکستان بنا ہے اس میں چاہے جمہوری حکومتیں برسر اقتدار رہی ہوں یا مارشل لاء کا دور ہو بلوچستان کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جو ہم سمجھتے ہیں ملک کی سالمیت کے لئے ایک نقصان دہ رجحان ہے۔ سندھ، پنجاب اور سرحد کے لوگوں کو سربراہ حکومت یا سربراہ مملکت بننے کا شرف حاصل رہا ہے لیکن بلوچستان کو جو پاکستان کا رقبے کے لحاظ سے سب بڑا صوبہ ہونے کے باوجود کبھی یہ موقع نہیں دیا گیا اور اگر موجودہ ملکی آئین میں مجوزہ ترمیم نہ کی گئی تو شاید بلوچستان کے لئے یہ ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔

ملکی سرحدوں پر تیزی سے رونما ہونے والے حالات و واقعات کا تقاضا ہے کہ بروقت اقدام کیا جائے۔ مخلص اور ایماندار قیادت کو آگے لانے کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ ہم محض آئین آئین کرتے رہ جائیں اور پورا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو کر تباہ ہو جائے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل کر کے ملک کے سارے عوام کو ساتھ لے کر نئے رونما ہونے والے بین الاقوامی حالات اور نیو ورلڈ آڈر کا ہوشمندی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر مایوسی اور محرومی ہمارا مقدر بن جائے گی اور اس کے لئے شاید تاریخ ہمیں کبھی بھی معاف نہ کرے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

29 اکتوبر 1996ء

جمہوری وطن پارٹی کی آٹھویں یوم تاسین

اس تقریر کا متن جو میں نے 1998ء میں ''جے ڈبلیو پی'' کے آٹھویں یوم تاسیس کے اجلاس کے موقع پر سرینہ ہوٹل کوئٹہ میں کی تھی۔اس جلاس کی صدارت خود شہید نواب اکبر بگٹی نے کی تھی جس میں پارٹی کے تمام مرکزی صوبائی ضلعی تحصیل سطح کے عہدیداروں کے علاوہ پارٹی کے سینیٹر ایم این اے اور صوبائی اسمبلی کے ممبران نے بڑی تعداد میں شرکت کی تھی۔اس تقریر کو کافی سراہا گیا تھا۔اس سارے پروگرام کا ویڈیو بھی موجود ہے۔

جناب صدر معزز اراکین پارلیمنٹ، پارٹی کے عہدے داران اور میرے عزیز دوستوں اور ساتھیوں!''جے ڈبلیو پی'' کے اس آٹھویں یوم تاسیس کو کامیابی سے منعقد کرنے پر پارٹی کے صدر جناب نواب اکبر بگٹی صاحب اور آپ سب دوستوں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔یہ یوم تاسیس اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے گزشتہ آٹھ سال کی کارکردگی پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں اور اپنی کامیابیوں نا کامیوں اور کمزریوں پر سیر حاصل بحث وتمحیص کریں تا کہ آئندہ ہم بہتر انداز سے پارٹی کے پروگرام اور منشور کو عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنا کر پارٹی کو مزید فعال اور ترقی دے سکیں۔اس سے پہلے کہ میں باقی معاملات پر آؤں میں اپنے ضلع گوادر کے بارے میں یہ بتاؤں کہ ہمارے ضلع میں پارٹی آگے بڑھی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ میر حسین اشرف جو کہ سابقہ صوبائی وزیر اور ایک بہت ہی سینئر سیاسی کارکن ہیں بمعہ اپنے ساتھیوں کے پارٹی میں شامل ہوئے ہیں جو اس وقت سب کے درمیان موجود ہیں۔زوردار تالیاں۔

جناب صدر!

باقی معاملات پر بات کرتے ہوئے میں آپ کی شخصیت کو زیر بحث لاتے ہوئے اپنی بات کا آغاز ان الفاظ سے کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نہ صرف ایک زیرک سیاستدان اعلیٰ پڑھا لکھا شخصیت ایک نواب قبائلی سربراہ ہیں بلکہ آپ کے اندر ایک مدبر (Statesmanship) کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک ریاست کو چلانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔میں حیران ہوں کہ آپ جیسی شخصیت آخر کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔نواب صاحب آپ کو اپنے قبائلی خول سے باہر نکلنا پڑے گا۔آپ کو ایک بدحال، بدبخت، تمام وسائل سے محروم، تمام انسانی بنیادی حقوق سے محروم قوم کی حقیقی نمائندگی کا حق ادا کرنا پڑے گا۔جہاں ڈیرہ بگٹی کا ایک نوخیز نوجوان، ایک باشعور پڑھا لکھا شخص، ایک چرواہا، ایک عمر رسیدہ قبائلی آپ کو اپنا ہیرو نجات دہندہ مانتا ہے وہاں مکران کے ساحل پر ایک وقت کی روٹی کمانے والا مچھیرا بھی آپ کو ہی اپنی امید کی آخری کرن سمجھتا ہے۔نصیر آباد، سبی، کچھی، چاغی، خاران، قلات، خضدار اور لسبیلہ کا ایک مزدور، زمیندار، حکومتی اہل کار، طالبعلم، ہل چلانے والا کسان آپ کو اس خطے کا آخری سہارا سمجھتا ہے حتیٰ کہ کوئٹہ میں آباد کار اور ہزارہ کمیونٹی کے

لوگ اور پشتون علاقوں میں آباد باشعور سیاسی کارکن اس حقیقت کو ماننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ آپ ہی ایک ایسی شخصیت ہو جو بلوچستان کو خون خرابے اور نفرتوں کے انبار سے بچا سکتے ہیں اس کے باوجود میں حیران ہوں کہ آپ کی راہ میں وہ کون سی چیز حائل ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک ہے کہ آپ کو تنگ نظر قبائلی تضادات تصادم و مشکلات میں ایک گہری سازش کے ذریعہ الجھایا گیا ہے۔ لیکن آپ نے ہمیشہ ان گھناؤنے سازشوں کا جوانمردی سے مقابلہ کیا ہے اس لئے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ جیسا مدبر، دانشور، اعلیٰ پڑھا لکھا، بھاری بھرکم شخصیت اس قسم کے اچھے گھناؤنے سازشوں کا شکار ہو کر اس مجبور و محروم قوم کی نمائندگی سے اپنے آپ کو معدوم یا مختصر کر دیں جو آپ کو اپنی امیدوں کا آخری کرن بلکہ سہارا سمجھتے ہیں۔

جناب صدر! وہ کون سی عزت وقار ہے وہ کون سا عہدہ و رتبہ ہے وہ کون سا مقام ہے جو آپ نے نہیں دیکھا۔ ''آئی سی ایس'' کا امتحان آپ نے پاس کیا جو اس زمانے میں ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا مرکزی وزیر دفاع آپ رہ چکے ہیں، گورنر اور وزارت اعلیٰ کا عہدہ آپ نے دیکھا ہے ان سب سے بڑھ کر کیا یہ اعزاز آپ کے لئے کم ہے کہ آپ ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوتے آرہے ہیں آپ ایک سیٹ والے نواب نہیں آپ بلوچستان میں 13 سیٹیں لینے والے واحد پارٹی کے سربراہ اور شخصیت ہیں لیکن افسوس صد افسوس آپ اپنے قبائلی خول سے نکلنے کے لئے تیار نہیں۔ چونکہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ اپنے خول میں بند رہنے والے سرداروں کا حشر آج آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ زوردار تالیاں۔

جناب صدر! آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ قول کے دھنی ہیں جو کہتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں آپ کے قول و عمل زبان وعدہ میں کوئی تضاد نہیں لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ جناب والا! یہ آپ کا قصور نہیں ہر بڑا آدمی مردم شناسی کے معاملے میں کمزور رہا ہے۔ میں تو ''جے ڈبلیو پی'' کے بقاعدہ اعلان سے پہلے اس پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ پھر 1990ء میں وزیر اعلیٰ ہاؤس کے لان میں آپ کے سامنے اسٹیج پر آکر باقاعدہ شمولیت کا اعلان بھی کیا تھا بعض لوگ بھاگ گئے لیکن ہم اب بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ نواب صاحب آپ کو یاد ہوگا کہ شمولیت کے بعد دوسرے دن بگٹی ہاؤس میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اس ملک میں یہ روایات عام ہے کہ جب نئے لوگ پارٹی میں آتے ہیں تو پرانے نظر انداز ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے بلوچی میں جواب دیا تھا کہ ''لنگڑی ءِ ہمراہ لنگڑی ہمراہ انت، آشموشگ نہ بنت۔'' لیکن جب سینیٹ کے ٹکٹ تقسیم ہوئے تو مجھے مکمل نظر انداز کیا گیا ایسے لوگوں کو میرے علاقے سے سینیٹ کا ٹکٹ دیا گیا جنہوں نے قومی اسمبلی کے سیٹ پر ''جے ڈبلیو پی'' کا ٹکٹ لینے سے انکار کیا تھا لیکن پھر بھی ہم نے آپ کے حکم پر لبیک کیا۔ زوردار تالیاں۔ (اس پر سامعین سے ایک کارکن اٹھ کر کہنے لگے کہ جب نواب صاحب پر تنقید ہو رہا ہو تو تالیاں نہ بجائیں اس کا جواب دیتے ہوئے خود نواب صاحب نے اس کو ڈانٹتے ہوئے حکم دیا کہ ''بیٹھ جاؤ اور ظفر کو تنقید کرنے دو یہ میرا صوابدید ہے تمہارا نہیں''۔)

جناب صدر! شکریہ یہی تو آپ کا بڑھک پن ہے اب میں آتا ہوں ان محترم سینیٹرز کی طرف جن کو آپ نے پارٹی کا ٹکٹ دلا کر ایوان

بالا تک پہنچایا۔ان کی اس دوران ایسی کوئی قابل ذکر کارکردگی نظر نہیں آتی جس کی توصیف کی جا سکے۔ہم سب کو پتہ ہے کہ بلوچستان کے جو بھی بڑے بڑے مسائل ہیں ان کا تعلق مرکزی حکومت اور مرکزی اداروں سے ہے۔مثلاً واپڈا، این ایچ اے، پورٹ اینڈ شپنگ، وزارت خارجہ، پی پی ایل، او جی ڈی سی اور دیگر مختلف سرکاری یا نیم سرکاری ادارے جن کو سینیٹ میں جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے لیکن کم از کم مجھے ان سینیٹرز کی زبان سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔(ادھر نواب صاحب نے مجھے روکتے ہوئے کہا کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں چونکہ میں نے ان کو (Tune) کیا تھا اس لئے اس کی زمہ داری میں لینے کے لئے تیار ہوں) اس کے بعد کئی منٹ تک پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔جب تالیوں کی آوازیں تھم گئیں تو پھر نواب صاحب نے مختصراً مگر کچھ طنزیہ انداز سے یہ کہہ کر میرے تقریر کا جواب دیا کہ ''یہ مکران کے لوگ ترقی پسند پڑھے لکھے لوگ ہیں ہم قبائلی جاہل لوگ ہیں ہم ان سے سیکھتے رہیں گے۔''

اگست 1998ء
سرینہ ہوٹل کوئٹہ

ضلع گوادر میں امریکی کمپنی سے 460 ملین ڈالر کا معاہدہ پراسرار بن گیا

(جمہوری وطن پارٹی کے مرکزی لیبر سیکریٹری رحیم ظفر نے 22 اگست کو کوئٹہ پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس کا مکمل متن مندرجہ ذیل ہے۔)

صحافی بھائیو! آج ہم نے آپ کو انتہائی اہم مسئلے کی خاطر یہاں آنے کی زحمت دی۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو علم ہے گوادر ملک کا ایک انتہائی اہم پورٹ ہے اور ساحل بلوچستان کے 770 کلومیٹر پھیلے ہوئے ساحل کا اہم مرکز ہے جس کی اپنی ایک بین الاقوامی اہمیت بھی ہے۔ ضلع گوادر ارو ماڑہ سے لے کر جیونی تک جن مسائل و مشکلات کا شکار ہے ان پر بھی ہم بعد میں مختصراً روشنی ڈالیں گے۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر وہ معاہدہ ہے جو قومی اور مقامی اخبارات کے مطابق حکومت پاکستان انونسٹمنٹ بورڈ نے ایک امریکی فرم میسرز فوبس اینڈ کمپنی کے ساتھ فشریز سیکٹر میں کیا ہے۔ اخبارات کے مطابق میسرز فوبس اینڈ کمپنی ضلع گوادر میں بلوچستان کے ساحل پر 460 ملین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گی۔ اول تو کافی تگ و دو و مقامی صوبائی حکام سے کافی رابطہ کے بعد اصل معاہدہ کی نقل دستیاب نہیں ہے حالانکہ اگر یہ معاہدہ علاقے اور عوام کے مفاد میں ہے تو اس کو اس قدر پراسرار بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس معاہدے کو جس قدر پراسرار بنایا جائے گا لوگوں کے دلوں میں اتنے ہی شکوک و شبہات جنم لیتے رہیں گے۔ آج تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ مذکورہ کمپنی اپنی سرمایہ کی بنیاد کہاں سے شروع کرے گی۔ کن کن پراجیکٹس پر پیسہ لگائے گی اور اس کے عوض وہ ہم سے کیا طلب کرے گی۔ یہ سب باتیں وضاحت طلب ہیں۔ یہی سوالات غالباً ''انتخاب'' اخبار نے 6 جون 1998ء کے اداریہ میں اٹھائے ہیں۔ اس کے بعد میں نے صدر مملکت کو ایک عرض داشت پیش کی جس کی کاپیاں وزیراعظم، گورنر بلوچستان اور اس وقت کے وزیراعلیٰ بلوچستان کو بھی بھیجی گئیں اور ان کو مل بھی گئیں۔ ہم نے استدعا کی تھی کہ کسی غیر ملکی فرم کو ماہی گیری کی اجازت نہ دی جائے بلکہ اس کو محض یہ اجازت ہو کہ وہ وہاں پر ایسے پروجیکٹ لگائیں جس سے لوگوں کو فائدہ ہونے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو آمدنی ہو سکے۔ وہ ہمارے ماہی گیروں کی پکڑی ہوئی مچھلی خریدیں اور قانون کے مطابق اس کو ایکسپورٹ کریں تاکہ زرمبادلہ آ سکے۔ میری اس درخواست کی تاحال کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اخبارات میں محض چیئرمین انونسٹمنٹ بورڈ ہمایوں اختر کی یہ وضاحت جاری ہوئی کہ میسرز فوبس اینڈ کمپنی کوئی یہودی فرم نہیں ہے۔

جس دن وزیراعظم پاکستان نے فشریز سیکٹر کے اس معاہدہ پر اخبارات کے مطابق وزیراعظم ہاؤس میں دستخط کئے اس میں محض یہ شرط لکھی ہوئی تھی کہ مذکورہ فرم مرکزی حکومت کو دس فیصد رقم ادا کرے گی۔ یہ بھی انتہائی مبہم انتہائی غیر واضح شرط تھی۔ آیا مذکورہ فرم کل سرمایہ داری رقم سے دس فیصد ادا کرے گی یا ہر شپمنٹ پر دس فیصد ادا کرتی رہے گی۔

صحافی بھائیو! اس پراسرار معاہدے نے جہاں علاقے کے لاکھوں ماہی گیروں کی نیندیں حرام کر دی ہیں وہاں ہر محبّ وطن شہری یہ

پوچھتا رہتا ہے کہ آیا واقعی ساحل بلوچستان یا گوادر کو مذکورہ کمپنی کو فروخت کر دیا گیا ہے؟ یا لیز پر اس کے حوالے کیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ان کی جدید ٹیکنالوجی ہمارے اس اہم زرمبادلہ کمانے والے ذریعہ کو چند مہینوں میں بنجر کر کے رکھ دے گی۔

بلوچستان محکمہ ماہی گیری اور ہمارے عوامی نمائندہ گوادر کے ''ایم پی اے'' کے مطابق مذکورہ فرم کی دوسری تمام باتیں مبہم سطحی اور جھوٹ پر مبنی ہیں۔ وہ کسی قسم کی سرمایہ کاری کرنے پر سنجیدہ نہیں ہیں۔ ان کا اصلی ٹارگٹ محض فشنگ کرنا ہے ان کا اصلی پلان یہ ہے کہ پورے ساحل بلوچستان پر اپنی اجارہ داری قائم کریں اور کلمت بے (کلمت ہُور) کے قریب جہاں دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی ایکسپورٹ کوالٹی ''جھینگا'' پیدا ہوتا ہے اپنی ایک فلوٹنگ جیٹی قائم کریں۔ اپنی چار سوٹرالر جدید ماہی گیری آلات اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس لا کر پورے ساحل پر پھیلا دیں اور تمام سمندری حیات کو سمندر سے سمندر امریکہ منتقل کریں۔ ہم مرکزی اور صوبائی حکومت سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس پراسرار معاہدے کی وضاحت کریں۔

صحافی بھائیو! اگر واقعی ایسا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ آپ کا یہ خوبصورت ساحل اور اس کی سمندری حیات چند مہینوں میں ناپید ہو جائے گی اور گڈانی سے لے کر جیونی تک لاکھوں ماہی گیر بھوک اور افلاس کے شکار ہو جائیں گے اور اس کا اثر ملکی سالمیت پر بھی پڑے گا۔ کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق ان کو ۲۰ ناٹیکل میل تک ماہی گیری کی اجازت دی گئی ہے حالانکہ بلوچستان فشریز آرڈیننس کے مطابق ۲۰ ناٹیکل میل اندر کراچی کے پاکستانی ٹرالروں کو بھی اجازت نہیں ہے تو پھر اس امریکی فرم کے ٹرالروں کو کیسے اجازت دی گئی ہے اس لئے ہم کہتے ہیں کہ امریکہ ہو یا کوئی بھی غیر ملکی فرم اس کو فشنگ کی سرے سے اجازت ہی نہیں دینا چاہیے بلکہ ان کو محض یہ اجازت ہو کہ گوادر پسنی اور ماڑہ جیونی گنز اور پیشکان میں ماہی گیری کی صنعتیں لگائیں، پروسسنگ پلانٹ قائم کریں کولڈ اسٹوریج بنائیں اور ہمارے مقامی ماہی گیروں سے مچھلی خریدیں اور اس کا قانون کے مطابق ایکسپورٹ یا ایمپورٹ کریں تا کہ ملک کو زرمبادلہ مل سکے جس کی اس کو سخت ضرورت ہے اور مقامی لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آئے۔

صحافی بھائیو! اس مسئلے کو اس طرح نہ لیں جس طرح ایک جذباتی نوجوان روایتی انداز میں مرکز مخالفت یا محض اپنا لیڈری چمکانے کی خاطر پریس کانفرنس کر رہا ہو۔ یہ ایک انتہائی گھمبیر سنجیدہ مسئلہ ہے ساحل بلوچستان ہم سب کا ہے ہر پاکستانی کا ہے اور پاکستان کا زرمبادلہ کمانے کا ایک انتہائی اہم ذریعہ ہے یہ پاکستان اور بلوچستان کا ایک ایسا ہی حصہ ہے جیسا کوئٹہ شہر، جیسا لاہور، فیصل آباد، ملتان، پشاور، کراچی ہیں۔ اگر آپ لاہور اور دوسرے پاکستانی شہروں کو کسی غیر ملکی کمپنی کو اجارہ پر نہیں دے سکتے تو ساحل مکران یا ضلع گوادر کو کیسے کسی امریکی فرم کو پٹے پر دے سکتے ہیں۔ اس لئے میں اپنے صحافیوں سے ملکی سالمیت کی خاطر دستہ بستہ عرض کرتا ہوں کہ اس جدوجہد میں ہمارا بھرپور ساتھ دیں، ہمارے وسائل محدود ہیں، آپ لوگوں کی رسائی صوبائی دارالحکومت اور مرکزی دارالحکومت اسلام آباد تک ہیں اور آپ کے

قلم میں بھی بہت طاقت ہے۔آپ اس کا کھوج ضرور لگائیں اور حقائق کو عوام تک پہنچائیں۔یہی آپ لوگوں کا ملکی فریضہ ہے۔

اس سے پہلے کہ میں دیگر چند صوبائی مسائل پر آؤں۔میں اس پریس کانفرنس کے ذریعہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں خاص کر نئے وزیر اعلیٰ جان محمد جمالی سے دوبارہ مطالبہ کرتا ہوں کہ اس معاہدے کی وضاحت کریں کیونکہ حال ہی میں ''ڈان'' اور دیگر اخبارات میں آیا ہے کہ میسرز فوبس اینڈ کمپنی فراڈ ہے اس کو کوئی بھی بین الاقوامی معاہدہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ہمیں خدشہ ہے کہ اس فراڈ کی خبروں میں بھی ایک فراڈ پوشیدہ ہے تاکہ لوگ اس کو فراڈ سمجھ کر بھول جائیں اور یہ فرم ہمارے سمندری حیات کی نسل کشی کرتی پھرے کیونکہ ان کے پاس ایسی ٹیکنالوجی ہے کہ یہ ۲۰ کلومیٹر تک سمندری حیات کو سک کر کے شکار کر سکتے ہیں۔وزیر اعلیٰ اختر جان مینگل نے وزارت اعلیٰ کے دوران خاموشی اختیار کی تھی اب وہ بھی اس معاہدے کے خلاف بیان دے رہے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے ''جے ڈبلیو پی'' کے صدر نواب اکبر بگٹی نے بھی معاہدہ کو مجرمانہ فعل قرار دیا ہے اور ہمیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا ہے۔ہم! گوادر کے لوگوں کو فخر ہے کہ نواب صاحب نے اپنی پارٹی میں ہمیں مرکزی اور صوبائی عہدوں پر فائز کیا ہے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اب میں آپ لوگوں کی توجہ گوادر، پسنی، اور ماڑہ، پیشکان، گنز اور جیونی کے مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جہاں بجلی نہ ہونے کے برابر ہے۔جنریٹرز جو چندے میں ملے تھے خراب ہو چکے ہیں۔ڈیزل نہ ہونے کا رونا ہے واپڈا کے بل بجلی نہ ہونے کے باوجود ادا کرنے پڑتے ہیں۔اسکولوں کی حالات زار پر رونا آتا ہے۔پینے کا پانی دستیاب نہیں ہے۔جیونی میں پانی کے سلسلے میں قحط ہے۔بے روزگاری عام ہے۔چرس، ہیروئین کا دھندا معمول بن چکا ہے پورے ضلع بلکہ مکران ڈویژن میں پکی سڑکیں نہیں ہیں اس لئے یہاں کے غریب لوگ اپنے مریضوں کے علاج و معالجے، بچوں کو ہوسٹلوں میں داخلہ دلانے اور دیگر کام کاج کے لئے ہوائی جہاز سے سفر کرنے پر مجبور ہیں لیکن ''پی آئی اے'' مسلسل اپنے کرایوں میں اضافہ کر رہی ہے جو لوگوں کے استطاعت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔اگر کرایوں میں اضافہ کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو لوگ ''پی آئی اے'' میں سفر کرنے سے قاصر ہو جائیں گے اور ان کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔ہم ''پی آئی اے'' سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے کرایوں میں اضافہ نہ کرے بلکہ اسے اعتدال میں رکھے۔گوادر فش ہاربر اتھارٹی کے مقامی ملازمین آج بھی روزانہ کی اُجرت پر کام کر رہے ہیں۔یہی حال پسنی فشریز اتھارٹی کا بھی ہے۔

27 اگست تا 2 ستمبر 1998ء

ہفت روزہ ''حال'' کوئٹہ

''خدا کا لہجہ''

جاوید چوہدری کا جو کالم ''خدا کا لہجہ'' کے عنوان سے 24 مئی 1999ء کے ''جنگ'' اخبار میں شائع ہوا ہے کوئی ایسا قابل ذکر موضوع نہیں جس کو خوامخواہ اہمیت دی جائے۔ لیکن اس کالم میں چند لغو اور من گھڑت باتوں کا سہارا لیکر مکرانی (بلوچ) اور افغان خواتین کو بڑی فحش گالیاں دی گئیں ہیں جن کو دونوں بڑی قوموں کے بزرگوں اور نوجوانوں نے بہت سخت محسوس کیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ اس فضول کالم کے اخلاق سے گرے ہوئے ان نقاط کا جواب ضرور دیا جائے تا کہ اس قسم کے زرد صحافت کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

کالم نگار نے روسیوں کے نام کا سہارا لیکر بے گناہ بلوچ اور افغان خواتین کو فحش گالیوں کے ذریعہ اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوہدری صاحب کو ضرور کسی غیرت مند مکرانی یا افغان خاتون سے واسطہ پڑا ہے جن کو اپنے علاقے کے معیار پر نہ پا کر سیخ پا ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ''جنگ'' اخبار کے کرتا دھرتاؤں کو آخر کس نے تکلیف پہنچائی ہے کیونکہ یہ کالم اس قابل ہی نہ تھا کہ ''جنگ'' جیسے موقر جریدے میں ایسی جگہ چھپتا جہاں ملک کے مایہ ناز کالم نگاروں کو جگہ دی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میر شکیل الرحمٰن ابھی تک ''الرحمان'' کے خوف سے باہر نہیں نکلے اور محمود شام اس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں کہ ''جنگ'' کے ساتھ ساتھ اپنا ''معیار'' بھی کھو بیٹھے ہیں۔ ورنہ اس سے اچھے اچھے کالم اس صفحہ پر جگہ نہیں پا سکے ہیں۔

جاوید چوہدری صاحب نے بظاہر تو غرور و تکبر کو اپنا موضوع بنا کر یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ غرور و تکبر کو خدا معاف نہیں کرتا لیکن یہ ثابت کرتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ اس کا اپنا لہجہ یا انداز تحریر کس قدر متکبرانہ ہے۔ وہ بیک وقت مکرانیوں (بلوچوں) افغانوں، روسیوں، امریکہ، نصرت بھٹو بے نظیر بھٹو سے اپنے کالم کے ذریعہ سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے تمام اخلاقی اقدار اور صحافتی معیار سے اس قدر گر جاتے ہیں کہ ان کے اس کالم سے کوئی بھی عام قاری یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کالم نویس اس میدان میں طفل مکتب ہیں۔ لفافہ تو اس نے ضرور لیا ہے لیکن حق نمک ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ بلکہ الٹا ''جنگ'' اخبار کے ایک قیمتی صفحہ کے ایک قیمتی کونے کو ضائع کر دیا ہے اور اس کے دیرینہ قارئین کو اس قدر ناراض کیا ہے کہ ''جنگ'' اخبار کے صفحوں کو نذر آتش کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ (کیا خبر ''جنگ'' اخبار کی کیا کیا مجبوریاں ہیں)

روسیوں کا نام لیکر چوہدری صاحب انتہائی چھچھورے انداز سے مکرانی خواتین اور افغان ماؤں کو گالی دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی ایک ''چوہدری'' ہیں اور چوہدریوں کے بھی کچھ آداب رکھ رکھاؤ اور معیار ہوتے ہیں، ان کو اپنے اور دوسروں کے عزت و احترام کا سلیقہ آتا ہے بشرطیکہ وہ واقعی ایک اصلی اور جائز ''چوہدری'' ہو کیونکہ کوئی بھی کھرا اور سچا شخص ایسی بھونڈے مثالوں کے ساتھ

دوسروں کی ماں بہنوں کو کالم نویسی کی شوق میں ایسی فحش گالیاں نہیں دیتا اور وہ بھی ''خدا کا لہجہ'' کے عنوان سے۔

اگر کالم نویس کو حق نمک ادا کرتے ہوئے اپنی نفرت کا اظہار ہی کرنا تھا تو اس کے اور بھی مہذب طریقے ہو سکتے تھے۔ وہ یہ نازیبا حرکت روسیوں کا نام لئے بغیر اپنے مقامی طریقہ سے بھی کر سکتے تھے اور اس سے شاید اس کے دل کو بھی زیادہ ٹھنڈک پہنچتی (وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انہی حرکتوں کی وجہ سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا ہے) اس اوچھی حرکت کے لئے اس قدر بڑا جھوٹ گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔؟ کیونکہ سارے شریف پاکستانیوں (سوائے جاوید چوہدری) کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بیچارے مکرانی خواتین کے بدن میں نہ تو خون موجود ہے نہ خوشنو۔ وہ سارا دن مختلف فیکٹریوں اور کارخانوں میں محنت مزدوری کر کے دو وقت کی حلال روٹی مشکل سے کماتی ہیں۔ وہ اسلام آباد اور لاہور کی بیگمات کی طرح دن رات ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں نہیں سوتیں اور نہ ان کے والد بھائی اور الا دبڑے بڑے عہدوں پر فائز حرام اور رشوت کی کمائی پر پلتے ہیں۔ ان غریب عورتوں کے بدن میں اس قدر خوشبو (محنت کی خوشبو ضرور ہوگی) کہ روس ایک طرف افغانستان، صوبہ سرحد، سرسبز و شاداب، پنجاب اور سندھ کو روندتا ہوا فقط خوشبو سونگنے کے لئے کراچی پہنچ جاتا اور دوسری طرف قندھار، چمن، کوئٹہ، قلات، خضدار اور لسبیلہ کو لتاڑتا ہوا کراچی وارد ہو جاتا ہے۔ اگر اور جگہ نہیں کم از کم سرسبز شاداب پنجاب میں ان کو زیادہ صحت منداور خوشبودار جسم مل سکتے تھے۔ محض محنت کی خوشبو سونگنے کے لئے اس قدر فوج کشی کی کیا ضرورت ہے۔؟ ہمیں تو یہ باتیں لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن اس جعلی چوہدری نے مجبور کر دیا ہے۔ اس طرح چوہدری صاحب افغانوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے روسیوں کے حوالے سے افغان ماؤں کو یہ فحش گالی دیتے ہوئے بالکل نہیں شرماتے کہ ''اب افغان مائیں صدیوں تک سبز آنکھیں والے بچے پیدا کرتی رہیں گی''۔

اب اس نقلی چوہدری صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ افغان بچوں کی آنکھیں روسیوں کے آنے سے پہلے بھی سبز تھیں البتہ اب یہ سبز آنکھیں پنجاب میں بھی پھیلنی شروع ہو گئیں ہیں۔ بھلا تکبر اور غرور کے موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے اس قسم کے بھونڈے، لغو، من گھڑت اور واہیات مثالوں کی کیا ضرورت تھی؟۔ یہ تو ایک عام آدمی بلکہ دوسری جماعت کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ تکبر اور غرور کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ محض یہ بات منوانے کے لئے کالم نویس کو وعظ فرمانے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ خوامخواہ بے گناہ لوگوں کو گالم گلوچ دینے کی ضرورت تھی اور ''جنگ'' جیسے اخبار کو ایسی لغویات کو اپنے اخبار کی زینت بنانے کی ضرورت تھی۔

جاوید ہاشمی ایک پڑھے لکھے شریف انسان ہیں۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ایک صحیح موضوع کو ایک غلط آدمی کے سامنے زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ شاید ہاشمی صاحب کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس انتہائی اہم اور بین الاقوامی موضوع کو یہ طفل مکتب سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے کالم نویسی کے شوق میں گالیوں سے مزئین کر کے شائع کرائے گا اور ''جنگ'' جیسا اخبار بھی اس قدر مجبور ہوگا کہ اس جعلی چوہدری کی ساری لغویات کو چھاپ دے گا اور وہ بھی ''خدا کا لہجہ'' کے عنوان سے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جاوید ہاشمی

والا قصہ بھی کالم نویس کی ذہنی اختراع ہو مجھے تو کم از کم یہی گمان ہوتا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو جاوید ہاشمی صاحب کو چاہیے کہ اس کی وضاحت کریں تا کہ اس کے شریف دوستوں کو ہمارے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ امید ہے ہاشمی صاحب ایسے لوگوں سے آئندہ پرہیز فرمائیں گے۔

کیا ہی بہتر ہوتا اگر چوہدری صاحب بجائے غریب خواتین کو گالی دینے کی جرات کر کے اپنے پنجاب کے حکمرانوں کو روسیوں کے متکبرانہ طرز عمل اور انداز حکمرانی کے انجام سے آگاہ کرتے ہوئے یہ سمجھا دیتے کہ دوسرے چھوٹے صوبوں کے حقوق کو اس طرح متکبرانہ طریقے سے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں آ کر پامال نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے ہیرو بھی روسی جرنیلوں کی طرح بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائیں خدا نہ کرے کیونکہ متکبرانہ طرز حکمرانی کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند فرماتے ہیں۔

جہاں تک روسیوں یا امریکیوں کی بات ہے میرے خیال میں وہ دنیا کی ترقی یافتہ ترین اور مہذب قومیں ہیں۔ ان کو سیاسی اور سفارتی آداب کا اچھی طرح علم ہے۔ وہ ہماری طرح اس قدر ''اجڈ'' یا ''ڈھگے'' نہیں کہ کسی کو بازو سے پکڑ کر دھکہ دیں۔ کہیں کسی ڈپلومیٹ کے سامنے پاؤں میز پر رکھ کر بات کریں۔ کسی کو گالی دیں اور کسی کا گریبان پکڑیں۔ چوہدری صاحب خدا کا خوف کریں آپ نے تو حد کر دی ہے ذمہ دار لوگوں کے نام بھی لکھ دیئے صحافتی روایات اور صحافت کی دنیا میں بنڈل بازی کے بھی کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ آپ کو سیکھنے کے لئے ابھی بہت جتن کرنے پڑیں گے۔ آپ میں اگر ذرا سی بھی غیرت شرم حیاء نام کی کوئی چیز ہے تو فوری طور پر بلوچوں اور افغانوں سے معذرت کر لیں۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا آپ کو ایسا سفید جھوٹ بولنے لکھنے سے محفوظ رکھے۔ آمین

روزنامہ ''انتخاب'' حب

29 مئی 1999ء

بلوچستان کی قیادت۔۔۔۔ایک لمحہ فکریہ

موجودہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات وواقعات نے دنیا کی تمام زندہ قوموں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی بقاء کی فکر کریں بلکہ اس مسئلے کو تمام مسائل پر فوقیت دیں۔یہی وجہ ہے کہ کچھ دن پہلے روس اور عراق نے دنیا کی تمام آزاد اقوام سے ایک نئی صف بندی کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ متحدہ نہ ہوئے تو ان کی بقاء کو شدید خطرات لاحق ہیں۔یہ خدشات تو ان اقوام کو لاحق ہو گئیں ہیں جو آزاد اور خود مختار ہیں، اپنی اقتدار اعلیٰ رکھتی ہیں۔اپنے دفاع کی خود قدرت رکھتی ہیں اپنے وسائل پر خود قابض ہیں اور اپنی آزاد سرحدوں کے خود مالک ہیں معاشی طور پر اس قدر کمزور بھی نہیں ہیں کہ زندہ رہ نہ سکیں۔لیکن اس کے باوجود موجودہ ایٹمی اسلحہ اور جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں خدشات اور اندیشوں کے شکار ہیں۔اب ذرا تصور کیجئے ان اقوام کے بارے میں جو اوپر ذکر کئے ان تمام وسائل سے یکسر محروم ہیں۔یہ تو بڑی بات ہے بلکہ اس جدید ترقی یافتہ دور میں وہ بنیادی انسانی سہولتوں سے ناآشنا ہیں ان کی آبادی کی اکثریت آج بھی گھروں میں ''لالٹین'' اور چراغ جلا کر اپنی قسمت کے اندھیروں کو دور کرنے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہیں۔جدید ٹیکنالوجی تو دور کی بات ہے ان کو آج بھی اسکولوں میں ٹاٹ تک نصیب نہیں ان کے ہاں جدید رسل ورسائل کا تصور آج بھی ایک افسانے سے کم نہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسی قومیں آئندہ آنے والے دنوں میں Servive کر سکیں گی یا خدانخواستہ صفحہ ہستی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گی۔

یہ چند ایسے سوالات ہیں جن پر پہلے تو ہمیں بحیثیت ایک پاکستانی کے سوچنے کی ضرورت ہے اگر یہ سوچ وقت اور حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تو کم از کم بحیثیت بلوچ اور بلوچستانی ہمیں مجبوراً سوچنا پڑے گا اور اس اہم مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈنا پڑے گا ورنہ کہیں ہم تاریخ کا حصہ بن کر نہ رہ جائیں۔اصولاً تو کسی ملک کا وفادار ہونے کے لئے 52 سال یعنی نصف صدی بہت ہی لمبا عرصہ ہوتا ہے لیکن ہمارے ملک کی حکمرانوں کی خود غرضی اور عاقبت نااندیشوں کی وجہ سے کوئی بھی بلوچ آج تک اس معیار پر پورا نہ اتر سکا جس کی ذمہ داری براہ راست خود مختلف ادوار کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ ملک 1970 میں جن وجوہات وعوامل کی بنیاد پر دولخت ہوا وہی معروضی حالات آج بھی اسی طرح موجود ہیں ان کو سمجھنے اور سلجھانے کی کسی نے سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے۔گو کہ موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ہر پڑھے لکھے سنجیدہ شخص کی یہ دلی خواہش اور آرزو ہے کہ جو کچھ پاکستان کے نام پر بچا ہے وہ قائم ودائم رہے کیونکہ اس کی بقاء میں ہم سب کی بقاء اور سلامتی وابستہ ہے لیکن قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ سوچ یک طرفہ ہے کیونکہ اس ملک کے حکمران اور مقتدرہ قوتیں آج بھی اس ملک کی بقاء اور سلامتی کے لئے نہ سنجیدہ ہیں نہ مخلص کیونکہ ان کی تمام تر توانائیاں محض

اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے صرف ہوتی ہیں اس کے لئے چاہے ملک کی جڑیں بے شک کھوکھلی ہوتی چلی جائیں۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر نئے سرے سے ملکی وفاداری کو اپنی بقاء سے وابستہ کرتے ہوئے ملک کی مجموعی مفاد کی خاطر سوچنا شروع کر دیں تو بھی جو تلخ حقائق دائرے کی شکل بناتے ہوئے ہمارے سامنے موجود رہیں گے وہ بھی ان خدشات اور اندیشوں میں اضافہ کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے کہ کہیں ہمارے حکمران Disintegration کی طرف تو نہیں بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں نہ اسلامی نظام جس کا بہت زیادہ پرچار کیا جاتا ہے نافذ ہے نہ جمہوری نہ پارلیمانی طرز حکومت ہے نہ صدارتی، نہ صوبائی خودمختاری موجود ہے نہ مضبوط مرکزی نظام، نہ ووٹروں کے شریک اقتدار کا تصور موجود ہے نہ قانون کی حکمرانی نہ شفاف احتساب کا عمل نظر آتا ہے نہ عدل وانصاف اور عدل وانصاف کا یہ عالم ہے کہ عدل وانصاف کرنے والے خود اپنی دفاع نہیں کر سکتے ہیں۔ اوپر سے آئے روز عالمی مالیاتی اداروں کا دباؤ، معاشی ابتری، امن وامان کے ساتھ خودساختہ مسائل ڈاؤن سائزنگ۔ تمام ترقیاتی کام اور سارے ملکی وسائل کو ایک صوبے میں محدود رکھنا۔ وفاق کی اعلیٰ عہدوں پر غیر متوازن نمائندگی۔ صدر وزیراعظم کا ایک ہی صوبے سے تعلق، اہم فوجی اور سول بیوروکریسی پر ایک صوبے کی متواتر بالادستی یہ سب ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ موجودہ حکمران تو ملکی سالمیت کے بارے میں ذرا سا بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ حکمرانوں کو بھلا لگتا ہے لیکن اس کے بڑے دوررس بھیانک اثرات سے روگردانی کرنا خود اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کے مترادف ہے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ اکثر ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف صاحب مرکزی حکومت اور وزارت خارجہ کو خاطر میں لائے بغیر براہ راست امریکہ اور پینٹاگان سے مذاکرات کرتے ہیں اور اپنے صوبے کے لئے خود بین الاقوامی معاملات اور تجارتی معاہدے طے کرتے ہیں یہ اچھی بات ہے لیکن فقط ایک صوبے کے لئے کیوں؟ اگر یہی حرکت کوئی دوسرے صوبے کے وزیراعلیٰ کرے تو پوری دنیا کو سر پر اٹھایا جائے گا۔ اس دوھرے معیار کی موجودگی میں مہنگائی، بھوک افلاس، بے روزگاری، خودکشیاں اور خودسوزیوں کا ذکر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اس پس منظر میں محض سرمایہ داری نظام کے Servival of fitest والا فلسفہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی وہی زندہ رہ سکتا ہے جس کے پاس طاقت ہے یا وہ زندہ رہنے کے گر سے آشنا ہے۔ سادہ لفظوں میں وہ زندہ رہ سکتا ہے جو فٹ ہو سکے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس نظریہ کے مطابق بلوچستان کی موجودہ سیاسی قیادت فٹ ہے یا وہ اس دائرے سے کوسوں دور اپنے زخم چاٹنے میں لگا ہوا ہے۔ جہاں تک بلوچستان کے عوام کی بات ہے اس کا سیاسی رول ماضی کے حوالے سے بڑا مثبت اور شاندار رہا ہے۔ ہم اس تاریخی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ بلوچستان کی غریب قبائلی عوام، طلباء، کسان اور دانشور طبقے نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بلوچستان سے لیکر لیاری تک جمہوریت اور حقوق کی بحالی کی جنگ میں بے شمار قربانیاں دے کر ہمیشہ ہراول دستے کا رول ادا کیا ہے۔ حتیٰ کہ کئی فوجی آپریشنز کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور مختلف ادوار میں اپنی بقاء کی جنگ میں پیش پیش رہے ہیں۔ یہ جنگ چاہے ریاست قلات

کی بحالی کی جنگ ہو یا قبائلی سرداروں کی، بقول میر غوث بخش بزنجو ''Tribal upsurge''، نیپ (NAP) کی پلیٹ فارم سے شروع کی ہوئی سیاسی محاذ آرائی ہو یا ''بی ایس او'' کی قومی حق خودداریت کی جدوجہد، میدان کارزار ہو یا ووٹ کی طاقت کا استعمال غرض جس طرح بلوچستان کی سیاسی قیادت نے ان کو آواز دی وہ اس امید و توقع کے ساتھ کمربستہ اور صف آراء ہو کر میدان میں نکل آئے کہ جب ان کے قائدین فتح مند ہوں گے تو ان کی صدیوں پرانی پسماندگی اور بدحالی دور ہوگی وہ تمام تر داخلی اور خارجی استحصالی قوتوں سے محفوظ رہ سکیں گی اور ان کے لئے جدید ترقی یافتہ دور کی نئی راہیں کھلیں گی۔ ان کی آنے والی نسلیں روزگار اور چند ٹکٹوں کی خاطر دیار غیر کی خاک چھانے پر مجبور نہیں ہوں گے۔

لیکن دکھ اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ بلوچستان کی سیاسی قیادت کو جب بھی عوام کی مدد و تعاون سے کامیابی نصیب ہوئی، سوائے چند کے باقیوں نے ان کو ہمیشہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ میں بڑے معذرت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ سب سے زیادہ نیپ (NAP) کی سیاسی قیادت نے بلوچستان کے عوام کو مایوس کیا۔ 1970ء کے عام انتخابات میں بلوچستان کے ووٹرز نے نیپ (NAP) کو بھرپور مینڈیٹ دیا لیکن جناب سردار عطاء اللہ خان مینگل صاحب نے وزارت اعلیٰ سنبھالتے ہیں بیک وقت مرکزی حکومت اور اپنے دیرینہ ساتھیوں کے ساتھ محاذ آرائی شروع کی۔ حالانکہ اس وقت کے معروضی حالات اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے رہے تھے۔ علاقے کی مخصوص حالات اور معاشی معاشرتی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے ان کو بالغ نظری کا ثبوت دے کر اجتماعی مفادات کی خاطر وہی کرنا چاہے تھا جو انہوں نے 27 سال بعد 1997ء میں آ کر کیا۔ ان کو غیروں اور اپنوں سے ہر قسم کی محاذ آرائی ٹالنے کی مدبرانہ کوشش کرنی چاہے تھی کیونکہ ہر محاذ محض جنگ و جدل اور لشکر کشی سے نہیں جیتی جا سکتی۔ مختصراً یہ کہ نیپ کی بلوچستان کی قیادت نے وہ کچھ نہیں کیا جس کی عوام ان سے توقع رکھتی تھی بلکہ انہوں نے رندولاشار کی تاریخ کو دھراتے ہوئے ایک مرتبہ پھر بلوچستان کی بدقسمت عوام کو اجتماعی خودکشی کی طرف دھکیل کر تاریخ کو اس بدقسمت قوم کے مذاق اڑانے کا دانستہ یا نادانستہ موقع فراہم کیا اور یہ تاریخی قول سچ ثابت کر دکھایا کہ ''بلوچ قوم جنگی پسپائی کے حربے (Retreat tactics) سے ناواقف، مکئی کے خوشے کی طرح کٹ مرنے کو بہادری، سمجھتا ہے۔''

راقم کی اس تحریر کا مقصد کسی کی دل آزاری، بے جا تنقید، بلاوجہ کردار کشی یا اس کی سیاسی قد کاٹ کم کرنا نہیں بلکہ حقیقتاً بلوچستان کی عوام پر جو گزری جو مشاہدہ میں رہا راقم کی ہے تاکہ اگر ہو سکے تو ہم سب اپنی غلطیوں کا احساس کرتے ہوئے کسی اجتماعی سوچ کی طرف یکجا ہو سکیں۔

بلوچستان کے عوام کو ہم اس لئے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ انہوں نے ہم جیسے لوگوں کی مخالفت کے باوجود ایک مرتبہ پھر سردار عطاء اللہ مینگل اور اس کی عجلت میں بنائی ہوئی پارٹی ''بی این پی مینگل'' کو 1996ء کے حالیہ انتخابات میں ایک موقع اور دیا۔ لیکن انہوں نے پھر اس ڈگر پر چلتے ہوئے اپنے دیرینہ ساتھی نواب محمد اکبر بگٹی اور اپنے ایم پی اے، ووٹرز کو مایوس کیا۔ یعنی سردار صاحب کی ہمیشہ بیک

وقت اپنوں اور غیروں سے محاذ آرائی کی منطق ہمارے سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں یہاں یہ واضح کردوں کہ مجھ جیسے ناقص العقل کارکنوں نے نواب اکبر بگٹی کو بروقت آگاہ کردیا تھا لیکن نواب صاحب نے کسی کی پیش بندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سردار عطاءاللہ مینگل صاحب کی پارٹی کو حکومت دلانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہوئے سردار صاحب کو سابقہ تاریخی غلطیوں کو درست کرنے کا ایک بہترین موقع فراہم کیا لیکن افسوس صد افسوس! کہ ''بی این پی'' اور اس کی قیادت نے اپنے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دے کر ایک مرتبہ پھر بلوچستان اور اس کے معصوم عوام کو اندھیروں میں بھٹکنے پر مجبور کردیا۔ یہی ایک سنہرا موقع تھا جس میں دونوں بزرگ رہنما مل کر بے لگام حکمرانوں کو کچھ لگام دے کر بلوچستان کے لئے کچھ آئینی حقوق حاصل کرسکتے تھے۔ اب بار بار یہ کہہ کر عوام کو بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا کہ ہمارے خلاف سازش ہوئی ہے کیونکہ یہ عوام 1970ء کی عوام نہیں 1999ء کی عوام ہے اور سب کچھ ان کے آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بڑے سردار صاحب چھوٹے سردار صاحب اختر جان کو آزاد چھوڑتے تو حالات مختلف ہوسکتے تھے۔ بہرحال اب سوائے زخم چاٹنے اور ہر بے کار درخت (گز) کو اس امید کے ساتھ کہ شاید اس میں شہد کا جتہ ہو منہ مارنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

ہوسکتا ہے آپ کو ہمارے اس تجزیہ سے اختلاف ہو جس کا آپ کو پورا حق ہے لیکن اس حقیقت سے آپ کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ جو حالات اس وقت ہمارے سامنے ہیں ان میں سوائے مایوسی اور ناامیدی کے اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قوموں کی زندگی میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔ حالات کا جبر اپنوں اور غیروں کی سازشیں تاریخ کے حصہ ہیں۔ اجتماعی مفادات کی خاطر سہنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندہ قومیں حالات کے ساتھ اپنی انا کو مجروح کئے بغیر زندہ رہنے کا ڈھنگ اختیار کرتے ہیں بشرطیکہ اس کی قیادت مخلص اور ایماندار ہو۔ اجتماعی قیادت پر یقین رکھتا ہو۔ دانشمندی سے کام لے کر قبائلی، طبقاتی اور ذاتی مفاد وانا سے بالاتر ہوکر سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اب سوچنا اور سمجھنا یہ ہے کہ موجودہ پاکستان کے حکمران خدانخواستہ دانستہ یا نادانستہ طور پر Disintegration کی طرف جائیں یا کوئی مسیحا آکر اس ملک کو راہ راست پر چلائے دونوں صورتوں میں بلوچستان کو ایک مضبوط و فعال اور ایماندار سیاسی قیادت کی ضرورت ہے، جو من الحیث قوم اپنی بقاء کی جنگ لڑ سکے لیکن یہ اتنا آسان کام بھی نہیں ہے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ موجودہ سیاسی قیادت پر لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا ہے کیونکہ سارے بازوان کے آزمائے ہوئے ہیں۔

اس وقت بلوچستان کے عوام میں امید کی کوئی کرن باقی ہے تو وہ نواب محمد اکبر بگٹی ہیں جن کے سیاسی کردار کی اب بھی تعریف و توصیف کی جاتی ہے جن کا اب بھی شخصی اور قبائلی حوالے سے عزت ووقار باقی رہ گئی ہے اور جس میں ایسی منتشر اور مایوس قوم کو یکجا کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ ہم اپنی تمام ترقی پسندی اور روشن خیالی کے باوجود اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرسکتے کہ آج بھی بلوچستان کی سیاست پر قبائلی شخصیات کا اثر ورسوخ موجود ہے اور اس میں نیک ترین نام نواب محمد اکبر بگٹی کا باقی رہ گیا ہے جس میں یہ خاصیت موجود

ہے کہ بیک وقت قبائلی طاقت کے ساتھ ساتھ سیاسی قوتوں کو بھی متحرک کر سکتے ہیں۔ موجودہ معروضی حالات میں وہی ایک ایسی طاقتور شخصیت ہیں جو بلوچستان کے عوام میں یکساں مقبول ہیں اور عوام کی قیادت کر کے اپنی بقاء کی جنگ لڑ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ یہ سوچے بغیر کہ فلاں نواب یا فلاں سردار ناراض ہوگا، ڈیرہ بگٹی سے نکل کر کوہلو، کاہان، سراوان، جھالاوان، قلات، وڈھ، نال، چاغی، خاران، مکران، اور لسبیلہ کا ذاتی طور پر دورہ کریں اور ریاضی کی زبان میں قوم کو اس کی بقاء اور آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کریں۔ نواب محمد اکبر بگٹی میں اب بھی وہ دم خم موجود ہے کہ نہ صرف بلوچستان میں بلکہ سندھ اور پنجاب کے بلوچوں کو بھی وہ اپنے پُرکشش شخصیت کے گرد جمع کر کے جدجہد پر آمادہ کر سکتے ہیں اور ان میں یہ علم، تجربہ اور صلاحیت موجود ہے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

15 جون 1999ء

اکیسویں صدی کا گوادر شہر

آخر کار عظیم تر گوادر شہر اور ساحلی پٹی کی تعمیر و ترقی کا تصور نصف صدی بعد اعلانات سے نکل کر عملی شکل اختیار کرتے ہوئے اعداد و شمار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ معتبر پرنٹ میڈیا کے مطابق اس عظیم قومی منصوبے کی ضرورت اور اہمیت کو حکمران طبقہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اب یہ ان کی اپنی ضرورت بن چکی ہے۔ شاہین اور غوری ۲ کے آزمائشی تجربے نے بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے لیکن ان حقائق کے باوجود اب بھی کچھ عاقبت نا اندیش لوگوں کو یہ منصوبہ ایک افسانہ اور خواب سا لگتا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی بھی خود مختار پالیسی ساز ادارہ اپنا وجود نہیں رکھتا اس لئے جب حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں تو اس کے ساتھ قومی منصوبوں کی اولیت (Priority) بھی بدل جاتی ہیں، یقیناً ہمارے ملک کی بہت بڑی بدقسمتی رہی ہے جبکہ دوسری ترقی یافتہ ممالک میں اہم قومی منصوبوں کا کسی مخصوص سیاسی پارٹی کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں اور منصوبے چلتے رہتے ہیں، لیکن افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک کے حکمران حکومت میں آتے ہی دوسروں کو محبّ وطن ہونے کا درس دینا شروع کرتے ہیں۔ لیکن خود اس کا عملی مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ اس کلچر کو فروغ دینے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اب بھی عظیم تر گوادر شہر اور ساحلی پٹی کی تعمیر و ترقی کے اتنے بڑے منصوبے کو اندیشہ ہائے سود و زیاں کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیل سے پہلے بکھرنے کے خدشات کا اظہار کرتے ہیں۔

عظیم تر گوادر شہر یا ساحلی پٹی کی تعمیر و ترقی کا منصوبہ کوئی نیا منصوبہ نہیں ہے بلکہ ہر دور کے حکمرانوں نے اس کے متعلق بہت ہی سحر انگیز اعلانات فرمائے ہیں۔ 1958ء میں جب گوادر کو اس خدشے کے پیش نظر سلطنت مسقط عمان سے خرید کر پاکستان میں شامل کیا گیا کہ مبادا ہندوستان گوادر سے کوئی فوجی اہمیت کا حکمت عملی ترتیب دے کر فائدہ نہ اٹھائے اس وقت بھی جنرل ایوب خان اور اس کے پالیسی سازوں کے اعلانات بھی یہی تھے کہ گوادر کو فری پورٹ بنا کر (موجودہ دبئی کی طرز پر) ایک اہم بین الاقوامی تجارتی شہر کے طور پر ترقی دی جائے گی لیکن یہ سب کچھ محض اعلانات کی حد تک محدود رہا، یاد رہے کہ اس وقت دبئی گوادر سے زیادہ پسماندہ علاقہ تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آج دبئی دنیا کا عظیم ترین بین الاقوامی تجارت کا مرکز (World trade centre) بن چکا ہے جبکہ گوادر میں ابھی تک لوگوں کو پینے کا پانی تک میسر نہیں ہے، لیکن دبئی نے اس تیز رفتار ترقی کا سامنا اپنے مقامی باشندوں کو آئینی طور پر مکمل معاشی اور معاشرتی تحفظ دے کر کیا اور آج وہاں کے مقامی باشندے اس تیز رفتار ترقی کا لازمی جز بن چکے ہیں۔

سب سے پہلی مرتبہ گوادر پورٹ کی تعمیر و ترقی کے پروجیکٹ پر عملی کام کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اس اعلان کے ساتھ شروع ہوا کہ ''یہ ایک اقتصادی پروجیکٹ ہوگا جو اس علاقے کی معاشی، اقتصادی اور سماجی بدحالی اور پسماندگی کو دور کر کے بلوچستان کو ملک

کے دوسرے صوبوں کے برابر لانے میں مددگار ثابت ہوگا، اس کی تکمیل سے یہاں کے لوگوں کے لئے کاروبار اور روزگار کے بے شمار مواقع پیدا ہوں گے۔'' اس اعلان کے ساتھ ہی ابتدائی سروے کا کام شروع ہوگیا، رہائشی علاقہ اور موجودہ ہاربر روڈ کی لے آؤٹ تیار ہوئی رہائشی مکانات اور سنگل روڈ کی بنیاد بھی رکھی گئی لیکن اس وقت کے پروجیکٹ انجینئر زمجتبیٰ اور کچھ یار لوگوں نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور یوں یہ منصوبہ اپنے ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکی، مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد ان ہی کھنڈرات پر موجود منی پورٹ اور فش ہاربر بمعہ اس کے رہائشی مکانات کی تعمیر بلجیئم کے فنڈز سے مکمل ہوا جس میں پانچ سو ٹن سے لے کر آٹھ سو ٹن تک کی کارگو لانچیں آسکتی ہیں، واضح ہو کہ موجودہ منی پورٹ تکمیل کے بعد ابھی تک پروجیکٹ کہلاتا ہے اور اس میں مقامی باشندے آج تک روزانہ اجرت پر کام کر رہے ہیں۔

موجودہ حکمرانوں کو گوادر ڈیپ سی پورٹ اور ساحلی شاہراہ کی اہمیت کا احساس پہلی مرتبہ 1988ء میں اس وقت ہوا جب محمد نواز شریف صاحب پنجاب کے قوم پرست سیاستدان کے طور پر الیکشن جیت کر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے جبکہ اس وقت مرکز اور سندھ میں پی پی پی کی حکومت تھی، اتفاق فاؤنڈری کے اسکریپ سے بھرا جو نھاتن جہاز جب کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو اس وقت پی پی پی کی حکومت نے اس جہاز کو تین مہینے تک اسکریپ اتارنے کی اجازت نہ دے کر نواز شریف اور اس کے خاندان کو لاکھوں ڈالر کا نقصان پہنچایا، تب سے شریف خاندان کو ایک متبادل پورٹ کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا اور جب 1990ء میں محمد نواز شریف صاحب ملک کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے گوادر ڈیپ سی پورٹ اور ساحلی شاہراہ کی تعمیر و ترقی کا بڑے زور و شور سے عندیہ دیا لیکن یہ بھی کچھ سرسری اعلانات سے آگے نہ بڑھ سکا اور جب اس کی حکومت ختم ہوئی تو حسب معمول یہ منصوبہ سرد خانے کی نذر ہوگیا۔

جب بے نظیر بھٹو کی پی پی پی حکومت دوبارہ برسر اقتدار آئی تو انہوں نے 1996ء میں وزارت مواصلات کی زیر نگرانی کے پی ٹی کے ماہرین پر مشتمل ایک با اختیار عمل درآمدی سیل (Implementation cell) تشکیل دے کر گوادر ڈیپ سی پورٹ کے منصوبے کا اعلان کیا اس دوران میں نے ''گوادر ڈیپ سی پورٹ'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا جو 21 جون 1996ء کے ''جنگ'' کراچی کے ایک اہم صفحہ پر شائع ہوا جس میں، میں نے گوادر ڈیپ سی پورٹ سے متعلق مقامی آبادی کے خدشات کے ساتھ ساتھ اس اہم قومی منصوبے کے قابل عمل ہونے کے لئے چند تجاویز پیش کئے تھے جن کو تمام سنجیدہ لوگوں نے سراہتے ہوئے ان کو بروقت اور معقول قرار دیا تھا لیکن ان پر عمل درآمد ہونے سے پہلے اس عمل درآمدی سیل کا کام بھی پہلے کی طرح محض چند اعلانات سے آگے نہ بڑھ سکا اور ایک مرتبہ پھر یہ اہم قومی منصوبہ اس افواہ کے ساتھ ختم ہوا کہ سندھ کی قوم پرست تنظیمیں بشمول آصف زرداری اس منصوبے کے خلاف ہیں اور یہ رقم سندھ کے ''کیٹی بندرگاہ'' پر خرچ کرنے پر زور دے رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اب (شاید) یہ اہم قومی منصوبہ خود حکمرانوں کے توقعات اور ملک کی دفاعی ضرورت کے پیش نظر ناگزیر بن چکا ہے لیکن ہم بحیثیت ایک ادنیٰ شہری کے فقط یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ خدارا اس کو ایک قومی اہمیت کے منصوبے

کے طور پر شروع کیا جائے اور اس کو شروع کرنے سے پہلے اس علاقے کے عوام کو بالخصوص اور بلوچستان کے عوام کو بالعموم یہ عملی احساس دلایا جائے کہ یہ منصوبہ محض چند مفاد پرست سرمایہ داروں کے مفاد میں نہیں ہے بلکہ اس سے مجموعی طور پر وہاں کے باشندوں اور پورے ملک کو فائدہ ہوگا لیکن محض اعلانات سے کام نہیں چلے گا اس کے لئے عملی کام کا آغاز کرنا ہوگا جن میں ہماری چند تجاویز ہماری ناقص رائے کے مطابق یہ ہوں گے۔

۱۔ اگر کسی مقامی باشندے کی رہائشی تجارتی یا زرعی زمین پورٹ اور ساحلی شاہراہ کے ماسٹر پلان میں آرہی ہو تو اس کو اس کے زمین کا معاوضہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید تعمیر ہونے والی بستی میں تجارتی یا رہائشی متبادل زمین مفت فراہم کی جائے تاکہ وہاں کے مقامی باشندے بے دخل ہونے سے بچ سکیں۔

۲۔ مقامی باشندوں کو معاشی اور معاشرتی تحفظ کی خاطر کسی بھی کاروبار یا تجارتی لائسنس حاصل کرنے میں اولیت دی جائے تاکہ باہر سے آیا ہوا کوئی بھی شخص ان کے توسط سے کاروبار شروع کرسکیں۔

۳۔ گوادر ضلع، مکران ڈویژن اور بلوچستان کے انجینئرز کو بالترتیب اولیت دے کر مجوزہ منصوبے میں ملازمت فراہم کی جائے تاکہ وہ اس قومی نوعیت کے اہم منصوبے کا حصہ بن سکیں۔

۴۔ پورٹ کو چلانے کے لئے گوادر میں سی مین اور مرچنٹ نیوی آفیسرز ٹریننگ اکیڈمی کا قیام فوری طور پر عمل میں لایا جائے تاکہ مقامی باشندے ضروری ٹیکنیکل ٹریننگ حاصل کرکے آئندہ آنے والے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکیں، لیکن یہ اکیڈمی پورٹ کے منصوبے کو شروع کرنے سے پہلے کھولی جائے۔

۵۔ قومی شناختی کارڈ کے رجسٹریشن آفس میں مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے تاکہ جعلی شناختی کارڈ بنانے کا خدشہ کم سے کم ہوسکے۔

۶۔ ایکسپورٹ پروموشن بیورو کا دفتر فوری طور پر گوادر میں کھولا جائے تاکہ مقامی کاروباری لوگوں کو ایکسپورٹ ایمپورٹ کے متعلق تمام ضروری اور بنیادی تربیت حاصل ہوسکے۔

۷۔ موجودہ گوادر اور پسنی منی پورٹ کے لئے ایکسپورٹ ایمپورٹ سے متعلق واضح پالیسی کا اعلان کیا جائے اور ساحلی شاہراہ کی تعمیر تک کسٹم ایمپورٹ ٹیرف میں 30 فیصد چھوٹ دی جائے تاکہ غیر قانونی تجارت کی حوصلہ شکنی ہوسکے اور ان علاقوں میں ابھی سے ٹیکس کلچر کو فروغ مل سکے اس اقدام سے پورٹس اور کسٹم کی مالیہ میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔

۸۔ گوادر، پسنی اور تربت ائیر ہورٹس پر ایکسپورٹ فریٹ یونٹ (EFU) کی سہولت فراہم کی جائے تاکہ مقامی تاجر ابھی سے زیادہ مچھلی اور کھجور وغیرہ وہاں سے براہ راست خلیجی ممالک کو ایکسپورٹ کرکے ایک باعزت روزگار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے لئے قیمتی زرمبادلہ کما سکیں۔

۹۔ ساحلی شاہراہ یا کوسٹل روڈ کی تعمیر کا آغاز کراچی اور ماڑہ کے ساتھ ساتھ گبد جیونی سے بھی کی جائے تا کہ کم سے کم مدت میں یہ اہم قومی شاہراہ پایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔

۱۰۔ موجودہ گوادر منی پورٹ اور فش ہاربر کے مقامی ملازمین کو فوری طور پر مستقل کیا جائے تا کہ مقامی لوگوں کے روزگار کے عدم تحفظ کے خدشات دور ہو سکیں۔

ہم ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ اوپر دیئے ہوئے تجاویزات پر عمل کر کے ہم اس اہم قومی منصوبے سے وہ مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں جن کی آس لگائے یہاں کے مقامی لوگوں نے نصف صدی تک انتظار کیا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس منصوبے پر کام کے آغاز سے پہلے ہماری صوبائی حکومت اور مقامی ایم پی اے مرکزی حکومت سے ان تجاویزات پر عمل درآمد کی ضمانت حاصل کریں تا کہ عظیم تر گوادر شہر کو بنانے میں مقامی لوگ بھی دل و جان سے شریک ہو سکیں، مقامی، سیاسی قیادت اور عوام سے بھی ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ اپنے اپنے گروہی سیاسی مفادات سے بالاتر ہو کر اس اہم قومی منصوبے میں شامل ہونے کا اپنے آپ کو اہل ثابت کرنے کے لئے مل کر سنجیدہ جدوجہد کریں تا کہ آنے والی اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جا سکے وگرنہ ان کا حشر کراچی کے قدیم باشندوں سے بھی زیادہ بدتر ہوگا۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

19 ستمبر 1999ء

جنرل صاحب دیر نہ کیجئے!

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم اور ہمارے جیسے لاکھوں لوگوں نے اس مملکت خداداد پاکستان کو سازشوں کی آماجگاہ مصائب و مشکلات میں گھرا ہوا پایا ہے۔ بانی پاکستان کی جدوجہد آزادی اور اس کے بعد پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے وزارت عظمیٰ کے ادوار کا ہمیں اس لئے ادراک نہیں کہ اُس وقت ہم شعور کی منزلوں سے بہت دور تھے البتہ اس قدر علم ضرور رکھتے ہیں کہ اس مملکت خداداد پاکستان کی سیاست کی ابتداء اس کے پہلے وزیراعظم کے قتل سے ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ وزیراعظم کے قاتل کا خاتمہ بھی اس صفائی سے کیا گیا کہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'' کیس داخل دفتر اور سازشوں کے لامتناعی سلسلہ کا آغاز جو آج تک جاری وساری ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس مملکت کے وزیراعظم کے قاتلوں کا سراغ نہ ملے تو پھر عوام الناس کا کیا بنے گا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک نہیں جس میں ایسی سازشیں، بداعمالیاں، کرپشن، آئین ومروجہ قوانین واصولوں سے انحراف یہاں سے ہر دور کے حکمرانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے بلکہ دنیا میں اور بھی ایسے ممالک ہیں جن کو یہ عمرانی اور معاشرتی امراض لاحق ہیں لیکن دنیا میں ایسا شاید کوئی ملک نہیں ہوگا جس کے حکمران تمام خامیوں کے باوجود اپنے ملک سرزمین اور اس کے عوام سے اس قدر لاتعلق بے اعتناء، غیر سنجیدہ اور غیر مخلص ہوں گے۔ جس قدر ہمارے حکمران رہے ہیں۔ اور اگر ہمارے کسی حکمران نے غلطی سے بھی مخلص، سنجیدہ اور محبّ وطن ہونے کی کوشش کی ہے تو اس کو ایسی عبرتناک سزا دی گئی ہے کہ اس کی نسل درنسل اس سزا کو یاد رکھنے پر مجبور ہے۔ جیسے لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، خواجہ ناظم الدین، ذوالفقار علی بھٹو، محمد خان جونیجو اور بہت سے ایسے لوگ یا اہل کار جنہوں نے اخلاص اور ایمانداری سے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کی غلطی کی ہوگی۔

ہماری ان تمام سازشوں، بداعمالیوں، ڈوغلا پن، بے ایمانیوں اور ناشکر گزاریوں کی ہمیں ایسی سزا ملی کہ یہ مملکت خداداد دولخت ہوگیا۔ قائداعظم کا پاکستان شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ پٹ سن کا سنہرا ریشہ پیدا کرنے والا مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوکر بنگلہ دیش بن گیا اور ہمارے سازشی حکمران منہ دیکھتے رہ گئے، نہ صرف یہ بلکہ پوری قوم بمعہ مسلح افواج کے ایک ذلت آمیز تاریخی شکست سے دوچار ہوئے جن کے اسباب وعوامل کا آج تک قوم کو علم نہ ہوسکا اور نہ حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ کو شائع ہونے دیا گیا۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس مملکت کے قاتلوں کا سراغ نہ ملے تو اس مملکت اور اس میں بسنے والے لوگوں کا کیا بنے گا۔؟

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس تاریخی جرم کے اسباب وعوامل سے پوری قوم آشنا ہوتی اور اس کے بعد ہمارے آنے والے حکمران ہوش کے ناخن لے کر اس بچے کھچے پاکستان کو اپنی فہم وفراست سے ایک مثالی مملکت بناتے، اس کو ہمیشہ کے لئے سازشوں، بداعمالیوں،

دوغلا پن، اور بے ایمانیوں سے پاک کر کے ایسا مہذب، جمہوری، شفاف، لیک پروف خود کار بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتے جو مضبوط مستحکم اور مربوط رہتا تا کہ کوئی بھی حکمران برسر اقتدار آنے کے بعد ہمیشہ اس خود کا سسٹم کی گرفت میں رہ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوتا کہ وہ حکمران رہے یا نہ رہے لیکن اس ملک کو رہنا ہے، اس کو یہ خوف رہتا کہ اس ملک کے آئین، اصولوں اور مروجہ قوانین سے روگردانی اس کے لئے شدید ذلت اور ندامت کا باعث بنے گا اور وہ نہ صرف دنیا کی نظروں سے گر جائے گا بلکہ خود اپنی نظروں سے گر کر سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا ۔لیکن افسوس صد افسوس کہ اس تاریخی سانحے کے بعد بھی ہمارے سیاست دان مقتدرہ قوتیں روحانی اور مذہبی پیشواء، عدالتوں میں فائز جج صاحباں، ماہر عمرانیات، دانشور، عالم و فاضل فہم و فراست رکھنے والے وکلاء و بیرسٹر، ٹیکنو کریٹ مسلح افواج کے نظم و ضبط رکھنے والے سربراہ اور پالیسی ساز حکمران یہ سب کرنے میں بری طرح ناکام رہے جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مملکت خداداد پاکستان 1973ء کے آئین کی شق نمبر ٦ کے باوجود ایک مرتبہ پھر سازشوں کا گڑھ بن کر تیسری مرتبہ مارشل لاء کے گرداب میں پھس گیا جس کی سزا ہم آج تک بھگت رہے ہیں جس مملکت کے متفقہ آئین کو اس طرح پامال کیا جائے اس مملکت اور اس کے عوام کو کون تحفظ دے گا۔؟

اگر ہم اپنے ملک کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت منہ کھولے ہماری اس بدقسمتی کا مذاق اڑائے گی کہ متحدہ پاکستان ہو یا منقسم پاکستان سوائے ذوالفقار علی بھٹو کے جس کی علمی اور سیاسی قابلیت تمام تر اختلافات کے باوجود مسلم تھی باقی جو بھی متبادل قیادت (Replacement) آئی ہے وہ بد سے بدتر ثابت ہوئی ہے جس کا ڈراپ سین نواز شریف پر آ کر ہوا ہے۔لیکن ایک قدر تقریباً سب میں مشترک ہے کہ کوئی بھی مروجہ جمہوری آئینی طریقہ سے ہٹایا نہیں گیا اور نہ کوئی شرافت اور مہذب طریقے سے خود دست بردار ہوا ہے۔ ان کو یا تو دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا یا زبردستی گھسیٹ کر باہر یا جیل میں پھینک دیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اکثر و بیشتر یہ ناخوشگوار کام مسلح افواج کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔کبھی اس کو ایوب خان اور ضیاء الحق کی شکل میں غاصب بن کر آنا پڑتا ہے اور کبھی جنرل مشرف کے روپ میں نجات دہندہ بن کر ٹیک اوور (Take over) کرنا پڑتا ہے۔دونوں صورتوں میں ایک بات اٹل حقیقت ہے کہ اس بار بار کی مداخلت سے نہ صرف مسلح افواج کا امیج متاثر ہوا ہے بلکہ معاشرے میں سیاست کا فطری تاریخی عمل بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔جس کے نتیجے میں ایک زبردست سیاسی خلا پیدا ہوتا ہے جو یا تو معاشرے کو انارکی کی طرف لے جاتا ہے یا پھر اس خلا کو اکثر غیر سیاسی، خودرو، کم فہم، غیر سنجیدہ، نیم پڑھا لکھا اور سیاسی شعور و پختگی سے عاری لوگ پُر کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور ایسا کوئی شخص جو ایک مستحکم درست سیاسی نظام میں شاید کسی میٹروپولیٹن ادارے کا ممبر تک منتخب نہ ہو سکے جب پورے ملک کا چیف ایگزیکٹو (وزیر اعظم) بن جاتا ہے تو پھر ایسی حادثاتی شخصیت سے یہ توقع کیسے کی جاتی ہے کہ وہ ملک کو ایک شفاف مہذب جمہوری نظام سے آشنا کر سکے گا۔جو شخص اس کے خاندان کے افراد دوست و احباب رشوت اور کمیشن کے بل بوتے پر صنعت کار اور سیاست کار بن جائیں تو وہ شخص وزیر اعظم بن کر ملک کو کیسے ایک پاک و شفاف انتظامیہ یا قانون و آئین کی بالادستی پر مشتمل مہذب معاشرے کی بنیاد فراہم کرنے کے لئے قانون سازی کر سکے گا۔

اب اس مرحلے پر یہ بحث بیکار ہے کہ نواز شریف جیسے لیڈر کو اس قدر اہم عہدے پر پہنچانے کے جرم میں جہاں مسلح افواج کے پالیسی ساز ملوث ہیں وہاں ملک کے نامور سیاست دان، سیاسی پارٹیاں، بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار بھی برابر کے شریک ہیں۔ آخر کار یہ غیر فطری عمل اپنے منطقی انجام تک پہنچ گیا لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ملک میں ایک مرتبہ پھر حادثاتی طور پر کیوں نہ ہو، سیاست کا فطری عمل رک سا گیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کب تک رکا رہے گا۔ لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ سیاست کے اس فطری اور تاریخی عمل کی رکاوٹ کی وجہ سے پھر کوئی نواز شریف یا اس سے بھی بدتر متبادل غیر سیاسی قیادت اس خلا کو پُر نہیں کرے گا جس کو نیچے گھسیٹنے کے لئے پھر مسلح افواج کو مداخلت کرنے پر مجبور ہونا پڑے۔

موجودہ حکمرانوں کی نیت پر شک کرنا یا ان کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا لیکن اتنا ہم ضرور عرض کرتے چلیں کہ موجودہ حکمرانوں کے احکامات پر عمل درآمد کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سابقہ حکمرانوں کے تمام غیر قانونی سرگرمیوں میں بری طرح ملوث رہے ہیں اس لئے وہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے جن کا اعلان یا وعدہ موجودہ فوجی حکمران کر چکے ہیں چاہئے وہ اپنے مقاصد میں کس قدر مخلص اور ایماندار کیوں نہ ہوں ملک اور عوام سے کتنے ہی محبت نہ کرتے ہوں۔ مخلص اور ایماندار انتظامی ڈھانچہ کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کی وہ توقعات پورے نہیں ہوں گی جو انہوں نے موجودہ حکمرانوں سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ پاکستان اسلام آباد، لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ کا نام نہیں، پاکستان ان دور دراز علاقوں میں بسنے والے ان کروڑوں انسانوں کا نام ہے جن کی اکثریت انتہائی کسمپرسی پسماندگی، جہالت، بیماریوں کا شکار تمام تر انسانی بنیادی سہولتوں اور حقوق سے محروم زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ مختلف اداروں اور ایجنسیوں کی گرفت میں ہیں ان کو قدم قدم پر معمولی کاموں کے لئے سفارش یا رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ ستم زدہ روزانہ مختلف اداروں کی زد میں مصائب الام کے شکار ہیں۔ کیا ان کو موجودہ انتظامی ڈھانچے کی موجودگی میں کوئی یہ عملی احساس دلا سکتا ہے کہ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں کیا ان کروڑوں انسانوں کو یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ قانون کے مطابق زندگی گزارنا چاہیں تو اس کو پولیس، انتظامیہ، ایف سی، کسٹم، کوسٹ گارڈ انکم ٹیکس، ایکسائز، پٹواری، واپڈا، ٹیلی فون، گیس پانی وغیرہ کے محکموں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بغیر رشوت اور سفارش کے اس کے سارے کام ہوں گے اور اسے عزت واحترام سے یہ لوگ پیش آئیں گے۔؟؟؟؟ میری ناقص رائے میں موجودہ حالات میں یہ سب اگر نا ممکن نہیں تو مشکل بہت ہے جس کا تجربہ ہم قرض نا ہندگان کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں جوں جوں وقت گزرتا جاتا جائے گا ۔ ایفائے عہد موجودہ انتظامیہ مشینری کی موجودگی میں کمزور پڑتے جائیں گے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ مایوس ہو کر اس سابقہ حکمران کو موجودہ حکمرانوں سے بہتر اور مظلوم سمجھنے لگیں گے جس کو اس کی غیر قانونی سرگرمیوں اور کرپشن کی وجہ سے ہٹایا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کب تک اس قسم کے تجربات کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور مسلح افواج کو بار بار مداخلت کا یہ ناخوشگوار کام کب تک کرنا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی عسکری صلاحیتیں متاثر ہوتی رہیں گی۔ اس لئے ہمارا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ جنرل پرویز

مشرف صاحب سب کچھ چھوڑ کر اس جمہوری نظام کے متعلق اپنے تھینک ٹینک کو سوچنے پر مجبور کریں جس کا خاکہ اس کے ذہن میں ہے کہ جمہوریت کو معاشرے کی نچلی سطح تک ایسے مضبوط اور مستحکم کیا جائے تا کہ لوگوں کو شریک اقتدار کا عملی احساس ہو سکے۔ لیکن اس میں بدنیتی کی کوئی بھی گنجائش نہ ہو کیونکہ ایوب خان کے بنیادی جمہوریت کا تجربہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ جہاں تک اس شفاف، جمہوری مہذب خودکار سسٹم کی بات ہے جس کا ہم پہلے (اوپر) ذکر کر چکے ہیں جو ایک ایسا ادارہ جس سے ہٹ کر کوئی بھی حکمران احکامات جاری نہ کر سکے اور حکمران اس کے سامنے جوابدہ ہوں تو یہ اختیار کسی غیر منتخب سیکورٹی کونسل کو سونپنے کے بجائے اگر ''سینیٹ آف پاکستان'' کو سونپ دیا جائے تو ہو سکتا ہے ہم کچھ بہتری کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ کیونکہ ''سینیٹ آف پاکستان'' ایک منتخب ادارہ ہے جس میں تمام صوبوں کے نمائندے برابری کی بنیاد پر موجود ہیں۔ اس ڈھانچہ کے لئے ''سینیٹ'' سے قانون سازی کی جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں جنرل پرویز مشرف صاحب کو چاروں صوبوں کے قدآور، مخلص، نیک نام اچھی شہرت رکھنے والے کہنہ مشق سیاست دانوں سے رابطہ کر کے انتہائی اخلاص کے ساتھ رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہئے تا کہ ہم رفتہ رفتہ سیاست کے اس فطری عمل کی وقتی رکاوٹ کو دور کر سکیں جس سے ہمیشہ سیاسی خلا پیدا ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ یہی اس وقت ملک کے بہترین مفاد میں ہے۔ جنرل صاحب دیر نہ کیجئے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

23 اکتوبر 1999ء

ساحل فروشی

''وش نیتکانی ردیں کارانت کہ سروں رھن انت انگت
تاں نہ موکان ئے میاری چوٹواں رنداں چتوز''

شاعر ساحل نے یہ بات نہ معلوم 1955ء یا 1958ء یا اس کے بعد کہی ہے لیکن شاعر ساحل اس قدر تنگ نظر نہ تھا جس قدر شاعر مکران یا شاعر بلوچستان اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ:

''شال پیسر سگار ءِ ھرجان ات
دیناں بے سیتا گنجیں گوادر شت''

مجھے آج بھی یاد ہے شاعر ساحل ''سید ظہور شاہ ہاشمی'' زندگی کے زہر ہلال پی پی کر تنگ آ گئے تھے تو انہوں نے زندگی سے منہ موڑ لیا تھا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اس دن بلوچستان کے تقریباً سارے بڑے قوم پرست سیاسی رہنما عطا اللہ مینگل، میر غوث بخش بزنجو، سیاسی شاعر میر گل خان نصیر اور جنرل شیروف یعنی شیر محمد مری سب کے سب کراچی میں موجود تھے لیکن سوائے شیر محمد مری کے جو معراج محمد خان کے ساتھ غریب شاعر کی فاتحہ خوانی کے لئے آئے تھے اور کوئی نہیں آیا۔ کرب، دکھ، پریشانیاں، زندگی بھر کا درد، درد بلوچستان، درد ساحل، در در کی ٹھوکریں، شیگان، پیگور، اپنوں کے طنز جو زہر بھرے نشتر سے کم نہیں تھے۔ لیکن No compromise ڈھیٹ اس قدر ڈھیٹ کہ جان جائے وچھن نہ جائے۔ یہ تو راجپوتوں کا دھرم پرم پرا ہے۔ نہ جانے امان صاحب اس غریب شاعر ساحل کو کیسے بھول گئے جس نے ساری زندگی نہ صرف ساحل کی دفاع کی بلکہ پورے بلوچ قوم کے لئے زبان بے زبان قوم کی زبان تخلیق کرتے رہے۔ امان صاحب اس کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہے جب کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جو مجھے خود آپ نے کہا تھا کہ بلوچ قوم پرست سورماؤں کے بارے میں پہلی مرتبہ آپ کی آنکھیں سید ظہور شاہ ہاشمی نے یہ کہہ کر کھولی تھیں کہ ''یہ لوگ بلوچستان کے سیاسی جدوجہد کے بارے میں اس قدر سنجیدہ نہیں ہیں جس قدر آپ لوگ سمجھتے ہیں۔''

اب رہی بات ساحل فروشی کی، سر فروشی اور ضمیر فروشی کی اب شاید یہ سب کچھ بزنس کے حصہ ہیں۔ اب یہ اس قدر سخت لگنے والی گالی نہیں جس قدر یہ چند سال پہلے لگتی تھیں۔ اب تو ہر چیز برائے فروخت ہے، منڈی سجی ہوئی بولیاں لگ رہی ہیں، اب یہ اچھے سیلز مین کا کمال ہے کہ وہ چیز کو کیسے سیل کرتا ہے خاص کر گوادر کا نیا دی 1958ء کے بعد ایک مرتبہ پھر بارونق ہو گیا ہے، ۲ جون کو عوامی جمہوریہ چین کا ایک لمبا چوڑا وفد گوادر کا دورہ کر کے گیا، ۹ جون کو پھر ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد دورہ کر رہا ہے آج ۴ جون کو سلطنت آف عمان (مسقط) کا ایک سرکاری

وفد گوادر پہنچ رہا ہے جو کہا جا رہا ہے کہ یہ صوبائی حکومت کے مہمان ہونگے۔ مرکزی حکومت عوامی جمہوریہ کا استقبال کر رہی ہے اور صوبائی حکومت سلطنت عمان کے وفود کا۔ غریب ماہی گیر دکاندار، چاپڑی، ریڑی، گدھا گاڑی والے مقامی سیاسی رہنما، کارکن، مذہبی رہنما غرض ہر شخص حیران و پریشان، شہر گذشتہ دو مہینوں سے بجلی جیسی معمولی سہولت سے محروم لیکن شہر اور گردونواح کی اہمیت بین الاقوامی بلکہ یار لوگ تو اس حد تک تبصرہ کرنے لگے ہیں کہ آئندہ تیسری عالمی جنگ کا آغاز گوادر سے ہوگا کیونکہ بقول تبصرہ نگاروں کے چین کوئی روس نہیں کہ ملاؤں کے ہاتھ شکست کھا کے بھاگ جائے مرکزی حکومت نے جو احسان ساحل پر ڈیپ سی فشنگ کے لائسنس منسوخ کر کے کیا تھا وہ بھی واپس لے لیا اور پھر کورین، چائنا اور دوسرے جدید آلات سے لیس بڑے بڑے ٹرالرز کو ۳۵ میل سے باہر فشنگ کی اجازت دے رہی ہے حالانکہ سمندری حیات کے ماہرین کو علم ہے کہ اگر ۳۵ میل کے اندر مچھلیاں ہوتیں تو ہماری ماہی گیر لانچیں سومالیہ اور مسقط سلالہ تک نہ جاتیں۔ ظاہر ہے یہ محض لوگوں کو بے وقوف بنانے والی بات ہے یہ ٹرالرز ۳۵ میل سے حدود میں آ کر ماہی گیری کریں گے ہم نے قیمت جو وصول کی ہے جو چیز پیسوں سے آسانی سے مل جائے اس کے لئے پرتگالیوں کی طرح بحری قزاق بننے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن شاید امان صاحب اب بھی فکری طور پر جوان ہیں کہ کاش یہ بحری قزاق بن کر آتے۔ میدان جنگ، سورماؤں کی بھڑک، جان پر کھیلنے والا حمل جیھند یا جن کا ذکر امان نے کیا ہے اور نہیں تو ایک باقی بلوچ ہوتے کسی فورم میں چیختے چلاتے کہیں سوٹ فائل کرتے جواب میں گولیاں کھاتے۔ تب رعایا بننے یا غلام بننے کا مزہ آتا۔ اب تو نقشہ ہی مختلف ہے۔ سرکس لگا ہوا ہے جو جوکر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ (Entertainment) تفریح مہیا کرے وہی قابض یا دلال اب تو کچھ سمجھ نہیں آتا، ظاہراً کچھ نہیں اندر اندر ایک لڑائی شاید اسی کو (Cold war) سرد جنگ کہتے ہیں جاری ہے بعید نہیں کہ واضح اعلان ہو جائے کہ اب جناب چینگ چانگ، گوادر کے عوام سے خطاب کریں گے یا اگر مائی باپ امریکہ اپنی چالوں میں کامیاب ہو جائے تو جلالتہ الملک خطاب فرمائے گا۔ اب اگر کوئی میر کا بچہ سرفروشی دکھائے تو کیسے؟ لڑے تو کس سے لڑے؟ اب تو صرف ساحل فروشی ہی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بقول آپ کے کہ اس بھیڑ میں کھا کے جو تیر دیکھا، لیکن اس ساحل فروشی کی داستان تو بہت لمبی ہے نامعلوم امان صاحب نے اس قدر اس کو مختصر کیوں کیا۔ جبکہ اس کے پاس معلومات کا سمندر ہے۔ اگر وہ اپنے آباؤ اجداد کا جن کا مکران بشمول ساحل حکمرانی رہا ہے ذکر بھی فرماتے۔ گوادر نہ سہی پسنی، جیونی، گنز، اور ماڑہ وغیرہ تو زیادہ معتبر ٹھہرتے۔ لیکن شاید (Blood is the water thicker than) خون پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے کہ مصداق امان صاحب نے گچکی Dynesty کا ذکر ہی گول کر دیا۔ یہ بھی ایسی ہی زیادتی ہے جیسے اس ضمن میں سید ظہور شاہ ہاشمی کو بھول جانا۔

''جن پرنگانی حمل ءَ پسند نہ باں
وت گُشے ہُوک انت چُک گُشے ہُوکی پَڈّ لاں
نائی چانگالاں گوں مگسکاں ایر بر انت''

اس قدر بڑے مہذب قوم کے بارے میں اس قدر سخت الفاظ شاید خود اعتمادی اور اصلی ہیروپن کا کمال ہے ایک حمل تھے جس کو فرنگی دوشیزائیں اس قدر اجڑ، گنوار اور غیر مہذب لگتی تھیں حالانکہ اس کو دھن، دولت، عورت سب کی پیش کش کی گئی تھی اور دوسری طرف ہمارے آج کے قوم پرست سورما، ہیرو جو فرنگی دوشیزاؤں کے لئے ساحل تو ساحل اپنا دھن، دھرم، وطن، زمین، نال وڈھ، شال، گوادر، دوست ساتھی غرض اپنی آن شان، عزت، وقار، سیاسی کیریئر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں کیونکہ منڈی لگی ہوئی ہے اب اگر امان صاحب اچھے سیلز مین نہیں تو دوسروں کو کیوں کوس رہے ہیں اب ایسے میں یہ گلہ کہ شیرٹن ہوٹل میں کون بیٹھ کر دلالی کر رہا ہے یا لندن میں ساحل برائے فروخت کا بورڈ آویزاں ہے، بے معنی، بے مقصد، بے اثر ''چوسلگیں برءِ کہور''۔ ویسے بھی بیزن صاحب کا اپنا ایک فلسفہ ہے کہ جو لوگ کام کرتے ہیں محنت کرتے ہیں وہ بے وقوف ہیں جن کے پاس عقل ہو اس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن امان صاحب کا یہ خوف کہ اب بھی لوگ ان جیسے لوگوں کو نجات دھندہ سمجھتے ہیں۔ بے معنی نہیں۔ کاش یہ مضمون وہ ضیائی مارشل لاء کے دور میں چھپواتے شاید اس وقت نہ چھپتا۔ لیکن ثنا خوان اس وقت بھی تھے اب بھی ثناء بلوچ میدان میں کود پڑے۔ کاش ثنا صاحب کچھ تو صبر کرتے کیونکہ یہ ثناء بلوچ کے زمانے کی باتیں نہیں۔ اس وقت شاید وہ پیدا نہیں ہوئے تھے بابا تمہاری عمر کیا ہے اور نہ ان الزامات کا آپ سے آپ کی پارٹی سے کوئی تعلق بنتا ہے، الزامات بھی سنجیدہ جن پر لگائے گئے ہیں وہ بقید حیات ہیں اور اللہ ان کی عمر دراز کرے وہ خاموش حالانکہ اس کے سارے سنجیدہ کارکنوں کو بلکہ پوری بلوچ قوم کو سردار عطا اللہ مینگل کا جواب چاہئے، ہوسکتا ہے امان صاحب محض الزام تراشی کر رہے ہیں کردار کشی کی خاطر جھوٹ گھڑ رہے ہیں لیکن کیا کریں ہر دور میں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں نے نقصان پہنچایا ہے۔ یقین ہے کہ ثناء بلوچ صاحب کچھ عرصہ بعد ایسی ہی زبان استعمال کریں گے جو آج کل ڈاکٹر عبدالحکیم لہڑی صاحب کر رہے ہیں سوچیں اس وقت آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی ''بی ایس او'' کے ابتدائی دور میں یہی زبان ہمارے خلاف حکیم لہڑی، ڈاکٹر عبدالحئی، منظور گچکی، بیزن بزنجو، لعل بخش رند، لطیف بلوچ، عبدالقادر بلوچ اور پھر ڈاکٹر کہور خان وغیرہ استعمال کر رہے تھے جو اُس وقت ہم کرتے تھے بول کہ آزاد ہیں لب تیرے۔

کاش ان کی سمجھ میں آج سے ۳۰ سال پہلے یہ باتیں آتیں تو آج ہم سب مختلف سمتوں میں اس طرح بے مقصد نہ دوڑتے پھرتے۔ ہم نے ''پیپلز پارٹی'' کا ساتھ دیا، ہم مجرم، غدار ٹھہرے، وطن فروش اور وطن دشمن کہلائے، یہ لوگ ضیاء الحق جیسے آمر سے دولت، مراعات حاصل کرتے رہے، شہیدوں کا خون بہا وصول کرتے رہے، نواز شریف جیسے لٹیرے کی گود میں پھلتے رہے حتیٰ کہ ''راسکوہ'' تک دھماکہ کرنے کے لئے خود ڈرائیو کر کے لے گئے اور اب جنرل پرویز مشرف صاحب کی نیم فوجی عوامی حکومت میں حکمرانی کے مزے لوٹ رہے

ہیں۔معتبر وطن دوست اور بلوچستان کے وفادار ٹھہرے جبکہ اس وقت اس سرزمین کی منڈی لگی ہوئی ہے۔

بات لمبی ہوگئی اب رہی بات ساحل کی اس سلسلے میں فقط اس قدر استدعا ہے کہ خدارا ساحل کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ جو لوگ حکمران، لیڈر، قوم پرست، ہیرو، ساری زندگی ساحل اور ساحل والوں کا استحصال کرتے رہے ان کو ساحل کے متعلق خرید وفروخت تو اپنی جگہ بات تک کرنے کا حق نہیں اگر کسی نے ایسا کیا تو خریدار سمجھ لے کہ اس کی رقم ڈوب گئی۔ خریدار یا دلال حضرات یہ اچھی طرح نوٹ کرلیں کہ ساحل سے متعلق کوئی ڈیل اس وقت تک پائیدار نہیں ہوگی جب تک کہ ساحل والے خود اس کی توثیق نہ کرلیں کوئی مسلط کیا ہو زبردستی والا حل پائیدار حل نہیں ہوتا۔ اس لئے ساحل کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ساحل اپنا حمل اپنا شاھو اپنا تلانگ اپنا دادشاہ اپنا باقی بلوچ اپنا سید ظہور شاہ ہاشمی اور اپنا عبدالمجید سہرابی پیدا کرتا رہے گا۔ ساحل کی ماں اس قدر بانجھ بھی نہیں کہ شیروں کو جنم دینا بند کردے۔ تاریخ اپنی ضرورت خود پوری کرتی ہے جیونی کا واقعہ یاد ہے اس وقت بھی حسین اشرف زندہ ہے نوجوانوں کی قیادت کررہا ہے، میر عبدالغفور، مسافر علی، اسلم آزاد نوجوانوں میں میں عابد سہرابی، سعید فیض، میر نظر، محمد حیاتان یہ سب لوگ اپنی بساط کے مطابق اپنی لڑائی لڑ رہے ہیں ان سب سے ایک ہی گزارش ہے کہ سرداروں کی طرح ایک دوسرے کو کہنی مارنا بند کردیں محض ووٹ بینک کی خاطر ایک دوسرے کو کہنی مارنا بند کردیں محض ووٹ بینک کی خاطر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کے بجائے اپنے ''ایکشن کمیٹی'' میں یکجہتی اور اتحاد کا مظاہرہ کریں اپنی طاقت کو ایمانداری سے یکجا کریں انشاءاللہ ان کو کسی سورما قوم پرست کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

9 جون 2001ء

بیرون دریا کچھ نہیں

ساحل فروشی کے عنوان سے امان اللہ گچکی صاحب نے ایک خاموش جھیل میں ایک کنکر کیا ماری کہ سیلاب آ گیا اور اس سیلاب میں ہم بھی بہہ گئے۔ امان اللہ صاحب کو شاید نہیں معلوم کہ پانی چاہے تالاب، جھیل یا سمندر کا ہو اس میں بلوچ قوم کی طرح اس وقت تک ارتعاش یا جوش پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو نہ چھیڑا جائے۔ اسی طرح گہرے سمندر میں بھی اس وقت تک سکوت خاموشی ہوتی ہے جب تک کہ ہوا کے تیز تھپیڑے اس کو نہ چھیڑیں اور اگر جوش میں آ گیا تو پھر بڑی بڑی ایٹمی آبدوزیں، بحری جہاز چشم زدن میں غرق ہو جائیں۔ (TITANIC) فلم کو دیکھنے کے بعد تو سمندر کی اس خطرناک خصوصیت پر یقین آ جانا چاہئے۔ بلوچ قوم کی بھی کچھ ایسی ہی خصوصیت ہیں۔ امان صاحب! قبرستان والی خاموشی سے اس قوم کو بچانے کے لئے اس کو چھیڑتے رہئے۔ دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں کارواں چلتا رہنا چاہئے اگر آپ رک گئے تو کردار کشی کے ماہرین آپ کا حشر بھی باقی بلوچ اور قادر بخش نظامانی جیسا کریں گے۔ جن کے قتل کی بقول آپ کے آپ خود چشم دید اور گوش شنید گواہ ہیں۔

”گو ہاتھ میں جنبشیں نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے“

امان صاحب ایک فطری رائٹر ہیں اور کافی عرصہ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اس عنوان سے چند تاریخی حقائق و واقعات رقم کرتے ہوئے خان قلات میر احمد یار، باقی بلوچ اور چند دوسرے کرداروں کا آج کے قائدین اور بلوچ قوم پرست رہنماؤں کے علاوہ موجودہ کردار و عمل سے ایک تقابلی جائزہ پیش کرنے کی گستاخانہ جسارت کی ہے۔ کافی عرصہ بعد ایک سکوت کو توڑا، لوگوں کو دعوت فکر دی تا کہ اس وقت سرزمین بلوچستان سے متعلق جو بین الاقوامی اور ملکی بنیاد پر سازشیں ہو رہی ہیں۔ اندرون و بیرون خانہ جو مذاکرات چل رہے ہیں۔ ان سب پر ایک مثبت سیر حاصل بحث جاری رہتے ہوئے حقائق سامنے آسکیں۔ انور ساجدی صاحب کا قصور محض یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کے قیمتی صفحات ایک علمی بحث و تمحیص کے لئے بلا امتیاز وقف کر دیئے۔ اب تنگ نظر لوگ اس کو عوام دشمنی کہتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اس سلسلے میں مجھ جیسے کم علم اور ایک ادنیٰ شخص کی مضمون بھی شائع کر دی۔ پھر بشیر بلوچ صاحب، ثناء بلوچ صاحب، صورت خان مری اور غیر معروف جلب بلوچ جنہوں نے اپنے اصلی نام کو ظاہر نہیں کیا، اپنے خلاف اس کی ساری پرانی طرز کی گالیاں بھی شائع کر دیں۔ پھر شکایت کس بات کی۔ محض یہ کہ فرشتوں کے خلاف بولنے کی اجازت نہیں ایک جاہلانہ اپروچ ہے۔ ہم تو خاموش رہنا چاہتے تھے نظارہ دیکھنا چاہتے تھے لیکن بھلا ہو نوجوان فہم و فراست رکھنے والے ثناء بلوچ صاحب کا جو بلا جواز بیچ میں کود پڑے، امان

صاحب کے الزامات کا موضوع سے ہٹ کر جواب دینے لگے جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں بنتا، چنانچہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ہمیں تھوڑا غصہ بھی آیا اور ہم نے اس معاملے میں اس کو صبر و تحمل کی یہ سمجھ کر نصیحت کی کہ شاید اس کو اس روایات کا علم ہے کہ جب ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے مخاطب ہو تو چھوٹوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے یہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اب ہم جان محمد دشتی صاحب کی طرح بزرگوں کو ''لِٹّک'' تو نہیں کہہ سکتے، بزرگ تو بزرگ ہوتے ہیں چاہے کوئی بھی ہو لیکن ہم بھول گئے کہ:

''بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال''

یہی وجہ ہے کہ ہماری نصیحت کا الٹا اثر ہوا۔ محترم ثناء اللہ بلوچ صاحب کو مزید غصہ آ گیا اور انہوں نے ''ساحل کا غم'' کے عنوان سے ایک اور کالم پرانی طرز کی سیاسی گالیوں سے مزین کر کے میرے اور امان صاحب کے منہ پر دے مارا اور اپنے مخصوص کردار کشی کے عمل کو قدرے اور تیز کر دیا۔ ہم اس بحث کو یہیں ختم کرنا چاہتے تھے کیونکہ اب تو بات کچھ اور آگے نکل گئی ہے اب مسئلہ ساحل فروشی سے بڑھ کر وسائل فروشی تک پہنچ گئی ہے لیکن ثناء بلوچ اور جلب بلوچ صاحب نے بھی امان صاحب کی طرح چند متنازعہ موضوع چھیڑ کر ہمیں ایک مرتبہ پھر مجبور کیا کہ چند حقائق جن کے ہم خود گواہ ہیں اور جن میں سے کچھ کا دستاویزی ثبوت بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ دوستوں کے معلومات کے لئے پیش کر سکیں تا کہ کردار کشی کے شعلوں کے تپش کو قدرے کم کرنے میں مدد مل سکے۔ ثناء بلوچ صاحب کی معلومات کے لئے عرض ہے کہ جب تک شہید ذوالفقار علی بھٹو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر براجمان رہے، ابتدائی چند مہینوں کے بعد باقی سارا عرصہ امان اللہ گچکی اس کے زیر عتاب رہے۔ اس کی کچھ بنیادی وجوہات یہ تھیں کہ جب بھٹو صاحب نے امان صاحب کو اپنا وفادار ساتھی سمجھ کر اقوام متحدہ میں جانے کے لئے اس وفد میں شامل کیا جن کا امریکہ میں تین مہینہ تک قیام تھا وہاں امریکہ میں وہ کچھ ایسے سفارت کاروں سے ملتے رہے جو ہمارے ملک کے لئے ناپسندیدہ تھے مزید برآں جب یہ وفد اپنا معیاد پورا کر کے واپس پاکستان آ رہے تھے تو امان اللہ صاحب وہاں سے بجائے سیدھا پاکستان آنے کے عراق چلے گئے جہاں انہوں نے بغداد میں اس وقت کے ''بلوچ تحریک آزادی'' کے چند رہنماؤں سے ملاقات کی جن سے اس کی پرانی دوستی تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ جب بھٹو صاحب پر نیپ کی حکومت ختم کرنے کی بیرونی اور اندرونی دباؤ میں اضافہ ہوتا گیا اور نیپ کی حکومت ختم کرنے کا فیصلہ پارٹی کے دوستوں کے سامنے آیا تو امان صاحب نے اس کی سخت ترین الفاظ میں مخالفت کی ان کی دلیل یہ تھی کہ سیاسی مخالفین کو سیاسی میدان میں سیاسی عمل و آداب کے ساتھ شکست دینا چاہئے وہ جتنا عرصہ حکومت میں رہیں گے لوگوں کو ان کے قول و فعل کے تضادات کا خود بخود علم ہوگا اور لوگ خود اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن اگر اس طرح زبردستی ان کو ہٹایا گیا تو ان کا سیاسی قد کاٹ اور بڑھ جائے گا۔ لیکن جیسا کہ آپ حضرات خود مانتے ہیں کہ اس ملک میں ایجنسیاں بہت طاقتور ہیں وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ شاید نیپ کی قیادت کو بھی اس بات کا احساس دانستہ یا نادانستہ طور پر تھا کہ اگر مزید چند عرصہ وہ حکومت میں رہے تو ان کی سیاسی ساکھ بری طرح مجروح ہوگی۔ انہی دنوں ان کے اپنے بی ایس او کے نوجوانوں نے وزیر تعلیم میر گل خان

نصیر کے دفتر میں اپنے مطالبات پورا نہ ہونے پر گھس کر توڑ پھوڑ کی یہی وجہ ہے کہ میر غوث بزنجو جیسے فہمیدہ جہاندیدہ سیاستدان اور بزرگ رہنما جو اس وقت گورنر کے عہدے پر فائز تھے سمجھانے کے باوجود نیپ کی دوسری قیادت مرکزی حکومت کے ساتھ ٹکر لینے پر بضد رہی اور لسبیلہ پر لشکر کشی کر کے ان مقتدر قوتوں کو موقع فراہم کیا تا کہ نیپ کی حکومت کے خاتمہ کے عمل کو تیز کیا جا سکے۔

میں سمجھتا ہوں ان سیاستدانوں کو بھٹو شہید یا ایجنسیوں کا ممنون و مشکور ہونا چاہئے کہ ان کی اس غیر سیاسی عمل کی وجہ سے ان کی سیاسی ساکھ تباہ ہونے سے بچ گئی ورنہ آپ جیسے مدبر، دانشمند اور عالم و فاضل نوجوان آج ان کی رہنمائی سے محروم رہتے۔ ہم ثناء صاحب کا بصد احترام قدر کرتے ہیں اس کی تدبر، دانشمندی اور قابلیت پر رشک کرتے ہیں کیونکہ اس کی کم عمری میں نواز شریف جیسے مضبوط وزیر اعظم (جو رات کی تاریکی میں بھاگ گیا) کے کابینہ میں پارلیمانی سیکریٹری رہے ہیں اس کے مرکزی وزراء ثناء صاحب کے کمرے میں آ کر اس سے مشورہ کرتے رہے اور نواز شریف جیسے عظیم مدبر زیرک سیاستدان نے اس کم عمری میں ثناء صاحب کو اتنے عہدے عطاء کئے لیکن ہم نے فقط اتنی گستاخی کی کہ جن باتوں کا آپ کو علم نہیں ان پر محض ہوائی جملوں سے رائے زنی اچھی بات نہیں لگتی کیونکہ ہم جیسے لوگ زندہ ہیں جو ان حقائق سے واقف ہیں ہمارا مقصد امان اللہ گچکی صاحب کی وکالت کرنا نہیں بلکہ ہم خود بہت سے معاملات میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن آپ کا یہ الزام کہ امان یا میری مشاورت سے بلوچستان میں فوج کشی ہوئی غلط لغو بے بنیاد الزام ہے ہم کس کھیت کے مولی ہیں۔

اب رہی بات میر صادقوں اور میر جعفروں کی یہ بھی تاریخی جبر کا ایک حصہ ہے اگر تاریخ میں ایسے کردار نہ ہوں تو پھر ٹیپو سلطان بننے کا موقع کس کو ملے، باقی جہاں تک بلوچستان میں بربادی اور تباہی پھیلانے کی بات ہے آپ کو اختیار ہے آپ عاقل و بالغ دانا و ہوشمند شخص ہیں۔ آپ بے شک اس کی ذمہ داری ہم جیسے ایک معمولی آدمی پر ڈال سکتے ہیں کیونکہ آپ کی سیاست کی بنیاد ہر اس شخص کی کردار کشی پر مبنی ہے جو آپ کے لائحہ عمل سے اختلاف رکھتا ہو۔ لیکن سوال پھر وہیں آ کر اٹکتا ہے کہ ہم تو اس وقت محض 18 گریڈ کے ایک معمولی ملازم تھے لیکن آپ کے پاس پورے صوبے کے وزارت اعلیٰ کا عہدہ پھر آپ جیسے ماشاء اللہ زیرک فہم و ادراک رکھنے پیشن گوئی کرنے والا ایم این اے پھر بھی ''راسکوہ'' میں دھماکہ ہوا۔ حالانکہ بقول آپ کے سب اس کے مخالف تھے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اگر آپ کچھ کر جاتے تو آپ کی عظیم پارٹی ٹوٹ جاتی لیکن اس قدر احتیاط کے باوجود یہ عظیم پارٹی ٹوٹ گئی جس کا ہم سب کو افسوس ہے۔ آپ لوگ معصوم تھے اگر اس عذر کو مان لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ حکمران ایجنسیاں طاقتور ہیں وہ کسی رحیم ظفر کسی امان اللہ گچکی یا ثناء بلوچ کو خاطر میں نہیں لاتے وہ وہی کرتے ہیں جو ان کے اپنے مفاد میں ہوتا ہے اس لئے آپ نے اس سلسلے میں اپنی جو صفائی پیش کی ہے ہم اس کو تہہ دل سے تسلیم کرتے ہیں اور آپ سب کو اس بات کی مبارکباد دیتے ہیں کہ کم از کم آپ نے بہادروں کی طرح اپنی غلطی تسلیم کی اور ہر سال اسی دن یوم سیاہ منانے میں مصروف ہیں۔ ماتم کدہ جاری رہنا چاہئے تا کہ ''راسکوہ'' کی سیاہی ہمیں اس تباہی کی یاد دلاتا رہے۔ اب رہی بات امان اللہ گچکی صاحب کی تعلقات ''ایف سی'' والوں کے ساتھ اس اس کا وہ خود جوابدہ ہے۔

مزید برآں اس حقیقت کی بھی داد دینی چاہئے کہ ثناء صاحب ہم سے اختلاف کریں یا ہم جیسے کم ذہانت لوگوں سے کچھ گستاخیاں سرزد ہوں لیکن ہم جو لکھتے ہیں کہتے ہیں اس کی ذمہ داری بھی قبول کرتے ہیں۔ اپنا اصلی نام بھی چھپواتے ہیں لیکن اس سلسلے میں جو نیا نام سامنے آیا ہے۔ جلب بلوچ صاحب کا یہ کچھ جعلی سا لگتا ہے اس کو اتنا اخلاقی جرأت نہیں کہ اپنا اصلی نام تک لکھ سکے محض گالی دینے اور کردار کشی کی عمل کو تیز کرنے کے لئے میدان میں آیا ہے تو بھائی آپ کو بھی حق ہے ڈرنے کی کیا بات ہے ہم تو ایسے تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

''کہہ رہا تھا شور دریا سے سمندر کا سکون
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے''

جلب بلوچ ہو یا جالب بلوچ کھل کر سامنے آؤ البتہ فیصلہ صادر نہ کیا کریں کیونکہ یہ تو وقت حالات اور تاریخ ثابت کریں گے کہ کون عوام دوست ہے اور کون عوام دشمن لیکن ایک بات جو سارے ساحل کے لوگوں کو عجیب و حیران کن لگتی ہے کہ جب بھی ساحل کی ترقی خوشحالی کی بات سامنے آتی ہے تو کچھ لوگوں کو اس قدر شدید جھٹکا لگتا ہے شدید تکلیف محسوس ہوتی ہے جس کو وہ چاہتے ہوئے بھی چھپا نہیں سکتے۔ حالانکہ پورے بلوچستان میں پسماندہ ترین ڈویژن مکران ہے اور مکران میں پسماندہ ترین ضلع ساحلی ضلع گوادر ہے جس کے پورے ضلع میں سڑک نام کی کوئی چیز نہیں۔ بجلی کا تو حال سب کو معلوم ہے صحت وصفائی تعلیم سرکاری محکموں میں کوئی ملازم کسی معقول عہدے پر نہیں، پینے کا پانی تک میسر نہیں۔ آر سی ڈی شاہراہ بنتا ہے کچھ نہیں ہوتا ساحلی شاہراہ بننے پر اعتراض، ڈیپ سی پورٹ بننے پر واویلا، خلیج کے شیخ سارے بلوچستان میں شکار کھیلتے پھرتے ہیں تعمیرات کے لئے امداد دیتے ہیں ہسپتال بنواتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن سلطان قابوس گوادر میں ایک مکان بنانے کی خواہش کا محض اظہار کرتے ہیں تو سارے رہنما بیک آواز ایسے بیانات داغتے ہیں جیسے گوادر میں زلزلہ آ گیا ہو۔ سفارتی آداب کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھتے حالانکہ گوادر سلطنت آف عمان کا تقریباً 174 سال تک حصہ رہا ہے۔

معاف کریں! بات ہو رہی تھی جلب بلوچ صاحب کی، جلب بلوچ صاحب نے ایک مہربانی کی ہے کہ انہوں نے ''بی این ایم'' کے شہیدوں کو بھی تسلیم کر کے ان کے نام اپنے شہیدوں کے نام کے ساتھ کم از کم شامل تو کر لیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے باقی بلوچ اور سید ظہور شاہ ہاشمی کو بھی بلوچ مان لیا ہے، البتہ ہمیں جو نصیحت فرمائی ہے کہ فی الحال (؟ ساحل والے) یہ کارڈ اتنا مضبوط نہیں اس لئے ہمیں اس سے نہیں کھیلنا چاہئے، محترم نواب محمد اکبر بگٹی صاحب کا بھی یہی خیال ہے وہ نہ صرف ہمارے کھرے اور سچے قائد ہیں بلکہ بزرگوں میں سے بزرگ تر ہیں۔ چلیں آپ کہتے ہیں تو ہم اس کارڈ کو نہیں کھیلتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اب تو مذاکرات وسائل فروشی پر چل رہے ہیں آئندہ انشاءاللہ وسائل فروشی پر بات کریں گے۔ فی الحال ہم صرف جلب بلوچ صاحب کے معلومات کے لئے اتنا عرض کرتے ہیں کہ سمندر کے بین الاقوامی حدود میں اضافہ ہوا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ذرے سے آفتاب بنتا ہے ذرے کی طاقت کا اندازہ

''راسکوہ'' کی دھماکہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ستارے کبھی ذرے نہیں بن سکتے ستارے تو ٹوٹتے رہتے ہیں۔آپ شاید ستاورں کی چال میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔موج از دریا بیرون دریا کچھ نہیں۔یہی تو ہم آپ کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ سمندر کے بغیر آپ کی موج کی کوئی اہمیت نہیں کوئی خاص افادیت نہیں اس لئے اس کی شر سے دور رہو۔کیونکہ سمندر کی ایک اور خصوصیت بھی ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی گلی سڑی بدبودار چیز نہیں چھوڑتی کوئی بھی مرا ہوا جاندار چاہے اس کا اپنا بچہ مچھلی ہی کیوں نہ ہو مرنے کے بعد اس کی لاش کو انسانوں کی طرح بڑے اہتمام کے ساتھ کنارے پر لا کر چھوڑتا ہے یقین نہیں آتا تو بخشی ہوٹل گوادر میں جا کر اس دیو ہیکل ۷۲ فٹ لمبے اور گیارہ فٹ اونچے ویل مچھلی کی ہڈیاں دیکھیں جس کو سمندر عظیم نے مرنے کے بعد گنز کے ساحل پر لا کر چھوڑ دیا تھا جیسا کوئی بہت بڑا بحری جہاز ہو سمندر عظیم زندہ پائندہ چیزوں کو پسند کرتا ہے مردوں سے اس کو نفرت ہے اس لئے سمندر کی فکر یا ساحل کا غم رکھتے ہو تو سمندر کی طرح سینہ کشادہ رکھو زندہ تابندہ چیزوں سے پیار کرنا سیکھو تعصب نفرت کردار کشی اور محدود قبائلی سوچ سے باہر نکلو ہم قبائل کے خلاف ہیں نہ بی ایس او کے ہم تو محض اس رویے کے خلاف ہیں اس سوچ کے خلاف ہیں جو قبائل کا استحصال کرتا ہے اس تاریخی اکائی کی قومیت اور پھر قوم میں ضم ہونے کی فطری تبدیلی کے عمل کے سامنے رکاوٹ بنا ہوا ہے۔اس رجعتی طاقت کے خلاف ہیں جو بی ایس او کے نوجوانوں کو روز بروز محض چند گروہی طبقاتی سیاست کی خاطر ٹکڑوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔وہ چاہے کوئی بھی ہو ہم اس کے اس رویے کے خلاف ہیں جو اس تاریخی اکائی (قبیلہ) کو پسماندہ رکھنے میں دن رات مصروف عمل ہے۔

''تو پہ سرانی گڈگ ءَ زند ءِ حیالان ءَ کُشئے ؟!
پہ سندگ ءَ داشت کنئے پُلّ ءَ چہ بو تالانی ءَ!!''

روزنامہ ''انتخاب'' حب
23 جولائی 2001ء

امریکہ انڈر اٹیک

2000-2001ء ایک ملینیم جس کو دنیا کے ممالک کیلئے ان کی خواہشات وتوقعات کے مطابق امن، سلامتی اور خوشحالی کا پیغام لیکر آنا تھا اس لئے کہ بظاہر دنیا کے کچھ ممالک نے انسانی فلاح و بہبود کے لئے جو ایجادات کئے ہیں جو سائنسی علمی تحقیقی ترقی کی ہے ان کے لئے پوری عالم انسانیت کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے لیکن جیسا کہ ہمارے بلوچی میں ایک پرانی کہاوت ہے کہ ''محض خواہشوں کی بنیاد پر اچھے اور نیک کام نہیں ہوتے'' بالکل اسی طرح ان تمام ممالک کی توقعات وخواہشات کے برعکس اس ملینیم کا 11 اکتوبر 2001ء موجودہ دور کے ان تمام علمی، سائنسی اور سماجی ترقی کے باوجود ایک عبرت ناک بربادی اور انسانی تاریخ میں ایک ہولناک المیہ کا دن ثابت ہوا۔ ایک ایسا ہولناک المیہ جس کا مہذب دنیا تصور تک نہیں کرسکتی۔ سوچنے سمجھنے کا مقام ہے کوئی تنظیم جہادی یا غیر جہادی، سیاسی، مذہبی یا آزادی کی جنگ لڑنے والی تحریکیں۔ کیا واقعی وہ اس حد تک بھی جاسکتی ہیں۔ جس کا انسانی ذہن تصور تک نہیں کرسکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا ہمارے جیسے غریب ملک میں لوگ بے روگاری سے تنگ آکر خودکشی کر لیتے ہیں۔

11 ستمبر 2001ء کے دن دنیا کے سپر پاور ''امریکہ'' کے دو انتہائی ترقی یافتہ شہروں ''نیویارک'' اور ''واشنگٹن'' میں دہشت گردی کی وجہ سے جو ناقابل یقین حد تک تباہی ہوئی انہوں نے سائنسی علمی ایجادات ترقی اور انسانی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنے والے سائنسدانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ انہوں نے ساری زندگی محض اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ وہ سر پیٹتے ہوئے بال نوچتے ہوئے اپنے اپنے مقبروں یا ایجادات کے مرکزوں سے اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے ہوئے کہتے ہوں گے کہ انہوں نے ہوائی جہاز کیوں ایجاد کیا جس کے استعمال کا یہ طریقہ ہوسکتا ہے کہ 266 بے گناہ پسنجروں کے ساتھ چند دہشت گرد اس کو امریکہ کے مایہ ناز انجینئروں کے بنائے ہوئے پروقار ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے جڑواں ٹاور سے ٹکرا کر مزید ہزاروں بے گناہ انسانوں کی جان لے سکتے ہیں یا دنیا کے انتہائی قابل نفرت بلڈنگ ''پینٹگان'' پر گرادیں گے اور امریکہ جیسے اوحد سپر پاور ترقی یافتہ مملکت کے صدیوں قائم بین الاقوامی امیج، فخر وغرور کو چشم زدن میں پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔ اگر ان سائنسدانوں کو اس بات کا ذرا سا بھی ادراک ہوتا تو وہ کم از کم ہوائی جہاز بالکل ایجاد نہ کرتے بلکہ اس حقیر انسان کو زمین ہی پر رینگنے دیتے کیونکہ یہ ہے یہی قابل یہ احسان فراموش انسان اس قابل نہیں کہ اس کو اس قدر سہولیات مہیا کی جائے اسی لئے اس کو بہشت جیسی پرنعمت پر آسائش جگہ سے نکالا گیا۔

ان وحشی دہشت گردوں کا پہلا نشانہ ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کا بلڈنگ بنا پھر ''پینٹگان'' اور شاید تیسرا نشانہ ''وائٹ ہاؤس'' تھا جو کسی وجہ سے ناکام ہوئے۔ یہی چند ضروری پہلو ہیں جن پر سنجیدگی سے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ یہ دہشت گرد

خودکش لوگ یا ان کے پیچھے کام کرنے والی تنظیمیں عام امریکیوں یا امریکہ کے خلاف نہیں بلکہ ان کا ٹارگٹ امریکہ کے تین ایسے ادارے ہیں جہاں پوری دنیا کے ترقی یافتہ، نیم ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ غریب ملکوں اور مملکتوں کو معاشی اقتصادی فوجی اور سیاسی طور پر کنٹرول کیا جاتا رہا ہے۔ یہی ایک اہم ترین پہلو ہے جو غور طلب ہے کیونکہ جتنے بھی امریکہ مخالف ممالک گروہ یا تنظیمیں ہیں ان سب کی سوچ کی گہرائیوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ فوجی سیاسی اور اقتصادی طور پر ایک ایسا بدمست ہاتھی بن چکا ہے کہ جب جہاں جس کو چاہے اس کو اپنے مظموم عزائم کا نشانہ بنا سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سوچ کیسے پروان چڑھا ان دہشت گردوں کا نشانہ امریکہ کے تین اہم ادارے کیوں بنے خدانخواستہ امریکہ کے کسی شہر کا بھرا بازار کیوں نہ بنایا کسی اور ترقی یافتہ یورپی ملک کا تجارتی، سیاسی وفوجی مرکز کیوں نہ بنے۔ اس کا ایک سادہ سا جواب یہ ہے کہ امریکہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے لے کر ویتنام کے جنگ تک، سوویت یونین کے حصے بخرے کرنے سے لے کر انڈونیشیا کی تقسیم تک، کوریا، چین، جاپان، ہندوستان، ترکی، پاکستان، افغانستان پر اپنے شرائط مسلط کرنے سے لے کر مشرق الاوسط میں اسرائیل کو پورے عرب دنیا پر فوقیت دینے تک عراق پر فوج کشی، ہوائی حملہ، نوفلائی زون حتیٰ کہ اس پر انسانی زندگیاں بچانے والی دوائیوں پر پابندی جن کی عدم دستیابی کی وجہ سے کئی معصوم بچوں کی جانیں گئیں۔ لیبیا، شام، فلسطین، کیوبا، ایران غرض ایسے تمام کمزور ممالک کو آنکھیں دکھانا جو محض اپنے دائرہ وحدود واختیار میں ڈکٹیٹ ہونا پسند نہیں کرتے، غرور وتکبر کی انتہا آخر ساری دنیا میں اس قدر فرنٹ کھولنے کی کیا ضرورت ہے اس کے کیا معنی کیا مقاصد ہیں؟۔ چلیں سوویت یونین کو نظریاتی مخالفت کی وجہ سے زچ کرنا تھا، کرلیا لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہی لائحہ عمل ہر ملک پر کارآمد ہو سکے، ہر ملک کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے ''یعنی آ بیل مجھے مار'' اور جب بیل مارتا ہے تو پھر چیختے چلاتے کیوں،؟ پھر اجتماعی دعائیں شروع کرتے ہو خدا یاد آجاتا ہے۔ آخر کیوں تباہی کو دعوت دیتے ہو۔؟ اس حملے کے بعد ایسا لگ رہا ہے جیسا اس سپر پاور کی حیثیت افغانستان جیسے قحط زدہ ملک کے برابر رہ گیا ہے۔

اب اگر امریکہ جیسے بہت ہی ترقی یافتہ ملک بھی وہی حرکت کرتا ہے بقول امریکہ ان وحشی دہشت گردوں نے کیا ہے تو امریکہ کی مثال اس باوقار، عزت وعظمت رکھنے والے شخص کی مثال ہوگی جو کسی بازاری سڑک چھاپ شخص سے بھرے بازار میں الجھ جائے۔ اب چاہے وہ اس بازاری شخص کو جتنا جی چاہے مارے اس کی عزت تو خاک میں مل گئی۔ اس قسم کے جوابی حملے سے امریکہ سپر پاور کے بجائے سپر بھکاری (Supper bagger) بن کر رہ جائے گی۔ ہر وقت ڈرا سہما ہوا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ امریکہ کے تھینک ٹینک اور خاص کر امریکہ کے باشعور عوام سر پکڑ کر سوچیں اور اس عظیم مملکت کے حکمرانوں کو لگام ڈالیں تاکہ ساری دنیا سے پھنگہ نہ لیں۔ کیوں سب کے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہو کیوں ساری دنیا کا گندا اپنے سر پر ڈالتے ہو۔ محض چند معاشی سیاسی فوجی فوائد کے لئے محض دنیا کی چودھراہٹ کے لئے جس کی اتنی بھاری قیمت امریکی عوام کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

امریکہ جس قدر بھی ترقی یافتہ ہو معاشی سیاسی فوجی الحاظ سے مضبوط ہو لیکن اس کے حکمران Global contextں آداب حکمرانی سے نابلد ہیں۔ محض فوجی طاقت اور جنگی وسائل کی گھنمڈ کی بنیاد پر دنیا میں حکمرانی نہیں کی جاسکتی۔ ان کو چاہئے کہ یہ سارا گر برطانیہ کے حکمرانوں سے سیکھیں۔ دشمن کو مارنے کے لئے دشمن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی (Enemy of my enemy is my friend) کے مصداق یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کن کن سرحدات پر کون کونسی قومیں رہتی ہیں ان کے آپس کے کیا کیا توقعات اور ان کو ایک دوسرے سے مستقبل میں کیا کیا خطرات درپیش ہیں۔ کونسی قوم کس قوم کے توازن کو برقرار رکھ سکتی ہے۔؟ ان تمام عوامل تاریخی حقائق اور سچائیوں پر عمل کر کے تب جا کر برطانیہ ایک صدی تک دنیا کا سپر پاور بنا رہا۔ لیکن جس دن وہ حد سے آگے بڑھ گئے اپنی چالا کیوں معاشی اقتصادی اور فوجی طاقت پر گھمنڈ کرنے لگے تو اس کی دنیا بھی محدود ہو کر رہ گئی۔ محض روایتی جنگ عظیم کو ایٹم بم استعمال کر کے جیتنے سے کوئی زیادہ دیر تک سپر پاور نہیں رہ سکتا۔ جیسا کہ حالیہ خودکش حملوں کے بعد امریکہ کی سپر میسی چیلنج ہو گیا کیونکہ انہوں نے ساری دنیا میں اپنے لئے نفرتیں پھیلا رکھی ہیں۔

حالیہ دہشت گردی کا نشانہ امریکہ بنا ہے۔ لیکن اس کے جوابی کاروائی کا خطرہ یا خدشہ دنیا کے ان تمام روشن خیال پرامن مہذب ملکوں کو درپیش ہے۔ ایسے تمام ممالک دوطرفہ دہشت گردی کی زد میں ہیں کیونکہ امریکہ کے جذباتی صدر بش نے واضح طور پر سرکاری حیثیت سے (Officially) اعلان فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کو دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ ہمارے ساتھ ہیں یا بقول ان کے دہشت گردوں کے اُس دودھاری والے تلوار سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دونوں دہشت گرد قوتیں انتہائی طاقت ور ہیں۔ ایک دنیا کا سپر پاور جس کے پاس بے شمار وسائل، میزائل، ایٹمی طاقت، جنگی، فوجی جدید سے جدید ترین آلات حرب، دوسرے کے پاس خودکش حملہ آور جو کسی بھی ہوائی جہاز میں ایک شریف شہری کی طرح سوار ہو کر اس کو اس کے تمام بے گناہ پسنجروں کے ساتھ کسی بھی ناپسندیدہ ملک کے ''ٹریڈ سنٹر''، ایوان صدر یا فوجی تنصیبات پر گرا کر اس کو امریکہ کی طرح تباہی و بربادی سے دچار کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ امن پسند مہذب، غیر جانبدار ممالک کس کا ساتھ دیں کیونکہ یہ خودکش حملہ آوروں کی تنظیم یا ینٹ ورک اس قدر منظّم، مستحکم ہیں کہ جب وہ امریکہ جیسے سپر طاقت کے تمام جاسوسی نیٹ ورک کو توڑ کر بیک وقت امریکہ کے اندر اس کے چار کمرشل فلائیٹ کو محض چاقوؤں کے زور پر اغواء کر کے پوری دنیا کے سپر پاور کو حالت جنگ میں پہنچاتے ہیں۔ پورے مملکت کو اس حد تک حالت جنگ میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ اس کا صدر مملکت ایوان صدر تک نہیں پہنچ سکتے تو دوسرے کم وسائل رکھنے والے ممالک کا کیا حشر ہوگا۔ یہ ساری باتیں سوچنے اور سمجھنے کی ہیں۔ یہ سارے پہلو غور طلب ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ امریکہ کے حکمران اپنی ساری جارحیت پسندی کی پالیسوں پر نظر ثانی کریں۔ یہی خود امریکہ اور ساری دنیا کی امن وسلامتی کے بہترین مفاد میں ہے۔ محض افغانستان جیسے قحط زدہ ملک پر نظر مرکوز کرنے کے بجائے دنیا کے دوسری سرگرم تنظیموں اور گروہوں کے بارے میں بھی سوچنے کی ضرورت ہے جو اس قسم کے منظّم مربوط سازش کے لئے پورے وسائل

اور دفاع سے مالا مال ہیں۔ جیسا ''مساد''، ''انڈر ورلڈ'' تنظیمیں، ''ڈرگ مافیا''، بلاسٹک میزائل کا تنازعہ اور بہت سے عوامل جن کا ادراک صدر بش جیسے جذباتی شخص نہیں کر سکتا لیکن امریکہ کا تھینک ٹینک اور امریکہ کے باشعور عوام کر سکتی ہے۔

اس لئے اس تباہی و بربادی کے بعد امریکہ کے اثر ورسوخ رکھنے والے سیاسی مدبر، دانشور، ممبران کانگریس وسینیٹ اور امریکی عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو ہر ملک کے داخلی معاملات میں رخنہ ڈالنے اور ریشہ دوانیوں سے باز رکھے جیسا کہ انہوں نے ویتنام کے مسئلہ پر کیا تھا۔ یہ دنیا قدرت کے وسائل سے بھرپور ہے لیکن یہ محض ایک شخص یا ایک ملک کے لئے نہیں ہیں یہ تمام کے تمام قدرت نے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔ سب کو ان نعمتوں سے ان کی ضرورتوں اور استطاعت کے مطابق (ان وسائل سے) استفادہ کرنے کا حق ہے اور اس کی سب کو اجازت ہونی چاہئے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

4 اکتوبر 2001ء

امریکہ افغان تنازعہ اور بلوچستان

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر جارج ڈبلیو بش نے 11 اکتوبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹگان عمارتوں کے سانحہ میں شہید ہونے والے افراد کی یاد میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''Look arround don't look donw'' یہ ایک ایسا پیغام ہے جس کی آفاقی اہمیت سے انکار کم از کم مجھ جیسے کم علم کم زانت شخص کے لئے ممکن نہیں۔ کوئی بھی ذی ہوش شخص اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کو کچھ کرنے سے پہلے اپنے اردگرد کا جائزہ لینا چاہئے ہم تو اس آفاقی جملے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن جس شخص نے خود اپنی زبان سے اس سچائی کا اظہار کیا ہے وہ اپنی نظریہ ضرورت کے پیش نظر اس سچائی کی توہین تو نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر اتنے بڑے ملک کے سربراہ کے منہ سے اس قدر خوبصورت جملہ کچھ جچتا نہیں ہے۔ جہاں تک انصاف کی بات ہے تو صدر بش کی تقریر کے اس موثر جملے کا اطلاق بلاتفریق رنگ ونسل، مذہب وعقیدہ وملک ہر اس جگہ ہونا چاہئے جہاں عقل ودانشمندی کی ضرورت ہو۔ اگر صدر بش کا اشارہ اپنے دشمنوں کی طرف ہے تو کیا اس سچائی کا اطلاق خود صدر بش پر نہیں ہوتا۔ کیا صدر بش نے افغانستان پر حملہ کرنے سے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا تھا۔ اگر لیا ہوتا تو پھر اتنے بڑے مملکت کا سربراہ افغانستان جیسے بدحال ملک پر اس طرح بہرہ بن کر اندھا دھند بمباری نہ کرتا۔ کیونکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹگان کے سانحہ میں پوری مہذب دنیا کی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ تھیں۔ جو اس وحشیانہ بمباری سے زائل ہوگئیں۔ بیشتر اسلامی ممالک خود امریکہ اور یورپی ممالک میں اس جنگ کے خلاف شدید ردعمل سامنے آرہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ساری مہذب دنیا کی ہمدردیاں شفٹ ہوگئیں اصلی دہشت گردوں سے دنیا کی توجہ ہٹ کر خود امریکہ پر انگلیاں اٹھنے لگیں اس لئے یہ سب کچھ کرنے سے پہلے صدر بش نے اپنے اردگرد کا اچھی طرح جائزہ نہیں لیا۔ ہوشمند لوگوں کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی کہ دہشت گردی کو دہشت گردی سے نہیں روکا جاسکتا بلکہ اس طرح کے ردعمل سے دہشت گردی کو اور بڑھاوا ملتا ہے۔ جو کچھ امریکہ میں ہوا اس کی حمایت کوئی باشعور انسان نہیں کرسکتا لیکن اس کا علاج اندھا پن، پاگل پن، بمبارمنٹ، کروز میزائل نہیں بلکہ ہوش وحواس کو برقرار رکھ کر یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مہذب معاشرہ اور ایک غیر مہذب معاشرہ میں کیا فرق ہے۔۔ اگر امریکہ جیسے ملک کی طرف سے اس کا عملی مظاہرہ ہوتا تو آج اتنے سارے ممالک کی عوام امریکہ کے خلاف سراپا احتجاج نہ بنتے، نفرتیں اپنی صحیح جگہ کا تعین کرتے، اس طرح امریکہ کا جھنڈا اور صدر بش کا پتلا بھرے بازاروں میں نہ جلتے امریکہ کے باشعور عوام ساری دنیا میں اس طرح خوف ودہشت میں نہ رہتے عدم تحفظ کا شکار نہ ہوتے اور نہ امریکہ کو ہر ملک میں اپنے شہریوں کو احتیاط برتنے کی بار بار متنبہ کرنے کی ضرورت پڑتی۔

افغانستان پر حملے کے نتیجے میں ان بھوکے افغان بچوں کی دنیا کے الیکٹرونک میڈیا میں دکھانے والے ان مناظر کو کون بھول سکتا

ہے جو اپنی سوکھی روٹی کو پانی میں ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ یا جو اس اندھی بمباری کے نتیجے میں جھلس کر ہسپتالوں میں پڑے کراہ رہے ہیں۔ ان میں معصوم بچے بھی ہیں اور بے گناہ شہری بھی جن کا اس سارے دہشت گردی، سیاست یا حکمرانی سے دور کا بھی تعلق نہیں اور نہ یہ لوگ یہ سب کچھ سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ افغانستان پر حکمرانی تو کجا ان کی اس بارے میں کوئی رائے لینے کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی یہ بے گناہ لوگ مر رہے ہیں۔ جھلس رہے ہیں ان کے گھر بار تباہ ہو رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ نیو یارک اور واشنگٹن میں کیا حادثہ ہوا ہے۔ امریکہ ان پر اندھا دھند بمباری کیوں کر رہا ہے ان پر کروز میزائل کیوں داغے جا رہے ہیں۔؟ یہ سارے لوگ کس کی انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔؟ ان کا قصور کیا ہے؟ جبکہ امریکہ کے مطلوب ملزمان اسامہ بن لادن، ملا عمر اور طالبان کے سارے حکمران محفوظ ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام ملزمان جو بقول امریکہ والڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹگان پر حملہ کرنے کے جرم میں شریک و معاون رہے ہیں۔ سب کے سب محفوظ ہیں اور بے گناہ غریب افغانی معصوم بچے نشانہ بن رہے ہیں۔ حالانکہ امریکہ کے جنگ باز حکمرانوں نے وعدہ کیا تھا کہ ان کا نشانہ محض افغانستان کے فوجی تنصیبات ہوں گے۔

امریکہ جیسے مہذب معاشرے کو یہ سب کچھ زیب نہیں دیتا۔ یہ جذبہ انتقام، یہ طرز فکر جس کے خود امریکہ جیسے سپر پاور کی بدنامی ہو رہی ہے۔ پوری دنیا (وہ ممالک نہیں جو ایک گہری سازش کے ذریعہ امریکہ کو رسوا کرنا چاہتے ہیں۔) امریکہ کے اس قسم کی طرز عمل کی مخالفت کر رہی ہے۔ دنیا کے سپر پاور کے لئے یہ بہت ہی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ کیا امریکہ کا مہذب معاشرہ بے حس ہو چکا ہے۔؟ دنیا میں کوئی تو ایسا ملک کوئی ایسا سربراہ کوئی موثر ادارہ خود امریکہ میں موثر قوتیں اس پوزیشن میں نہیں کہ سپر پاور کے حکمرانوں کو اس پاگل پن سے باز رکھ سکیں کیا یہ ساری دنیا کے حکمران خوف اور ڈر کے مارے اپنی ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ کیا یہ مہذب امریکہ انتقام کی آگ میں اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے سپر پاور اپنے جدید ہتھیاروں کو افغانستان میں ٹیسٹ کر رہا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو بقول ایک شخص ''چارڈ الر کے گھر پر بیس لاکھ ڈالر کا میزائل گرانا کچھ زیادہ مہنگا سودا نہیں تو اور کیا ہے وہ بھی ایک شخص کو قابو کرنے کیلئے۔'' اگر یہ جنگ طول پکڑ گیا جیسا کہ اتحادیوں کا ارادہ ہے تو کوئی بعید نہیں کہ دنیا تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ جائے اور جنوبی ایشیاء کے بہت سارے ممالک اس آگ کی لپیٹ میں آ کر تباہ و برباد ہو جائیں۔ کیا امریکہ کے باسی یہ نہیں سوچتے کہ اس قسم کے حملوں سے خود مستقبل میں امریکہ کے شہری پھر انتقام کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ جو پینٹگان اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سانحہ میں مر گئے وہ واپس نہیں آئیں گے۔ لیکن جو زندہ ہیں کیا وہ متاثر نہیں ہوں گے؟ بلکہ اس کا ردعمل تو شروع ہو چکا ہے۔ (Anthray) کے سفوف یا جراثیم، پارسلوں کے ذریعہ زہریلی گیس پھیلانا امریکہ کے عوام کے لئے ایک خوفناک جوابی دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے۔؟

جو ممالک کل تک سانحہ نیو یارک اور واشنگٹن کی مذمت کر رہے تھے ساری دنیا میں دہشت گردی اور مذہبی جنونیت کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے۔ آج امریکہ کے افغانستان پر حملہ اور بمباری کی وجہ سے امریکہ کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ بہت سارے اسلامی غیر

اسلامی ممالک سراپا احتجاج بن گئے ہیں۔خود امریکہ اور اتحادی برطانیہ میں مسلم، ہندو، سکھ، عیسائی اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ امریکہ مخالف ریلیوں اور احتجاجوں میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ہوسکتا ہے امریکی حکمران اس قسم کی کاروائی سے وقتی طور پر کچھ حاصل کرسکیں اس کے پرامن عوام ساری زندگی انتقام کے خوف میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے۔جس کا نفسیاتی اثر امریکی شہریوں پر ساری زندگی رہے گا جس کا کوئی مداوا بھی نہیں۔

دنیا کے سپر پاور کو ہوش وحواس برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ہمیں تو ڈر ہے کہ دنیا کے سپر پاور کو ایک گہری سازش میں پھنسایا جارہا ہے۔روز بروز اس کے مضبوط ترین کرنسی ڈالر کے پاؤں اکھڑتے جارہے ہیں۔یورو دنیا پر اپنا قدم جماتا جارہا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ یوروڈالر پر فوقیت حاصل کرلے بہرحال ہماری کیا مجال یہ تو ان کے لئے سوچنے کی بات ہے جنہوں نے پوری دنیا کو اپنی انگلی پر رکھا ہوا ہے۔ دنیا کا سپر پاور اس کا سپر دماغ، اس کا سپر تھینک ٹینک اپنے مسائل بہتر سمجھ سکتا ہے۔ہماری پریشانی اس قدر ہے کہ ہم جو تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے ملک کے آخری درجے کے شہری ہیں۔ہم پر کیا گزر رہی ہے یا مستقبل میں کیا گزرنے والی ہے کیونکہ جہاں ہم رہتے ہیں۔اس سرزمین کو اس سارے پاگل پن کی کاروائی کے لئے بلواسطہ استعمال کیا جارہا ہے۔ایک طرف ہمارے ملک کا صدر مملکت اعلان فرماتا ہے کہ افغانستان پر حملے محدود وقت اور اہداف کے مطابق ہوں گے۔دوسری طرف حملہ کرنے والے اعلان کرتے ہیں کہ دہشت گردوں کے خلاف یہ جنگ طویل ہوگی۔دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔یہ کہتے ہوئے پینٹاگان اور وائٹ ہاؤس کے نمائندے روزانہ اپنے شہریوں کو پریس اور میڈیا کے ذریعہ تازہ ترین صورتحال کی بریفنگ دیتے ہیں اور کھرے کھرے سوالوں کا سامنا بھی کرتے ہیں۔دوسری طرف ہمارا صدر مملکت آقاؤں سے پوچھے بغیر اپنی عوام کو یقین دہانی کراتے ہیں کہ افغانستان پر حملے کے لیے پاکستان کا کوئی بھی ائیر بیس امریکہ کو نہیں دیا جائے۔چند دنوں بعد اعلان ہوتا ہے کہ جیکب آباد اور پسنی کے ہوائی اڈے امریکہ کے حوالے کردیئے گئے ہیں۔کس مقصد کے لئے اس کی وضاحت کرتے رہیں۔لیکن آپ کی کریڈبلٹی تو مشکوک ہوگئی۔آپ نے عوام کو دھوکے میں رکھا۔

آج کی خبر ہے کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کردیا اور اس کے گیارہ سرحدی چوکیوں کو تباہ کردیا۔جبکہ اس وقت بقول صدر مملکت ،ملک کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے۔پی ٹی وی افغانستان پر امریکی بمباری اور اس کی تباہ کاریاں اب جاکر بتارہے ہیں لیکن زور افغان مہاجرین کی آمد پر ہے شاید کچھ امداد کچھ ڈالر ہاتھ لگے۔لیکن یہ بتانے کی جرأت نہیں کررہا ہے کہ اس جنگ کے بعد جو تباہ کاریاں ہوں گی۔ اس کا اثر پاکستان اور پاکستانیوں پر کیا پڑے گا۔؟ وزارت خارجہ کا رونی صورت والا ریاض احمد خان جب اپنی بھاری بھرکم آواز کے ساتھ اس ساری صورتحال کی بریفنگ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سب پاکستانی ایک اندھے گہرے کھائی کی طرف جارہے ہیں۔ جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

اس ساری جنگی صورتحال کا اثر بلواسطہ بلوچستان اور صوبہ سرحد پر پڑ رہا ہے۔صوبہ سرحد کے کہنہ مشق خاندانی سیاست دان ولی خان اور

فیملی نے کچھ تحفظات کے ساتھ اعلانیہ طور پر اس ساری جنگی حکمت عملی کی حمایت کی ہے۔لیکن بلوچستان سے تاحال سوائے چند ایک کے کسی قابل ذکر سیاسی پارٹی کے سیاسی قائد نے اپنی سرزمین کے حوالے سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا ہے جو اس علاقے کی عوام کے لئے باعث تشویش ہو۔افغانستان پر بقول امریکہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے حملے بلواسطہ بلوچستان کی سرزمین سے ہو رہے ہیں اور مذہبی جماعتوں کی طرف بھی سب سے زیادہ ردعمل یا مدافعت بلوچستان سے ہوئی ہے۔فرض کریں امریکہ طالبان کے خلاف یہ جنگ جیت جاتا ہے۔اس کے بعد کیا ہوگا۔؟ جو مر گئے تو وہ گئے، جو زندہ بچ جائیں گے وہ سب کے سب اپنے فلسفہ جہاد اعلیٰ ٹریننگ اور اسلحہ کے ساتھ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں داخل ہوں گے بلکہ پورے پاکستان میں پھیل جائیں گے۔لیکن ان کا سب سے بڑا مرکز بلوچستان کی سرزمین ہوگی جو وسائل سے مالا مال ہے۔یہ جہادی ٹرینڈ لوگ جو محنت مزدوری کام دھندے سے اپنے آپ کو مبرا سمجھتے ہیں۔کیونکہ بقول ان کے وہ ایک مقدس فریضہ کے لئے میدان میں نکلے ہیں۔ان کا مطمع نظر جہاد فقط جہاد ہے، جہاد کے لئے زمین تنازعہ اور وسائل چاہیں، اس لئے وسائل حاصل کرنے کے لئے ان کا ٹارگٹ بینک یا صاحب ثروت لوگ، جہاد کے لئے امریکہ، از رائیل ہندوستان کا کشمیر، زمین پاکستان سیاست اسلامی نظام کا نفاذ اور پھر وہی سب کچھ جو افغانستان میں ہوا تو کیا امریکہ ان کو مارنے کے لئے پاکستان پر بھی بمباری کرے گا۔؟ یہ تو امریکہ اور ملک کے حکمرانوں کا مسئلہ ہے۔ہماری پریشانی صرف اس قدر ہے کہ اس سارے سیناریو (Senario) میں بلوچستان کے سیاستدانوں کا کیا رول ہوگا۔؟ بلوچستان کے بدحال لوگ کس کے کھاتے میں مشکلات کا شکار ہوں گے کس کس کے انتقام کا نشانہ بنیں گے ؟ کیا بلوچستان کے سیاستدان اس پر توجہ دینے کی زحمت گوارہ کریں گے؟ بی این ایم کے چیئرمین ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ صاحب تو پہلے ہی نشانہ بن چکے ہیں یعنی فلم کا ٹریلر شروع ہو چکا ہے حالانکہ بی این ایم نے خود بڑی شرافت سے اپنی ساری حق خودارادیت کا فلسفہ لپیٹ کر محض ناظمین پر اکتفا کرنے پر راضی نامہ کر لیا ہے لیکن پھر بھی اس کے شریف چیئرمین جہادیوں کا نشانہ بن گئے۔

حالیہ چست وایر (Development) سے ایسا لگ رہا ہے جیسا نیو ورلڈ آرڈر کا نفاذ ہونے والا ہے۔اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو جس سرزمین پر ہم رہ رہے ہیں، اس کا کوئی والی وارث ہے یا یہ افغانستان کی طرح وارلارڈز کی کشمکش کا شکار ہو کر برباد ہو جائے گا۔کیونکہ اب تک کوئی ایسا شخص سامنے نہیں آیا جو کھڑے ہو کر یہ کہہ سکے کہ یہ سرزمین ''بے واجہ'' نہیں ہے۔(سوائے حکیم لہڑی کے) ایسی صورت میں کیا بیرون ملک سے کسی ظاہر شاہ کو ڈھونڈنا پڑے گا۔لیکن یہاں جو شاہ ہیں، خان آف قلات، چیف آف جھالاوان، چیف آف ساراوان، چیف آف مری، چیف آف ڈیرہ بگٹی، چیف آف مکران نے تو خود جھالاوان میں عرصہ دراز سے سیاسی پناہ لی ہوئی ہے۔ان سب کا کیا ہوگا جو ملک میں بیٹھ کر حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ان بزرگوں کے سوچنے کی بات ہے۔ہم تو ٹھہرے غلام، غلام تو غلام ہوتا ہے اس کو کوئی یہ حق بھی نہیں دیتا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کا غلام بن جائے۔جو طاقت ور ہوگا ہم اس کی رعیت باقی والا عالم الثواب۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

21 اکتوبر 2001ء

گریجویشن کی شرط پر واویلا کیوں

ملک میں موجودہ فوجی حکومت سے پہلے نواز شریف کی سربراہی میں ایک نام نہاد جمہوری حکومت قائم تھی جس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے دن دھاڑے ملک کے سب سے بڑے عدالتی ادارے سپریم کورٹ آف پاکستان پر اپنے ڈنڈا بردار غنڈوں کے ذریعہ حملہ کرایا اور ان غنڈوں کے ساتھ قومی اسمبلی کے چند منتخب نمائندے بھی شامل تھے جو اس کے کاسہ لیس متوالے یا منظور نظر کہلاتے تھے۔ جیسے نیلام گھر کے طارق عزیز، بی ایم ڈبلیو والے سیف الرحمٰن اور بہت سے اس کے بعد حکومت سے باہر سیاسی پارٹیوں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ نواز شریف کی حکومت اس ملک کے لئے سیکورٹی رسک بن گئی ہے اس کو ختم کیا جائے۔ جن حالات میں نواز شریف کی حکومت کو ختم کیا گیا ان سے سب واقف ہیں۔ دھرانے کی ضرورت نہیں اور جب اس کی جگہ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے لے لی تو سب نے بشمول بے نظیر بھٹو سکھ کا سانس لیا اور اس کے حق میں تائیدی کلمات بھی اخباروں کے زینت بنے جو ریکارڈ پر موجود ہیں۔

چند مہینے بڑی خاموشی سے انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی کے تحت گزرے اور جب نسبتاً قدرے سخت احتساب شروع ہوا تو انہی سیاسی جماعتوں کی طرف سے الیکشن کرانے کا واویلا مچنا شروع ہو گیا اور اب جبکہ موجودہ فوجی حکمرانوں نے سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق الیکشن کی تاریخ کا اعلان کیا ہے تو ان مخصوص سیاسی جماعتوں اور ان کی پیشہ ور قیادتوں کی طرف سے ایک عجیب گومگوں اور خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ قومی تعمیر نو بیورو کی طرف سے سینیٹ قومی اور صوبائی اسمبلی کے امیدواروں کے لئے گریجویشن کی شرط ہے جو ان تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کے گلے کی ہڈی بن گئی ہے جو یا تو خود گریجویٹ نہیں ہین یا ان کے اولاد رشتہ دار اور کاسہ لیس گریجویٹ نہیں جن کو وہ اپنے مخصوص ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لئے اسمبلیوں میں لانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ آکسفورڈ، ایجی سن اور امریکہ کی یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے سیاستدانوں کو اس بات کا ادراک ہے کہ برطانیہ جیسے ملک میں جو مادر جمہوریت کہلاتا ہے جہاں محض وہ لوگ عملی سیاست میں حصہ لیتے ہیں یا پارلیمنٹ کے لئے امیدوار بنتے ہیں جو پورے معاشرے میں سب سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں جو قدرے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں وہ سیاست میں ضرور حصہ لیتے ہیں لیکن وہ خود اپنے آپ کو کسی قانون ساز ادارے کا ممبر بننے کے لئے اہل نہیں سمجھتے۔

قومی تعمیر نو بیورو نے متوقع اکتوبر 2002ء کے قومی انتخابات کے لئے سینیٹ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کے لئے گریجویشن کی شرط عائد کی ہے مخلوط طریقہ انتخاب قانون ساز اداروں کی نشستوں اور خواتین کی نشستوں میں اضافہ جیسے مثبت اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو خود سیاسی جماعتوں کے دیرینہ مطالبات رہے ہیں۔ محض ایک گریجویشن کی شرط کا اضافہ کیا ہے جو ان کو کچھ زیادہ ہی

ناگوار سا لگ رہا ہے۔ حالانکہ موجودہ فوجی حکومت پر بظاہر یہ سب کرنے کے لئے کوئی اندورنی دباؤ بھی نہیں ہے شاید خود جنرل پرویز مشرف اوران کا تھینک ٹینک بعداز خرابی بسیار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس مملکت پاکستان کے ساتھ گزشتہ 54 سالوں سے محض مذاق ہوتا رہا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم جمہوریت اور جمہوری اداروں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ بار بار کسی فوجی مداخلت اور خود فوجی حکمرانوں کے بہت سے غلط فیصلوں کی وجہ سے ملک بہت سے سنگین بحرانوں کا شکار رہا ہے لیکن اس حقیقت کے ماننے سے بھی ہمیں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہئے کہ بڑے بڑے بنیادی فیصلے یا تعمیراتی کام بھی زیادہ تر فوجی حکمرانوں نے ہی کئے ہیں جبکہ یہ کام سیاستدانوں کو کرنے چاہئیں تھیں۔ جیسے بڑے بڑے صنعتوں کا قیام، بڑے بڑے آبی وسائل کے ڈیموں کی تعمیر، آر سی ڈی شاہراہ، ون یونٹ کا خاتمہ اور تاریخی صوبوں کی بحالی، دہشت گردی کے خلاف حالیہ موثر اقدامات، ساحلی شاہراہ کی تعمیر کے کام کی ابتداء بڑے پیمانے پر کرپشن کی سرکوبی اور شاید گوادر ڈیپ سی پورٹ کی تعمیر تکمیل کا کام بھی انہی کے ہاتھوں انجام پائے۔ مزید برآں قومی اداروں کے استحکام کیلئے موجودہ عملی اقدامات کا اگر ان پر ایماندارانہ عمل درآمد ہو تو کوئی بعید نہیں کہ آنے والے منتخب عوامی ادارے مستقل بنیادوں پر قائم و دائم رہ سکیں جن کی اس ملک کو ابتداء سے ضرورت رہی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

اب رہی بات ہمارے ان چند مخصوص پیشہ ور سیاستدانوں کی، ان کے عزیز و رشتہ داروں، منظور نظر جاہل ان پڑھ جیالوں، متوالوں اور کاسہ لیسوں کے جو ہر دور میں اپنی رشتہ، دولت اور کاسہ لیسی کے بل بوتے پر پارٹیوں کے ٹکٹ حاصل کر کے ان مقدس قانون ساز اداروں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں وہ علمی قابلیت کے لحاظ سے ان اداروں کے نائب قاصد کے بھی اہلیت نہیں رکھتے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان ہی سیاسی پارٹیوں کے بیشتر پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ، مخلص، ایماندار کارکن ان اداروں تک پہنچنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اول تو ان کو پارٹی کا ٹکٹ نہیں ملتا اور اگر ٹکٹ ملتا ہے تو ان کے جیتنے کیلئے پارٹی کی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک میں مارشل لاء لگتا ہے تو سب سے پہلے یہی رشتہ دار اور کاسہ لیس فوراً اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے یا تو مارشل لاء کی گود میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں یا کسی ایسے سیاسی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں جو حکمرانوں کی منظور نظر ہوتا ہے تا کہ وہ پھر اسمبلیوں میں پہنچ کر لوٹ کھسوٹ کر سکیں۔ اس سیاسی کلچر نے نہ صرف ملک کے تمام قومی اداروں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے بلکہ تمام مارشل لاؤں کی راہ بھی ہموار کی ہیں کیونکہ ایسے لوگ کسی ضابطہ اخلاق، کسی سیاسی پارٹی کے منشور کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ محض کرپشن کرنے کیلئے الیکشن لڑتے ہیں۔ جب کسی محکمے کا وزیر یا کسی ادارے کا سربراہ خود کرپٹ ہو تو پھر باقی اہلکاروں کو کون روک سکتا ہے۔ لاکھ اختلاف کے باوجود موجودہ فوجی حکمرانوں کے احتساب نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہمارے عوامی منتخب نمائندے کس حد تک کرپٹ تھے۔ احتساب عدالتوں میں کروڑوں کی ڈیل یا بارگیننگ دیکھنے میں آئی۔ اب ایسے لوگوں سے بہتری، قانون سازی، پارلیمانی یا جمہوری اداروں کو چلانے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

جاہل نمائندوں اور سابقہ وزراء کے ایسے ایسے قصے مشہور ہیں جو ہماری پارلیمانی اداروں کی تاریخ میں جگ ہنسائی کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ جیسے بلوچستان کے سابقہ اسمبلی میں گوادر ڈیپ سی پورٹ کے بارے میں بحث چل رہی تھی چونکہ یہ اربوں روپے کا پروجیکٹ ہے اس لئے جب بحث لمبی ہوگئی تو پشتون علاقے کا ایک ''ایم پی اے'' اٹھا اور کہنے لگا یار! اتنی لمبی بحث کیوں کرتے ہو اگر گوادر میں جگہ نہیں تو ڈیپ سی پورٹ چمن یا پشین میں بناؤ، ہم جگہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ یہ عوامی نمائندہ جو قانون ساز اسمبلی کا ممبر ہے اس کو یہ تک معلوم نہیں کہ ڈیپ سی پورٹ کیا بلا ہے۔! اسی طرح ہمارے ایک اور صوبائی وزیر کے پاس ایک ایم اے پاس لڑکا نوکری مانگنے آیا تو وزیر صاحب نے اس کی تعلیمی قابلیت دریافت کی تو لڑکے نے بڑے ادب سے جواب دیا سر میں ایم اے پاس ہوں۔ وزیر موصوف نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں لڑکے کو جواب دیا ''جناب میرے پاس میٹرک پاس لڑکوں کی لائن لگی ہوئی ہے اور تم ایم اے پاس والے نوکری مانگنے آئے ہو۔ میٹرک پاس کرو پھر نوکری کیلئے میرے پاس آؤ۔'' اب اس وزیر موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ ایم اے بڑی ڈگری ہے یا میٹرک۔! یہ لطیفے نہیں حقائق ہیں ایسی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کو تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ ان حالات میں اگر موجودہ حکمرانوں نے گریجویشن کی شرط رکھی ہے تو کیا برا کیا ہے؟ ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ الیکشن کرانے پر راضی ہوئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ''سی ایس ایس'' کی طرح کوئی ریٹرن ٹیسٹ کا اعلان نہ کر دیں۔

اب ان میں چند ہمارے ایسے دوست واحباب بھی ہیں جو گریجویٹ تو نہیں لیکن ان پڑھ جاہل بھی نہیں ہیں۔ ممبر اور وزیر بھی رہ چکے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ بس بھی ان سے نکلی جا رہی ہے۔ اس لئے وہ خوامخواہ گرد اور مٹی سے پرہیز کریں۔ ان کو معذرت کے ساتھ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگلی باری کا انتظار کریں لیکن ناظم یا نائب ناظم کیلئے۔ وہ محض اپنی ذات کیلئے نہ سوچیں اور واویلا مچانے سے بھی پرہیز کریں۔ البتہ ایک بات غور طلب ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت کیوں شور نہیں مچایا جب ناظم یا نائب ناظم اور کونسلر کے انتخابات کیلئے میٹرک اور ایف اے کی شرط رکھی گئی تھی حالانکہ وہ قدرے ذیلی ادارے تھے۔ شاید اس میں ان کی ذاتی دلچسپی نہیں تھی۔ اب تو نسیم ولی خان نے بھی شور مچانا شروع کر دی ہے حالانکہ آج کل ان کی پارٹی گڈ بک میں ہے۔

آخیر میں ایک اہم بات کی طرف میں موجودہ حکمرانوں اور قومی تعمیر نو بیورو کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اس مثبت اقدام کے لئے قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے اور آئندہ منتخب عوامی اداروں کو مکمل تحفظ فراہم کریں۔ آئینی اور قانونی ماہرین کی ایک ایسی با اختیار ٹیم تشکیل دیں جو ان خامیوں کی نشاندہی کریں جن کی وجہ سے ملک بار بار آئینی بحران کا شکار رہا ہے اس کے مفاد میں ایسی تجاویز پیش کریں جو منتخب اداروں کے وقار، عزت واستحکام کی ضمانت دے سکیں۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

31 جنوری 2002ء

گوادر ڈیپ سی پورٹ اور ہمارا مستقبل

آج کا موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف بہت ہی اہم ہے بلکہ وقت اور حالات کا تقاضہ بھی ہے کہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی جائے تا کہ اس سلسلے میں لوگوں کے دل و دماغ میں جو شکوک وشبہات ہیں وہ دور ہو سکیں۔ یعنی ہم انتہائی مدلل اور جامع انداز میں یہ ثابت کر سکیں کہ کیا وہ خدشات جن کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ درست ہیں یا ہم خوامخواہ اپنے مستقبل کے بارے میں خدشات اور تحفظات کے شکار ہیں اس سے پہلے کہ میں اصل موضوع کی طرف آؤں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ''بی ایس او کے'' نوجواں کارکنوں اور عہدے داروں کا اس موضوع پر کامیاب سیمینار منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کروں کہ جنہوں نے اس فورم کے ذریعے ہم سب منتشر لوگوں کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ یقیناً قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے یہ ایک مثبت کوشش ہے جس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے ''بی ایس او'' کا نام ذہن میں آتے ہی یہ خیال حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے کہ وہ تو ایسے معاملات پر محض اجتماج ہڑتال ہلڑ بازی، توڑ پھوڑ کے حامی ہیں ان کو اپنی سیاسی دوکانداری چمکانے کے لئے محض ایک ایشو چاہئے یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں خود ''بی ایس او'' کا بانی رکن رہا ہوں اور اپنے قائدین کے حکم پر اس طرح کی حرکتیں کرتا رہا ہوں لیکن وہ زمانہ اندھی تقلید کا زمانہ تھا۔ اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں ''بی ایس او'' بھی ان تمام حالات سے گزر کر سیاست کی بھٹی میں کندن بن چکی ہے اس اہم موضوع پر اس سیمینار کا اہتمام کر کے بی ایس او کے قائدین نے ثابت کیا ہے کہ اب وہ پختہ (Mature) ہو چکے ہیں اس لئے مستقبل کی سیاسی قیادت کے بارے میں اب کم از کم میں مایوس نہیں ہوں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے چند بنیادی سوالات آپ حضرات کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے اٹھاتا ہوں۔ گوادر ڈیپ واٹر پورٹ کی تعمیر سے ہمارے خدشات یہ ہیں کہ اہم اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے جیسا کہ ڈاکٹر عزیز صاحب نے اپنے انتہائی مدلل قابل فکر مقالہ میں بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر عزیز صاحب کے خدشات اپنی جگہ پر لیکن تھوڑی دیر کے لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ گوادر ڈیپ واٹر پورٹ اور ساحلی شاہراہ بننے کے بعد بھی ہم اقلیت میں تبدیل نہیں ہوتے بلکہ اسی طرح اکثریت میں رہتے ہیں جس طرح اب ہیں لیکن سوچنے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ اکثریت کیا کردار ادا کر سکتی ہے جس کے پاس علم نہ ہو جدید ٹیکنالوجی کی جانکاری نہ ہو۔ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ جس کو قانونی ضوابط کا پتہ نہ ہو، پورٹ چلانے کی صلاحیت نہ ہو۔ قانونی تجارت یعنی ایکسپورٹ ایمپورٹ سے ایسے بھاگتا ہو جیسے یہ کوئی وبائی بیماری ہے۔ جس کو فیکس اور انٹرنیٹ کی موجودہ اہمیت کا علم نہ ہو۔ چیمبر آف کامرس یا لیٹر آف کریڈٹ (LC) کے بارے میں واقفیت نہ ہو۔ ان حالات میں ہم اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے علاقے کی تحفظ اور اپنی آنے والی نسلوں

کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کر سکتے جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ان تمام کاموں کو چلانے کے لئے ہم باہر والوں کے محتاج ہیں اب دیکھیں ڈیپ واٹر پورٹ بن گیا۔آبادی کا ریلا سیلاب آ گیا اور ہم اقلیت میں تبدیل ہو گئے لیکن ہمارے نوجوانوں کے پاس وہ سب آگاہی ہے جس کا میں نے پہلے (اوپر) ذکر کیا ہے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جانکاری رکھنے والی اقلیت اس اکثریت سے کہیں زیادہ بھاری ثابت ہوگی جس کو کسی بھی شعبے میں جانکاری حاصل نہیں اس لئے موجودہ دور (Servival of fittest) کا دور ہے۔یعنی وہی زندہ رہ سکتے ہیں جو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مقابلے کی سکت رکھتے ہیں۔لیکن میں جس پیشے سے تعلق رکھتا ہوں میرا تجربہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ مقامی آبادی کے صاحب حیثیت سرمایہ رکھنے والے لوگ قانونی تجارت سے کتراتے ہیں وہ کاغذات سے بھرپور اس فائل سے خوفزدہ ہوتے ہیں جس میں بہت سارا وقت لگتا ہے۔وہ تو اس میں خوش ہیں کہ حکومتی اداروں اور ایجنسیوں کے اہل کاروں کے جیب گرم کر کے اپنا مال یا داگینہ اپنی منزل تک پہنچائیں۔اب آپ اہل علم و دانش قوم کی رہنمائی کرنے والے لوگ ایمانداری سے یہ بتائیں کہ ایسے لوگوں کو کس طرح راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔یقیناً تمام حکومتی اداروں کے کارندے اپنی مفاد کی خاطر اس سلسلے کو جاری و ساری رکھنا چاہتے ہیں لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کون نقصان میں ہے اور کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن ہمارے موضوع سے اس کا ایک گہرا تعلق بنتا ہے ان بیان کئے ہوئے حقائق کی روشنی میں ایک تدبیر تو یہ سوچی جا سکتی ہے کہ جس طرح سارے حکومتی ادارے ایجنسیاں جن میں اکثریت کا تعلق بڑے صوبے پنجاب سے ہے جس طرح مل کر گریٹر پنجاب کے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کم از کم ایک نقطہ پر یعنی اس سرزمین کی حفاظت اور اس کے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی خاطر ہم سب کو ایک متفقہ لائحہ عمل اپنانا پڑے گا تمام سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر تدابیر کرنے ہوں گے اور یقین کیجئے جب ہم ایمانداری اور نیک نیتی سے ایک مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دیں گے تو یقیناً ہم کامیابی کے قریب ہوں گے۔اب اس کے لئے چاہے ہمیں صاحب اقتدار لوگوں سے گفت و شنید کرنا پڑے یا لڑائی جھگڑا پھر یہ سب کی متفقہ اور مشترکہ ذمہ داری بن جائے گی یہ تو ہم کریں گے ہمیں کرنا پڑے گا۔

لیکن اس سارے سنیاریو میں ہمیں ان بین الاقوامی حالات کا بھی مختصراً جائزہ لینا ہوگا جن کی دلچسپی بلکہ کہنا چاہئے بہت زیادہ دلچسپی گوادر پورٹ اور ساحلی شاہراہ سے ہے۔ان میں سرفہرست سپر پاور امریکہ ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے پورٹ کا ٹھیکہ چین کو کیسے لینے دیا جب کہ پہلے کئی مرتبہ رکاوٹ بنتا رہا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ امریکہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ایک طرف انہوں نے چین کو افغانستان تنازعہ سے دور رکھنے کے لئے گوادر پورٹ کی تعمیر کا ٹھیکہ دلایا اور عالمی تنظیم (WHO) کا ممبر بننے دیا اور دوسری طرف جنرل مشرف کو ان مذہبی عناصر کی بیخ کنی پر لگا دیا ہے جو کسی نہ کسی حد تک سپر پاور کے مفادات کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں یعنی سپر پاور اپنے مفادات کی تحفظ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے اس سارے کشمکش کا مرکز ایک طرف افغانستان ہے تو دوسری طرف ساحل بلوچستان یعنی گوادر ڈیپ واٹر پورٹ ہے۔اگر وہ افغانستان میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو گوادر میں بھی کسی مزاحمت کو بہت زیادہ اہمیت

دیتے ہیں اس لئے حکمرانوں کو میں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں مزاحمت پر مجبور نہ کریں ہمارا تو جو بھی حشر ہوگا ہم نقصان کے عادی ہیں یہ باتیں میں گوادر مکران ڈویژن یا بلوچستان کے لوگوں کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں یہ باتیں میں موجودہ حکمرانوں اور مملکت پاکستان کے مفاد میں کر رہا ہوں گوادر ڈیپ واٹر پورٹ کی تعمیر یا اس علاقے کی ترقی سے ہم اقلیت میں ہوں گے یا نہیں ہم بے بس کمزور لوگوں کا مسئلہ ہے لیکن کیا اس سارے کھیل اور منافقت کی روشنی میں عالمی میڈیا اور امریکہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی مفادات کی راہ میں کوئی بھی حائل ہونے کی کوشش کرے گا وہ اس کو نیست و نابود کر دے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مفادات کے ٹکراؤ کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں اگر کسی وقت کسی بھی وجہ سے پاکستان کے موجودہ حکمرانوں اور سپر پاور کے مفادات میں ٹکراؤ ہوا تو پھر کیا ہوگا۔؟ ویسے بھی آج کل اس ملک کا اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) داؤ پر لگا ہوا ہے یاد رہے کہ اس سپر پاور نے ضیاء الحق کو بھی اس ملک پر قادر مطلق بنا کر روس اور دیگر جمہوری قوتوں کو کچلنے کے خلاف استعمال کیا۔ لیکن اچانک ان کے مفادات میں ٹکراؤ آ گیا اور ضیاء الحق نے بھی اپنی ٹیڑھی آنکھیں دکھانے کی کوشش کی تو اس کو زمین اور آسمان کے درمیان بھسم کر لیا گیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر امریکہ کے موجودہ آئل مافیا حکمرانوں کا مزاج بدل گیا تو وہ نہ صرف بلوچستان کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی سازش کریں گے بلکہ پاکستان کو بھی توڑنے میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوں گے اب تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ پاکستان اور بلوچستان یا بلوچوں کے مفادات مشترکہ ہو چکے ہیں اس لئے ہم سب کی سلامتی کے خاطر حکمرانوں کو ہمارے مطالبات ماننے پڑیں گے ہم سے ہاتھ ملانا پڑے گا ہمارا جائز حق ہمیں دینا پڑے گا ورنہ! ''نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری'' اس سے پہلے کہ میں اپنا ایک بنیادی مطالبہ حکمرانوں کو پیش کروں چند ضروری گزارشات ان کے گوش گزار کروں گا وہ یہ ہیں کہ ان تمام حقائق کے باوجود حکمرانوں نے اپنا ماضی کا رویہ ترک نہیں کیا اور ان کو اپنی غلطیوں کی وجہ اس ملک کو نقصان پہنچا تو ہمارا فوری نقصان زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مولا بخش دشتی، بابو گلاب، ستار نواز، محمد حیاتان، حمید بلوچ، سعید فیض، ملا غلام رسول اور بہت سے ناظمین اپنے عہدوں کو کھو بیٹھیں گے لیکن پھر بھی اس سرزمین کے باسی رہیں گے اور وہ ''زندہ باد یا مردہ باد'' یہ نشانہ ضرور چھوڑیں گے کہ وہ ناظم رہیں یا محکوم اس سرزمین سے ان کو کوئی نہیں نکال سکتا کیونکہ یہی ہم بلوچوں کی تاریخ رہی ہے ہم کسی سے وفا کریں یا نہ کریں مگر اپنی سرزمین سے بے وفائی ہماری فطرت میں نہیں ہے۔!!

چونکہ بنیادی طور پر میں ایک سیاسی کارکن ہوں میرا سیدھا سادا مطالبہ ہے کہ موجودہ ریفرنڈم کے نتائج کو ایمانداری سے دیکھنے کے بعد خود حکمرانوں اور اس ملک کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ فی الفور انتخابات کا اعلان کیا جائے صوبائی اسمبلیوں کی تشکیل کے ساتھ ہی صوبوں کو اپنے اندرونی معاملات چلانے کے لئے مکمل قانون سازی کا اختیار حاصل ہو اور وہ قانون ایسا ہو کہ نہ صرف ہماری سرزمین محفوظ رہ سکے بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی معاشی سیاسی اور معاشرتی تحفظ کی ضمانت موجود ہو۔ جب تک اسمبلیاں تشکیل نہیں پاتیں وقتی طور پر ضلعی حکومتوں کو عملی طور پر (محض اعلان کے ذریعے نہیں) بااختیار بنایا جائے کہ وہ اپنے اضلاع کی زمینوں کا تحفظ کر سکیں۔ اپنے علاقے کے

لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے قانون سازی کرسکیں اور تاریخ میں اپنا ایک مقام پیدا کرسکیں یہی ہم سب کے مفاد میں ہے، ملک کے مفاد میں ہے اور یہی عمل ضلعی حکومتوں کو تحفظ اور دائمی رکھنے کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے ورنہ سب کچھ ویران وتباہ ہوکر رہ جائے گا۔

(یہ مقالہ مورخہ 5 مئی 2002 کو ''بی ایس او'' کی طرف سے منعقد اس سیمینار کے لئے لکھا گیا جو گوادر میں مندرجہ بالا عنوان کے مطابق منعقد کیا گیا تھا)

روزنامہ ''انتخاب'' حب

29 مئی 2002ء

دہرا معیار

(Double standard)

روزنامہ ''انتخاب'' آج کل پاکستان کا قومی اسمبلی بنا ہوا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں پر پاکستان کے منتخب سیاست دان یا قومی نمائندے ایک دوسرے کی پگڑی اچھال رہے ہیں اور روزنامہ انتخاب کے کالموں میں بلوچستان کے سیاسدان اور دانشور حضرات ایک دوسرے کے بخیئے ادھیڑنے میں مصروف ہیں۔حالیہ چپقلش میں مبتلا انتخاب کے کچھ کالم میری نظروں سے گزرے اور سے میں محروم رہا خاص کر ''تیل فروشی'' والے کالم جس کا مجھے افسوس بھی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں پشاور گیا ہوا تھا اور پشاور میں آج کل انتخاب نایاب ہے۔کچھ سال پہلے پشاور کے ایک مخصوص بک اسٹال پر انتخاب ملتا تھا۔ایک نوجوان پشتون جس کا نام غالباً اورنگزیب تھا مرحوم میر غوث بخش بزنجو کی پارٹی ''بی این پی'' کا سرگرم رکن اور میر صاحب کا شیدائی تھا اور دوسرا یہ بندہ خاکی جس کا انتخاب اور انتخاب والوں سے جنم جنم کا رشتہ ہے۔

برحال لکھے ہوئے جو بچے کچے ٹوٹکے میری نظروں سے گزرے اس سے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں کچھ اندازہ ہوا اور یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی کہ اصل حقائق بہت تلخ ہوتے ہیں جس کا سامنا کرتے ہوئے سارا مزہ (Taste) تلخ سا لگتا ہے پانچ گنجے فرشتے ہمارے بھی استاد یار اور تمام خامیوں کے باوجود پیارے فرشتے، آج کل کے بال والے فرشتوں سے پھر بھی بہتر ہیں۔تیل فروشی، پھولوں کے زخم پتھر کے گھاؤ، کیا سچ کیا جھوٹ تک تو بات چلتی رہتی۔لیکن بات اس وقت بگڑی جب ماہکان دستونکی نے بال والے فرشتوں کا ذکر چھیڑا، یعنی بات شرابی فلم کی ''رومال'' کی ہے جس پر امیتابھ بچن کی طرح ہم بھی بہت صبر کرنے کے باوجود اپنے آپ کو نہ روک سکے۔

ماھکان دستونکی کے کالموں پر ''بی این پی'' (عوامی) جس کو میں نیم عوامی سمجھتا ہوں کا بھونڈا ردعمل، پھر بھی اسرار زہری قابل تحسین ہیں یہ ایک سردار زادہ ہونے کے باجود انہوں نے بڑے مہذب انداز میں لکھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔دوسری طرف میر مہیم خان بلوچ جو خان بھی ہیں اور بلوچ بھی، ہماری طرح ایک سابقہ غریب بچہ (آج کل نہ غریب ہے نہ بچہ) بی ایس او (سردار گروپ) کے سابقہ چیئرمین بی این پی (نیم عوامی) کا رہبر و رہنما موجودہ سینیٹر جس پر الزام ہے کہ انہوں نے ایک بلوچ خاتون صحافی کی ایسی توہین کی کہ بلوچ معاشرہ تو کیا دنیا کا کوئی بھی مہذب معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔یہیں سے بات بگڑی اور پھر بگڑتی چلی گئی، جس پر شدید ردعمل کا اظہار ہوا۔مہیم بھائی سیاست کرتے ہو تو سیاست کے آداب بھی سیکھو۔سیاستدان پبلک پراپرٹی ہے اسی پر پبلک کا پورا پورا حق ہے۔یہ کیا بات ہوئی کہ جب کہ اسی پبلک کے ووٹوں سے منتخب نمائندے حادثاتی طور پر سہی آپ کو سینیٹ جیسے ایوان بالا تک پہنچاتے ہیں تو آپ کی دل کا عارضہ

ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے اور جب ان ہی میں سے کچھ لوگ آپ کی غلطیوں، لرزشوں پر تنقید کریں تو آپ غنڈے بھیج کر ان کے کپڑے اتارنے کی دھمکی دیتے ہو چے، چے، چے، یہ سیاست نہ ہوئی بلکہ بقول امان اللہ گچکی یہ تو داؤد ابراہیم والا رول ہے جو آپ کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ اس لئے تو دانا لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ''نیم'' والے خطرناک ہوتے ہیں۔ چاہئے وہ نیم ملا ہو، نیم حکیم ہو یا نیم عوامی یہ سب خطرہ جان، خطرہ ایمان اور خطرہ سیاست ہوتے ہیں۔

مہیم بھائی یا تو پورا عوامی بنو یا پورا سردار والا یہ نیم سردار والوں کو ہمارے معاشرے میں کچھ اچھے نام سے یاد نہیں کرتے اور ایسے ہی لوگ ایسی حرکتیں کرتے پھرتے ہیں۔ مہیم بھائی جو وہ بنیادی طور سے ہمارے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا برادارنہ مشورہ ہے کہ اس مافیا کی طاقت پر جس کو طاقتور اسٹیبلشمنٹ نے وقتی طور پر آپ کی پشت پر لگا دیا ہے چنداں نازاں نہ ہوں یہ کسی بھی وقت اپنا سپورٹ کھینچ کر زمین پر پٹک دیتے ہیں اور ماھکان خاتون سے ہمارا یہ مشورہ ہے کہ ظرف دیکھ کر بات کیا کریں۔ ویسے ہمیں دونوں پر افسوس ہو رہا ہے۔

اگر کم ظرفی کا مظاہرہ نہ کیا جائے تو بات ماننی پڑے گی کہ یہ انور ساجدی اپنے انتخاب کے ذریعے اپنی عادت سے مجبور لوگوں کو جھنجھوڑتا رہتا ہے کچھ نہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے تاکہ بلوچ من الحیثیت قوم، اس کے سیاستدان اور دانشور ابدی نیند نہ سو جائیں۔ کسی نہ کسی طرح ان کو جگائے رکھتا ہے اپنی تحریروں کے ذریعے پورے معاشرے میں ارتعاش پیدا کرتا ہے رہتا ہے۔ نفع نقصان سے بے نیاز کبھی کبھی دانستہ یا نادانستہ سوئے ہوئے شیروں کو بھی پتھر مارنے کی غلطی کرتا رہتا ہے اور شیر حضرات اپنے اصل دشمن پر لپکنے کے بجائے انور ساجدی کو پنجے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں لیکن یہ کمبخت پھر بھی اپنی بچکانہ حرکتوں سے باز نہیں آتا اور کبھی کبھی ایسا روتا ہے کہ دوسروں کو بھی رونے پر مجبور کرتا ہے لیکن اس وقت روتا ہے جب اس کے زخم رسنے لگتے ہیں۔

آج اس پر ایک عجیب پچھتاوا کا جنون سوار ہوا ہے وہ یہ کہ کاش وہ اپنے پچاس ہزار ایکڑ ششک والے زمین سے دست بردار نہ ہوتے، امان اللہ گچکی کے بہکاوے میں نہ آتے، اپنے آپ کو سردار زادہ رہنے دیتے تو آج اگر بلوچستان کا وزیر اعلیٰ نہیں تو کم از کم ایک چھوٹا موٹا وزیر یا مشیر ضرور ہوتے اور یہ کہ ان کا لگایا ہوا پودا جو آج ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کے ثمرات عبدالمجید بزنجو کھا رہے ہیں شاید وہ کھا رہے ہوتے۔ انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ عبدالکریم بزنجو کو کون کھا گیا؟ البتہ انہوں نے اکیلے (امان نے نہیں) اپنی بنیادی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دراصل بنیادی غلطی امان اللہ اور میں نے کی ہے، ہم نے ایک پوری نسل تیار کی لیکن کسی ضابطے کے بغیر اور یہ پوری نسل ناخلف نکلی۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اور ہمارے کچھ ہم عصر اُس نسل میں شامل نہیں کیونکہ ہم انور ساجدی اور اس کی تیار کی ہوئی نسل سے پہلے امان اللہ کے بہکاوے میں آ گئے تھے اور اس پر ہمیں کوئی خاص پچھتاوا نہیں۔''

ہاں تو بات ہو رہی تھی امان اللہ اور انور صاحب کی تیار کی ہوئی ناخلف نسل کی، انور صاحب اس لئے تو دنیا نے بے شمار تجربات کے بعد معاشرے میں رہنے کے لئے کچھ ضابطے کچھ اصول مرتب کئے ہیں اور اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بغیر نکاح کا بچہ ناجائز ہوتا ہے۔ ضابطے

اوراصول کے بغیر کوئی بھی کام یا عمل ناجائز ہوتا ہے اور ناجائز ہمیشہ ناخلف ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں پھر بھی بات بنتی اگر اس ناخلف نسل کو آپ دنیا کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا کہتے سینے سے لگاتے ان کو یوں بھٹکنے نہ دیتے انفرادی مفادات کے بجائے اجتماعی مفادات پر قربان ہوتے تو شاید آج اس طرح پچھتاوے کے جنون میں مبتلا نہ ہوتے اب قصور کس کا ہے اس نسل کا یا اس نسل کو بغیر کسی ضابطے کے تیار کرنے والے کا؟ ایک نے تیل فروشی کی اور دوسرے نے اخبار فروشی اور ان کی تیار کی ہوئی نسل کیا ظاہر کرتی ہے زندہ رہنے کے لئے بلوچنوں کے بطن سے جنم دلانے والے بلوچ کو پالنے کے لئے ان کو بھی کچھ نہ کچھ فروشی کرنا پڑا اب اس کو آپ ضمیر فروشی کہیں یا کچھ اور یہ بھی آپ دونوں پر منحصر ہے۔

ہماری ناقص رائے میں آج کل جو کچھ بھی چھپ رہا ہے وہ سب ہم سب کی فرسٹریشن (Frustration) بلکہ شدید مایوسی کا نتیجہ ہے کسی کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا سب کے سب اپنے اصلی محوروں سے ہٹ چکے ہیں اب بھی وہی ہو رہا ہے بلکہ موجودہ نسل بھی بغیر کسی ضابطے کے تیار ہو رہی ہے اور اس کی تیاری میں بھی انور ساجدی اور امان اللہ کا بمعہ اپنے چار گنجے فرشتوں کے کہیں نہ کہیں رول موجود ہے اور اب بھی اگر کوئی ضابطہ کوئی اصول نہیں بنایا گیا تو یہ موجودہ نسل اس سے بھی زیادہ ناخلف ثابت ہوگی۔ کوئی آگے بڑھ کر منصور بننے کے لئے تیار نہیں۔ سب میں ایک چھپا ہوا درد، ایک کسک، ایک تڑپ ایک بے چینی موجود ہے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی والی بات، باندھے گا کون؟ اس لئے کہ سب کے چھوٹے بڑے مفادات، دوستیاں رشتے داریاں ہر عمل ہر چیز اور سب سے بڑھ کر سیاست میں یہ دھرا معیار سسٹم اور حکومت کا حصہ بھی اور مخالفت بھی اب حافظ حسین (جے یو آئی) اور لیاقت بلوچ (جے آئی) کو دیکھئے، دونوں بلوچ آج کل سیاست کے چمکتے ستارے کچھ عرصہ پہلے بلوچ بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک پڑھنے کے لئے تیار نہ تھے اور آج حال یہ ہے کہ ایک دوسرے سے پوچھے بغیر سجدہ تک نہیں کرتے حالات مشترکہ مفادات یا خود حکمرانوں کی حماقت نے ان کو ''ایم ایم اے'' کی شکل میں یکجا کیا، لیکن یہ دو بلوچ اور ایم ایم اے والے بھی دھرے معیار کے شکار ہیں۔ مرکز میں سینیٹر، ایم این اے دو صوبوں میں حکومتیں حصہ داری مراعات اسکیم وزارتیں اور دوسری ''ایل ایف او'' کا مارا حکومت اور سسٹم کی مخالفت اسی طرح پی پی پی مسلم لیگ (نواز) اے این پی وغیرہ یہی وجہ ہے کہ لاکھ ''مشرف گو گو'' کے باوجود حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اب آیئے ہمارے بلوچستان کی سیاسی قوم پرست پارٹیوں کی طرف، تقریباً تمام کے تمام قوم پرست پارٹیوں جے ڈبلیو پی، بی این ایم بمعہ بزنجو برادران اور بی این پی مینگل بمعہ بی ایس او بلوچستان کے حقوق، صوبائی خود مختاری ڈیرہ بگٹی کے حالات گوادر اور مکران کے میگا پروجیکٹ پر شدید تشویش، تحفظات، اختلاف حتیٰ کہ ان کی سرزمین وجود اور آبادی کو خطرات ان پر ان کی شدید ناراضگی اور حکمرانوں سے ٹاکرا لیکن دوسری طرف سسٹم کے حصہ، سینیٹر سے لیکر کونسلر تک اسکیم، مراعات ٹی اے، ڈی اے، مراعات کی مخالفت بھی کریں۔ نمک بھی کھائیں اور نمک حرامی بھی کریں، اب یہ سب کچھ یہ دھرا معیار عوام کو خاص بلوچ عوام کو پسندیدہ نہیں لگتا یہی وجہ ہے کہ کوئی خاص رسپانس

عوام کی طرف سے نہیں مل رہا ہے۔ ہاں البتہ دو بلوچوں نے انفرادی طور پر کچھ ہمت کچھ غیرت کا مظاہرہ کیا۔ ایک نے پورا اور ایک نے آدھا کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سردار ثناء اللہ زہری وزارت کے ساتھ ساتھ ایم پی اے شپ سے بھی استعفیٰ دے دیتے تو مزہ واہ واہ ہوتی۔ بہر حال جنرل عبدالقادر نے جب محسوس کیا کہ اس کی رائے کی حکمرانوں کے ایوان میں کوئی اہمیت نہیں تو انہوں نے بلا جھجک ایمپورٹڈ کاکڑ گورنر کے آنے سے پہلے مستعفی ہو کر یہ ثابت کیا کہ دھری معیار کی سیاست منافقت کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب خدا خدا کر کے بلوچستان کی قوم پرست پارٹیوں کے اندر کچھ نہ کچھ برف پگلتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ڈیرہ بگٹی اور گوادر کے تازہ ترین حالات یا خود حکمرانوں کی حماقتوں کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر دشمن سیاسی پارٹیاں یکجا ہونے پر مجبور ہوئی ہیں۔ گزشتہ ہفتے نواب محمد اکبر بگٹی صاحب کی وطن پرستی کے جذبے نے ایک مرتبہ پھر بی این پی مینگل، جے ڈبلیو پی اور بی این ایم کو یکجا کیا ہے۔ خدا کرے یہ ہمیشہ یکجا رہیں۔ لیکن اگر واقعی ان کو سنجیدگی، ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ یکجا ہو کر حکومت وقت کو چیلنج کرنا ہے اس کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانا ہے تو ان سب کو سیاست کے موجودہ دھرے معیار کے حصار سے باہر آنا ہوگا۔ ان کو اپنے اگلے مشترکہ اجلاس میں یہ ایجنڈا ابھی زیر بحث لانا ہوگا کہ آیا وہ اس سسٹم کے حصہ رہ کر وہ مقاصد حاصل کر سکتے ہیں جن کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا ان کو ان تمام مراعات والے عہدوں سے مستعفی ہو کر صحیح معنوں میں جدوجہد کی ضرورت ہے۔ میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ کم از کم یہ تینوں پارٹیاں اگر بلوچستان کے قوم پرست پشتونوں کو ساتھ ملا سکیں تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔ متفقہ طور پر سینیٹ قومی وصوبائی اسمبلیوں، ضلعی عہدوں ناظم نائب ناظم اور کونسلروں کے عہدوں سے بطور احتجاج مستعفی ہونے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اگر انہوں نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا تو نہ صرف پورے بلوچستان کے عوام بلکہ ملک کی تمام جمہوریت پسند قوتیں ان کی پشت پر ہوں گی اور باقی پارٹیوں اور صوبوں کے لئے ایک مثال ثابت ہوں گے پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے بھرپور عوامی قوت کے ساتھ آنے والے طوفانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن لیڈر شپ کے مسئلے کو حل کرنا ہوگا کیونکہ جھگڑا ہی فقط لیڈر شپ کا ہے باقی کوئی اخلاقی ایشو بظاہر نظر نہیں آتا۔ ایک مضبوط مشترکہ سپریم کمانڈ کی ضرورت ہے جو اجتماعی قیادت کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔

جب وہ سنجیدگی اور ایمانداری سے سمجھتے ہیں کہ موجودہ سسٹم میں ان کی کوئی جائز بات یا مطالبہ کوئی سننے سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے سرزمین، ان کی عزت نفس، ان کے وجود، حقوق اور آبادی کو جس سسٹم اور منصوبوں سے خطرات لاحق ہیں تو پھر ان اداروں میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ بہتر ہے کہ وہ مستعفی ہو کر اگلے الیکشن کے لئے اپنی عوام کو ایک متفقہ مشترکہ متحدہ پلیٹ فارم مہیا کریں تاکہ بلوچستان ہمیشہ کی طرح ایک منقسم مینڈیٹ سے بچ سکے اور اس کے لئے ابھی سے بھرپور تیاری کریں ہمیں یقین ہے کہ عوام ان کو پہلے کی طرح مایوس نہیں کرے گی کیونکہ حالات بتا رہے ہیں کہ اگلا الیکشن یا اگلا مارشل لاء کچھ زیادہ دور نہیں۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

9 دسمبر 2003ء

تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

کافی دنوں بلکہ مہینوں سے بلوچستان کے معروف عالم تاریخ دان بلند پائے کے دانشور جن میں میر امان اللہ گچکی ،صورت خان مری ،عبدالحکیم بلوچ ،رازق بگٹی ،طاہر بزنجو،مہر افلاک (جن کا اصلی نام پوشیدہ ہے)انور ساجدی ،بالاچ خان جس کو غالباً سب جانتے ہیں اور کبھی کبھار ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی ،منظور گچکی ،ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ ،ڈاکٹر کہور خان روزنامہ انتخاب کے کالموں کے ذریعے اپنے زریں خیالات کی زرافشانی کرتے رہتے ہیں جن سے انتخاب کے قارئین معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں بھی رہتے ہیں کہ دوسرے دن کون کس کے خلاف زہر افشانی فرمائے گا اور خود بقول امان اللہ کردار کشی کا جواب در جواب کا سلسلہ جنبانی جاری وساری ہے۔

حاصل لاحاصل کے اس دوڑ میں قارئین جیسے کوئی لمبی چوڑی قسط وار ٹی وی سیریل دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں کہ اگلی قسط کون سا موڑ لے گی اور اس ساری بحث میں کون ہیرو اور کون ولن ثابت ہوگا۔ گستاخی ہوگی اگر مجھ جیسا کم علم یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ان کالموں میں خاص کر چند بہت ہی معتبر اور بزرگوں کے لکھے ہوئے ان گوہر نایاب میں علمی یا اکادمی بحث وتمحیص کم ذاتی نوعیت کی الزام تراشیاں چپلقش رنجیشیں اور گلہ وماسیت زیادہ بھرا ہوتا ہے جس کا کوئی خاص بھرپور فائدہ نوجوان نسل کو نہیں پہنچ رہا ہے جس کی وہ ان بزرگ زیرک عالم و فاضل دانشور قلمکاروں سے توقع رکھتے ہیں البتہ زیادتی ہوگی اگر ہم رازق بگٹی کے لکھے ہوئے ''اے غم دل کیا کروں وہشت دل کیا کروں'' کی تعریف وتوصیف نہ کریں۔اس کالم میں نہ صرف غور وفکر بحث وتمحیص کے لئے بے انتہا فکر انگیز مواد موجود تھا بلکہ اس کا اسلوب انداز بیان طرز تحریر اس قدر جاذب پر اثر تھا کہ اس کی گونج اس کی صدا کئی دنوں تک دل ودماغ پر چھائی رہے گی جب تک کہ ہمارے بزرگ سیاسی رہنما سیاسی کارکن اور اعلیٰ پائے کے دانشور حضرات ان اٹھائے ہوئے نقاط کی روشنی میں کوئی لائحہ عمل اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ انہوں نے لکھنے سوچنے اور سمجھنے کے لئے ایک لائین ڈرا کی ہے جس کو فالو کر کے آگے بڑھا جا سکتا ہے۔اس حقیقت کو ہمارے سارے سینئر لکھاریوں نے تسلیم کیا ہے اب یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا ہے یا محض زبانی کلامی کیونکہ اس معاملے میں بلوچ قوم خاصا کنجوس واقع ہوئی ہے۔اپنے بزرگ سینئر دانشوروں اور لکھاریوں کے کالموں کے بارے میں ہم بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سانپ چلا گیا لکیر پیٹنے سے کیا حاصل؟ جس نے جس زمانے میں اپنی بساط کے مطابق جو کچھ کیا وہ سب قابل تعریف وتحسین ہے اب یہ کہنا کہ ایسا کرتے تو ایسا ہوتا ایسا کرتے تو ایسا نہ ہوتا یا میں نے ایسا اور انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب دے اور پھر در جواب! آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔؟ ہم مانتے ہیں کہ تاریخ کو کریدنے کے بغیر آگے درست سمت

کی طرف پیش رفت ایک کٹھن کام ہے لیکن اس کا ایک مثبت انداز اختیار کرنا چاہیے ذاتیات سے بالاتر ہو کر اس سارے اجتماعی عمل پر نظر رکھنی چاہیے جس میں یا تو ہم سب مجرم ہیں یا سب معصوم اجتماعی نفرتوں غلطیاں جس میں حقیقت پسندی کم اور توقعات زیادہ ہوں اس پیرائے میں جانچنے پر رکھنے کی ضرورت ہے اور ہم سب کو کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم سب نے دانستہ یا نادانستہ جو غلطیاں کیں ہیں اس کو ہماری آنے والی نسل نہ دہرائے کیونکہ اس سے محض نقصان ہی ہوا ہے اور وہ بھی اجتماعی نقصان ہوا ہے۔ اب ان تمام نقصانات کا ازالہ کیسے کیا جائے؟ یہی سوال پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ سوال اس وقت یہ نہیں کہ کس نے کیا کیا بلکہ سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے آیا جن باتوں پر ہم جھگڑ رہے ہیں ایک دوسرے کی کردار کشی پر اتر آئے ہیں وہ کوئی اجتماعی مسئلہ ہے یا انفرادی؟ اگر انفرادی مسئلہ ہے تو لڑتے جھگڑتے رہو لیکن جو کچھ آپ لکھ رہے ہیں سوچ رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں وہ سب اجتماعی مسائل ہیں تو پھر اجتماعی کے لئے مضبوط مربوط تنظیم کی ضرورت ہے جس کے فقدان کی وجہ سے یہ سارے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

اس تنظیم کاری میں بھی مسئلہ ہے کہ ''میں نے ذبح نہیں کیا ہے تو حلال نہیں'' بلکہ پہلے بھی یہی مسئلہ تھا اور اب بھی بنیادی مسئلہ یہی ہے جس پر جھگڑا چل رہا ہے ایک اور مسئلے کی نشاندہی رازق بگٹی نے کی ہے کہ سیاست کاری میں پارلیمانی سیاست کو بھی ساتھ ساتھ جاری و ساری رکھنا ضروری ہے اس پر انہوں نے لینن جیسے برگزیدہ سیاسی پنڈتوں کے اقوال زریں بھی اپنے کالم میں پیش کئے ہیں اس پر بھی اچھی خاصی بحث کی ضرورت ہے بلکہ ان دونوں بنیادی سوالوں پر بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ بحث تمحیص کی ضرورت ہے۔

حقیقت میں تو دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ ہمارے بنیادی قومی سوال کے مسئلے کو بغیر کسی سیاسی تنظیم کے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اس ضمن میں موجودہ سیاسی پارٹیوں میں کون سی پارٹی کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس پر بھی ذبح کرنے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو پھر کوئی نئی سیاسی پارٹی بننی چاہیے لیکن اس کو بنائے گا کون؟ میرے خیال سے اس کون پر فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہے اس لئے ان ہی موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا البتہ ان کو مزید فعال یا اپنے مقصد کے قریب تر لانے کے لئے ان تمام عالم و فاضل تاریخ دان بہترین ذہن بہترین تجزیہ کرنے والوں کی ضرورت ہے جو مذکورہ پارٹی کو صحیح سمت کی طرف پیش قدمی کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں۔

ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ بی این ایم اور بزنجو برادارن نے ہمت کرتے ہوئے ایک مثبت پیش رفت کی ہے الیکشن اور سیٹوں کی خاطر سہی جیسا کہ ان پر الزام ہے لیکن انہوں نے کچھ نوجوان سیاسی کیڈروں کو منتشر ہونے در بدر اور بھٹکنے سے بچا لیا۔ اب اگر یہ سلسلہ کچھ اور گے بڑھ سکے جیسا اب نیشنل پارٹی اور جے ڈبلیو پی یا بی این پی (مینگل) کے ساتھ انضمام اور اگر یہ ممکن نہیں (وہی ذبح کرنے والا مسئلہ ہے) تو کم از کم بنیادی قومی سوال یا صوبائی خودمختیاری جیسے چند نقاط پر دل و جان سے عملی طور پر اتفاق یا متفقہ لائحہ عمل جیسا کہ مذہبی جماعتوں نے اپنی اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایم ایم اے بنایا اور خوب فائدے میں رہے یہ محض ایک مثال ہے لیکن کسی بھی اچھے اقدام یا عمل کی تقلید میں کوئی برائی نہیں اس طرح سے پارلیمانی اور غیر پارلیمانی دونوں میدان میں کام کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے

اندر (Tolerance) برداشت اور صبر کا مادہ ہو۔

میری ناقص رائے میں بجائے کردار کشی یا ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے اگر ہم اپنی باتوں پر توجہ مرکوز کریں ان پر بحث و تمحیص کو آگے بڑھائیں قومی و صوبائی خودمختیاری کے سوال پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں ان نقاط پر عملی انداز تحریر اختیار کریں تو یہ نہ صرف ہمارے سینئر جونیئر نوجوان نسل دانشوروں ذہانت کاروں کے حق میں بہتر ہوگا بلکہ اپنے آپ اور پوری قوم پر ایک بہت بڑا تاریخی احسان ہوگا۔

بے ادبی معاف! اب اس عمر میں امان اللہ گچکی، صورت خان مری، طاہر، حکیم، انور ساجدی، منظور گچکی یا ڈاکٹر مالک کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے کالموں میں ایک دوسرے کی ذات پر اس انداز سے کیچڑ اچھالنے میں اپنی توانائی تاریخ دانی فکر و دانش ضائع کرتے رہیں یہی تو ہمارے پاس چند گنے چنے لوگ ہیں جو بلوچستان کی جدید و قدیم سیاست سے آگاہی رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے تجربات مشاہدات اور علم سے لوگوں کو آنے والی نسلوں کو فائدہ پہنچائیں لکھنا تو روشنی لکھنا اپنی علمی صلاحیتوں سے ہمت و حوصلہ پیدا کریں صحیح سمت کی طرف رہنمائی فرمائیں۔ میں ایک مرتبہ پھر گزارش کروں گا کہ ماضی میں جو غلطیاں لرزشیں ہم سب سے دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان تلخ تجربات کی روشنی میں مستقبل کی پیش بینی کریں اس ''مادنیں راہ'' کی نشاندہی کریں جس پر چل کر سب کا بھلا ہو واقعی مایوسی کفر ہے لیکن اس کفر کے مثبت منفی پہلوؤں پر بغیر کسی کو دکھ پہنچائے روشنی ڈالیں طنز و نشتر کے ایسے انداز اختیار نہ کریں جس سے کسی کی دل آزاری ہو اور پھر جواب در جواب نہیں لکھ سکتے وہ بارود کی بدبو پھیلا کر بے گناہ خواتین اور معصوم بچوں کو خوفزدہ کرنے کو بہادری سمجھیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کی بھونڈی حرکتوں سے قلم کار کی قلم کو یا اس کی فکر بالیدگی کو نہیں روکا جا سکتا ''تو یہ سرانی گڈگ ءَ زندءِ حیالان ءَ کُشے'' فکر خیالات دانش فلسفہ کو کوئی بارود کوئی ہتھیار ختم نہیں کر سکتا وہ تو خوشبو کی طرح پھیلتی ہیں ایک ذہن سے دوسرے میں اس خاموشی کے ساتھ منتقل ہو کر سرائت کرتی رہتی ہیں جس کا خود جسم تک کو احساس نہیں ہوتا۔ بارود کی بدبو پھیلانے والے سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن علم و دانش رکھنے والے مہذب لوگ اگر یہ کہیں تو دکھ ہوتا ہے کہ:

''ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے''

روزنامہ ''انتخاب'' حب

1 دسمبر 2003ء

گوادر ماسٹر پلان۔۔۔۔ایک جائزہ

گوادر ماسٹر پلان ملکی اور بین الاقوامی سطح پر موضوع بحث بنا ہوا ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مکران ڈویژن میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے بڑے پروجیکٹس شروع کئے گئے ہیں جواب اپنے تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں گوادر ڈیپ سی پورٹ، کوسٹل ہائی وے اور میرانی ڈیم ان تینوں پروجیکٹس ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اور ان تینوں میگا پروجیکٹس کا منبع ومخرج گوادر شہر ہے۔ جس کے لئے نیسپاک والوں نے ایک خاکہ گوادر ماسٹر پلان کے نام سے تیار کیا ہے جس کو سرکاری اہلکار بہت ہی متبرک سمجھتے ہیں ان پروجیکٹس خاص کر گوادر ڈیپ سی پورٹ کی بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر وقتاً فوقتاً مختلف ممالک کے سفراء، اعلیٰ عہدے دار، شپنگ اور انشورنس کمپنیوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین گوادر کا دورہ کرتے رہتے ہیں اسی مہینے فرانس کے سفیر نے ایک دن کے لئے گوادر کا وزت کیا تھا۔ان سب کی خاص دلچسپی گوادر ماسٹر پلان پر ہی رہتی ہے اور تمام تر بریفنگ اسی بنے بنائے ماسٹر پلان کے تیار کئے خاکہ کے مطابق ان کو دی جاتی ہے لیکن محض بریفنگ کی حد تک عملاً زمین پر تادم تحریر کوئی کام شروع ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کا براہ راست گوادر ماسٹر پلان پر عملداری کا تعلق ہے وہ خود لوگوں سے زیادہ کنفیوز ڈ لگتے ہیں۔

موجودہ گورنر بلوچستان اویس غنی صاحب نے اپنے حالیہ دورہ گوادر کے دوران اعلان فرمایا تھا کہ 8 مئی 2004ء کو گوادر ماسٹر پلان کو حتمی شکل دے کر اس کا باضابطہ اعلان کیا جائے گا لیکن 3 مئی کو اچانک صبح سویرے گوادر میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں دوست ملک چین کے تین انجینئر ہلاک اور دس زخمی ہوگئے جو گوادر ڈیپ سی پورٹ پروجیکٹ پر کام کررہے تھے گوادر کی تاریخ میں یہ بالکل ایک انوکھا حیران کن مگر بہت ہی المناک واقعہ تھا جس نے پوری دنیا اور سارے میڈیا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر کے رکھ دی۔ یہ دھماکہ ایسے وقت کیا گیا جب پورٹ اپنے تکمیل کے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا اس دھماکہ نے سیکورٹی انتظامات کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا ایک سراسیمگی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے گوادر ماسٹر پلان کے بارے میں 8 مئی کا طے شدہ اعلان تعطل کا شکار ہوکر رہ گیا غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اسی موجودہ ماسٹر پلان کے خاکہ کو حتمی قرار دیا گیا ہے اگر واقعی یہ سچ ہے اور اسی ماسٹر پلان پر عمل درآمد کو سرکار نے اپنی ضد اور انا کا مسئلہ بنایا ہے تو پھر گوادر کی مقامی صدیوں پرانی آبادی صفحہ ہستی سے مٹتی نظر آرہی ہے اور انہی خدشات اور خوف نے گوادر کی مقامی آبادی کا جینا حرام کر کے رکھ دیا ہے اور مختلف سیاسی پارٹیاں چاہے ان کی سوچ مثبت ہو یا منفی اس کا بھرپور سیاسی فائدہ اٹھانے کی ٹھانی ہوئی ہیں جو آنے والے دنوں میں لوگوں اور سرکار کے لئے کافی مشکلات کا سبب بن سکتی ہیں اگر مقامی آبادی ان کے حقیقی مثبت سوچ کے حامل بزرگوں اور رہنماؤں کو اعتماد میں لئے بغیر اس ماسٹر پلان پر عمل درآمد کیا گیا تو یقیناً ان کی ہمدردیاں بھی خواہ مخواہ

ان منفی سوچ رکھنے والے قوتوں کے ساتھ ہوں گی جو اس سارے ترقیاتی عمل کو سبوتاژ کرنے پر تلے ہوئے ہیں یا اس کو محض اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

کہتے ہیں'' کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے'' مقامی لوگ کھونے کے لئے تیار ہیں لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔اب سوال یہ ہے کہ ان میگا پروجیکٹس کے تکمیل کے بعد کھوتا کون ہے اور پاتا کون، یقیناً کھوتا وہی جو کمزور ہے اور کمزور ہمیشہ زیادہ کھوتا ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب یہ کھونے اور پانے کا مرحلہ گزر چکا ہے محض کھونا ہی کھونا ہے۔لیکن ہماری ناقص رائے کے مطابق اس میں دیر ضرور ہوئی ہے لیکن اس قدر بھی دیر نہیں ہوئی کہ اس کی اصلاح نہ ہو سکے بشرطیکہ ہمارے مرکزی اور صوبائی حکمران اس سرزمین اور یہاں پر بسنے والے لوگوں کے ساتھ مخلص ہوں۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہماری صوبائی حکومت یا حکمران چاہے وہ بلوچ ہوں یا پٹھان ان کا تعلق چاہے مسلم لیگ سے ہو یا جمعیت یا کسی جماعت سے اقتدار پر براجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ان میگا پروجیکٹس کے بارے میں مرکزی حکومت سے کچھ تحریری ضمانتیں مانگتے لیکن بقول ایک سرکاری اعلیٰ عہدیدار کے موجودہ صوبائی حکومت حکمران تو ایک فوجی میجر کو دیکھتے ہی کانپنے لگ جاتے ہیں اس لئے وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ اس ماسٹر پلان کے بارے میں اپنے لوگوں کے حقوق کا تحفظ کر سکیں اور نہ اس پوزیشن میں ہیں کہ اس ماسٹر پلان کے بارے میں کوئی تسلی بخش وضاحت پیش کر سکیں وہ تو محض ہوا میں تیر اندازی کر کے خوش ہو رہے ہیں کہ ان میگا پروجیکٹس کے تکمیل کے ساتھ ہی گوادر بلکہ پورا بلوچستان سعودی عرب بن جائے گا لوگ مالا مال ہوں گے اور گوادر کے مقامی لوگ شیخ بن جائیں گے جب کہ اسی ماسٹر پلان کے مطابق وہ اپنی صدیوں پرانی جائیداد اور سرزمین سے محروم بے دخل ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں گوادر کی تاریخی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ کم از کم تین مرتبہ وہاں کی صدیوں پرانی آبادی، رہنے بسنے والوں سے پوچھے بغیر ان کی رائے جاننے بغیر فروخت ہوتی رہی ہے پہلی مرتبہ خان قلات نے سلطنت مسقط عمان کے ایک حکمران کو بخش دیا تھا پھر مسقط عمان نے اس کو 1958ء میں پاکستان کے ہاتھوں فروخت کیا اور اب نہ معلوم پاکستان کے حکمرانوں نے کن کن عالمی طاقتوں سے اسی سرزمین کا سودا کن شرائط کے ساتھ کیا ہے اور اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر لوگوں کی مرضی اور رائے لینے میں کون سی دشواری پیش آ رہی ہے۔؟

ہو سکتا ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف کا نیت صاف ہو لیکن وہ نیک نیتی سے اس پسماندہ علاقے کی پسماندگی پر پہلی مرتبہ توجہ دے رہے ہیں اور لوگوں کے اس دیرینہ مطالبات پر کہ ہمیں انہیں پورٹ، روڈ، پانی اور بجلی چاہئے اخلاص سے عمل درآمد کا آغاز کر چکے ہیں لیکن جو لوگ ان پر عمل درآمد پر مامور ہیں وہ خواہ مخواہ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور ان مشکلات کی تمام جڑ ماسٹر پلان ہے جو تا حال متنازعہ بنا ہوا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا یہ حقیقت ہے کہ گوادر کے مقامی لوگ بلکہ پورا مکران ڈویژن ان میگا پروجیکٹس کی حمایت کرتے تھے شاید اب بھی کرتے ہیں لیکن آج کے ترقی یافتہ اس طاقتور میڈیا کے دور میں بھی وہاں کے مقامی لوگوں کو جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا جائے اور پھر یہ توقع کرنا کہ لوگ ان کے لئے نکل کر لیوا یا بنگھڑ ڈالیں نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ میگا پروجیکٹس پورے ملک اور مقامی لوگوں کے مفاد میں ہیں تو ان کو اس قدر پراسرار بنانے کی کیا ضرورت ہے کیوں نہ ہم کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ لوگوں کی مثبت سوچ مشاورت اور تجاویز کو اس میں شامل کر دیں اور اپنے ملکی وسائل کی ضیاع کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں اور اپنے مخالفین کو کم سے کم کرنے کی کوشش کریں۔ ہم نے اس گوادر ماسٹر پلان کے بارے میں جب گوادر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے سرکردہ اہل کاروں سے تفصیل جاننے کی کوشش کی تو ہمیں ایسا لگا کہ وہ بھی اسی ماسٹر پلان پر عمل درآمد کرنے پر مجبور و لاچار ہیں ان کے مطابق گوادر ویسٹ بے (پدی زر) سمندر کے ہائی ٹائیڈ (وہ بھی جون جولائی کے) کے نشان سے 130 میٹر اندر آبادی کی طرف تک پوری صدیوں پرانی آبادی کو اٹھانا ہے اور ایسٹ بے (دیمی زر) ہائی ٹائیڈ سے 300 فٹ آبادی کی طرف بھی کئی کلومیٹر آبادی کو اٹھانا ہے اور اندر شہر بھی 500 فٹ کی سڑک کو چیر پھاڑ کے نکالنی ہے جس سے ہزاروں گھر بمعہ اپنے مکینوں کے بے دخل ہو کر رہ جائیں گے اس کے علاوہ گوادر نیو ٹاؤن جو اس علاقے میں حکومت کی پہلی منظور شدہ پلان ہاؤسنگ اسکیم ہے بھی اس ماسٹر پلان کی زد میں آ رہا ہے ہم نے عرض کیا کیا اس کا کوئی اور بہتر طریقہ کار نہیں ہو سکتا اول تو سارے صدیوں پرانے مکانات اور ان کے مکینوں کو بے دخل کرنا پھر ان کے لئے معاوضہ اگر واقعی معاوضہ دینے کا ارادہ ہے کا تعین کرنا اور وہ بھی آج کے مارکیٹ ریٹ کے حساب سے اتنے پیسے کہاں سے لاؤ گے ان کو آباد کرنے کے لئے ان کو تمام تر سہولیات پہنچانے کے لئے نہ حکومت کے پاس زمین ہے نہ وسائل تو بہت بڑا مسئلہ ہے ابھی تک تو ایک چھوٹا سا محلّہ جس کو ملا بند وارڈ کہتے ہیں اور اس کی آبادی بالکل پورٹ کے اندر آ گئی ہے اس کا مسئلہ حل نہیں ہوا ہے نہ ان کے مکانات کا کوئی معاوضہ طے ہوا ہے اور نہ حکومت نے ان کے لئے ابھی تک کوئی زمین مخصوص کی ہے وسائل پہنچانے کی بات تو بعد کی ہے۔

نہ صرف ہم نے بلکہ ہر فہم و فراست رکھنے والے شخص نے ہمیشہ یہی مشورہ دیا ہے کہ بجائے اس قدر سر دردی مول لینے کے بہتر ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے مطابق سمندر سے زمین (Re-Claim) کریں اس کے جواب میں ''جی ڈی اے'' والے فرماتے ہیں کہ ان کے پاس زمین بہت ہے وہ کیوں اپنی ساحل کو خراب کریں اور وہ زمین بھی ہنستے بستے آبادی کو اکھاڑ پھینکے کے بعد ان کو دستیاب ہو گی یعنی ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں گے لیکن ساحل خراب نہ ہو۔ یہیں سے خرابی پیدا ہوتی ہے خدشات و تحفظات جنم لیتے ہیں آخر ساحل کو کس لئے خراب نہیں ہونے دیتے ہو ایک تو یہ تاثر بنتا ہے کہ شاید یہ دنیا کا واحد پورٹ ہے جو اپنی تکمیل کے بعد اپنی پوری آبادی کو کھا جائے گی دبئی، بحرین، کویت، سعودی عرب اور ایران جو ہمارے نزدیکی ہمسایہ ممالک ہیں ان سب جگہ کئی سال پہلے پورٹ (بلکہ کئی پورٹ) بنے ہیں لیکن سوائے بہت ہی ناگزیر حالات میں کسی نے بھی اپنی پرانی آبادی کو خواہ مخواہ نہیں چھیڑا ہے حالانکہ یہ ممالک بے شمار وسائل کے مالک ہیں دبئی جیسے بہت ہی ترقی یافتہ شہر میں آج بھی پرانی آبادی موجود ہے۔ اسی طرح سارا قذیبہ بحرین کی پرانی آبادی جوں کی توں ہے البتہ انہوں نے زمین سمندر سے (Re-Claim) کیا ہے بڑے آرام سے آہستہ آہستہ کروڑوں خرچ کر کے اربوں کمائے ہیں خود کراچی کو لیجئے ایک زمانہ تھا جب کلفٹن میں سمندر کی موجیں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے پیچھے ٹوٹتی تھیں اور آج وہ موجیں کئی کلومیٹر دور بلکہ اب

یہاں سے ساحل نظر ہی نہیں آتا ٹوٹ رہی ہیں درمیان میں ایک حفاظتی پشتہ بھی تعمیر کیا گیا ہے سمندر اپنے ہی مدوجذر کے ساتھ چل رہا ہے ساحل مزید خوبصورت ہوگیا ہے۔ ہزاروں لوگ روزانہ ساحل کے کنارے بھاگتے، دوڑتے، کھیلتے گھوڑے، اونٹ دوڑاتے نظر آتے ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ڈی اے والوں نے لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے اربوں روپے کی زمین سمندر سے نکالی اور اپنے وسائل میں ناقابل یقین حد تک اضافہ کیا۔ سینکڑوں پلازے، فلیٹس، ہوٹلز، رہائشی بے شمار مکانات تعمیر ہوئے اور کچھ اب بھی زیر تعمیر ہیں یہاں گوادر میں تو فقط 130 میٹر زمین چاہئے جس کے لئے یہ ماسٹر پلان پوری آبادی کو تہہ و بالا کرنے پر تلا ہوا ہے۔

ہم نے سنا ہے کہ موجودہ گورنر بلوچستان اویس غنی صاحب خود ایک آرکیٹیکچر انجینئر ہیں اور اگر ہمارا سنا ہوا سچ ہے تو ان کا اس ملک اور علاقے کے بہتر مفاد میں یہ فرض بنتا ہے کہ زمینی حقائق پر توجہ دیں اور کھلے دل کے ساتھ تسلیم کریں کہ کھنڈرات پر تعمیرات کرنا کتنا بڑا جرم ہے کھنڈرات ہماری تاریخ اور ہماری تہذیب و تمدن ہیں ان کو محفوظ رکھنے کے لئے ترقی یافتہ مہذب ممالک سالانہ اربوں روپے اپنے قومی بجٹ میں مخصوص کرتے ہیں بلکہ وہ ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کا کھوج لگانے کے لئے کس قدر مالی وسائل انسانی محنت داؤ پر لگاتے ہیں۔ یہ تو ایک جیتی جاگتی آبادی ہے آگے حکمران جانیں ان کا کام جانے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

20 مئی 2004ء

قوم پرستوں کا یوٹرن

ملک میں بلدیاتی الیکشن اپنی آب وتاب، جاہ وجلال، گرم وسرد دھاندلیوں کے الزامات وجوابی الزامات سے گزر کر منطقی انجام (وہ منطقی نہیں) یعنی تیسرے مرحلے میں داخل ہونے والا ہے اہل نظر بلکہ سیاسی زبان میں اہل سیاست کو پہلے دو مراحل میں جو تماشا دکھایا گیا ان کو اندازہ لگانے اور سمجھنے کے لئے کافی تھا لیکن طاقت، اقتدار اور جاہ وجلال کی کوشش ہی ایسی ہوتی ہے کہ سنتے کانوں اور دیکھتی آنکھوں کو سب کچھ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ شاید اس مرتبہ اقتدار کا ''ہما'' ان کے سر بیٹھ جائے۔

یوں تو سن کر ہمارے ملک میں ہر فوجی دور اقتدار میں لوکل باڈیز کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن اس مرتبہ معاملہ کچھ زیادہ ہی دلچسپ بلکہ حیران کن اس طرح ہے کہ ایوان بالا ایوان زیریں میں صوبائی، قومی اور سینیٹ جیسے اداروں کے ممبران بلدیاتی ناظمین کے عہدوں کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں بلکہ کئی مرکزی وزراء نے بھی کوشش کی کہ وہ بجائے مرکزی وزیر ہونے کے کسی نہ کسی طرح ضلع یا سٹی ناظم بن جائے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ ادارے زیادہ بااختیار ہو گئے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں کھانے پینے اور ہضم کرنے کے زیادہ مواقع وافر مقدار میں موجود ہیں اس سارے عمل سے ہمارے ملک کے سیاستدانوں کے معیار اور منجملہ ملک میں سیاست کے زوال کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

موجودہ فوجی حکمرانوں نے اقتدار سنبھالتے ہی قوم سے وعدہ فرمایا تھا کہ اس مرتبہ صحیح اور حقیقی معنوں میں اختیارات کو نچلی سطح یعنی یونین کونسل کی سطح تک عملی طور پر منتقل کر کے مرکزی حکومت کے اختیارات کو محدود سے محدود کر لیا جائے گا تا کہ ملک کے عوام حقیقی معنوں میں اقتدار میں شریک ہو سکیں۔ بہت سے لوگوں نے بشمول ہم جیسے ناقص العقل لوگوں نے بھی یقین کر لیا تھا کہ اب ایسا ہی ہوگا جیسے جنرل پرویز مشرف فرما رہے ہیں کیونکہ اس سے پہلے سارے فارمولے آزمائے جا چکے تھے اس یقین کرنے کے پیچھے کچھ معقول جوازیوں موجود تھے کہ شروع شروع میں جنرل موصوف کی انتظامیہ نے ان لوگوں پر ہاتھ ڈالا تھا جو نہ صرف سرکاری سطح پر تمام اثبات کے ساتھ مجرم ثابت ہوئے تھے بلکہ عوام کی نظروں میں بھی وہ چور رشوت خور لوٹ مار کرنے والے سیاست کار سرکاری اہل کار تھے۔ جب ان کو جنرل صاحب نے ٹھیک ٹھاک سزائیں دیں تو عوام کے اندر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سب کو یقین ہو گیا کہ جنرل پرویز مشرف پاکستان کا ''اتاترک'' یا ''امام خمینی'' ثابت ہونگے ملک میں سارے گند کو صاف کر کے شفاف الیکشن کرائینگے اور اختیارات کو صوبوں اور بلدیاتی اداروں میں نیک نیتی سے منتقل کرینگے اور یہی اس ملک کی سالمیت کے مفاد میں تھا۔ لیکن ''اے آرزو کہ خاک شدم'' کے مصداق یہ سب کچھ پہلے کی طرح محض ایک خواب ہی ثابت ہوا سارے نیب زدہ سیاستدان سرکاری اہلکار چور رشوت خور لوٹ مار کرنے والے ایک مرتبہ پھر صاف شفاف بن

کر جنرل صاحب کے رفیق کار بن گئے اور ملک کے عوام کو دھوکہ دے کر ایک مرتبہ پھر Statusco کو برقرار رکھا گیا اور وہ بھی بندوق کے زور پر جس کو اتاترک یا امام خمینی ثابت ہونا تھا وہ روم کا نیرو اور افغانستان کا بچہ سکہ بن گیا اس پر ہم عوام محض افسوس ہی کر سکتے ہیں۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ اور ہیں کہا تو یہ گیا تھا کہ ان بلدیاتی الیکشن کے ذریعے Devolution of power ہوگا لیکن عملاً اس کو Centerlization of power بنایا گیا کیونکہ جس انداز سے ساری مرکزی ایجنسیوں نے براہِ راست ان بلدیاتی الیکشن میں مداخلت کر کے حکمرانوں کے قول وفعل کے تضاد کو نمایاں کر دیا اس کی مثال پہلے بھی موجود تھی اور یہی اس ملک کے حکمرانوں کا طرہ امتیاز رہا ہے قول وفعل کے اس تضاد میں کوئی حکمران کتنا ہی کوئی اچھا کام کرے لوگ اس کو منفی انداز میں لینے لگتے ہیں۔ جہاں تک موجودہ حکمرانوں کی ساکھ یا کریڈیبلیٹی کا مسئلہ ہے اس کو تو پہلے ہی ریفرنڈم نے متاثر کیا ہوا تھا اور جو رہی سہی کسر باقی رہ گئی تھی اس کو موجودہ بلدیاتی الیکشن نے پوری کر دی ہے۔ ان انتخابات میں ہم نے یہ دیکھا کہ جس پینل کے امیدواروں کو لوگوں نے پہلے دو مرحلوں میں اکثریت سے ووٹ دیا تھا تیسرے اور آخری بلکہ اہم ترین مرحلے میں وہ الیکشن سے پہلے ہارتے ہوئے نظر آرہے ہیں ثابت یہ ہوا کہ عوام کے ووٹوں کی کوئی قدر و قیمت دقعت نہیں بلکہ ''وہی سہاگن جو پیا من بھائے'' تو پھر اس سارے عمل کی کیا ضرورت تھی قومی خزانے پر اس قدر بھاری بوجھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ کسی فوجی جنرل کو جو مارشل لاء نافذ کر کے ملک کا نظم ونسق سنبھالتا ہے الیکشن کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ خود کسی الیکشن کے پروسس سے گزر کر حکمران نہیں بنا تو وہ دوسروں کو یا پوری قوم کو اس عذاب میں کیوں مبتلا کرتا ہے؟ اگر دنیا نہیں مانتی ہے تو نہ مانے البتہ فوجی حکمرانوں کے لئے عوامی مینڈیٹ ثابت کرنے کے لئے ریفرنڈم ہی سب سے بہترین ذریعہ ہے ہوسکتا ہے موجودہ بلدیاتی ادارے آگے چل کر صدارتی نظام حکومت نافذ کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں جیسا کہ میڈیا کے ذریعے اشارے مل رہے ہیں اس تجزیہ کے بعد ہم آتے ہیں اپنے قوم پرستوں کی طرف جو سمجھتے ہیں کہ ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے'' اس وقت ان کی حالت قابل رحم ہے اس حالت میں ان کو دیکھ کر ہمیں اور ان کے دوسرے ہمدردوں کو شدید دکھ پہنچا ہے کیونکہ یہ سب ہمارے اپنے ہیں ان کے نفع ونقصان ہمارے ہیں بلدیاتی الیکشن میں ان کی آب وتاب تگ ودوڑ دیکھ کر ہم سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے اپنے معاملات مقتدر لوگوں کے ساتھ درست کر لئے ہیں کیونکہ پہلے دو مراحل کے انتخابات کے نتائج سے لگ رہا تھا کہ اس مرتبہ تمام مقامی حکومتوں پر ان کا غلبہ ہوگا اور عوامی وباء کے نتیجے میں عوام کو ان کے ذریعہ کچھ نہ کچھ ریلیف ضرور ملے گا لیکن جوں جوں شہری اور ضلعی ناظمین کے اہم ترین مرحلہ قریب آرہا ہے قوم پرستوں کی اچھی اچھی وکٹ کو کھیلنے سے پہلے گراؤنڈ سے باہر کر دیا گیا ہے لگتا کچھ یوں ہے کہ ہمارے قوم پرستوں نے بہت ہی نچلی سطح پر اپنے رابطے استوار کرائے تھے اس لئے ان کی

ساری خواہشات پر پانی پھیرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پہلے دو مراحل میں ان کو لولی پاپ سے بہلایا گیا اور اب ان کو یوٹرن لینے پر مجبور کیا گیا یوٹرن بھی ایسا کہ خود ان کے اپنے بہترین کارکن دھنگ رہ گئے ہیں جس پارٹی اور نام سے وہ ساری زندگی الرجک تھے اب اس کے ساتھ اتحاد کر رہے ہیں اور وہ بھی بڑے سستے دام میں یعنی نائب ناظم کی حد تک۔

ویسے تو ہمارے قوم پرست سیاست میں عملیت پسندی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہماری ان سے محض یہ استدعا ہے کہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کے بجائے بلوچ عوام اور صوبے کے بہترین مفاد میں وہ سب ''نیشنل پارٹی'' (عوامی) کے ساتھ مل کر سیاست کریں اگر ہو سکتا ہے تو دونوں نیشنل کو ایک کر کے ملک اور قوم کی خدمت کریں یہ دونوں کے حق میں بہتر ہوگا خدا کرے ہماری باتیں دونوں نیشنل والوں کو پسند آ جائیں۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

29 ستمبر 2005ء

’’سیلاب کو نہ روکیئے رستہ بنایئے‘‘

آج کل بلوچستان پر دو طرح کے عذاب نازل ہو رہے ہیں ایک حکمرانوں کی طرف سے دوسرا قدرت کی طرف سے شاید یہ ہمارے ان بزرگوں کی غلطیوں یا کردہ گناہوں کی سزا ہے جنہوں نے ’’رابرٹ سنڈیمن‘‘ کو بلوچستان کا راستہ دکھایا تھا یا جنہوں نے اسی ملک کے بانی ’’قائداعظم محمد علی جناح‘‘ کو سونے سے تولا تھا یا ان کی جنہوں نے کوئٹہ میونسپل ہال کے منعقدہ جرگہ میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

ایک طرف فوجی آپریشن کی دہشت ہے تو دوسری طرف قدرتی آفات بارشیں سیلاب ان سب کو راستہ چاہیئے راستہ کا تعین کون کہاں کس حد تک کرے گا؟ حکمران، لیڈراں سردار یا سرِ دار کچھ پتہ نہیں۔ سب کے سب اپنے کوروں کے گرد تنگ حصا بنا کر ڈٹ گئے ہیں حکومت کو اپنا رٹ چاہیئے بلوچوں کے حقوق صوبائی خودمختاری دکھ کی بات یہ ہے کہ 57 سال گزرنے کے باوجود اب بھی حکمرانوں کو بلوچستان پر اپنے حکمرانی کی رٹ پر شک ہے ایک منتخب صوبائی حکومت ان کا اپنا ماسٹر وائس وزیر اعلیٰ، مذہبی جاعتوں ’’ایم ایم اے‘‘ کی حمایت، پولیس، لیویز، بی آر پی، ایف سی کوسٹ گارڈ، مسلم لیگ (ق) اور سب سے بڑھ کر فوج، یہ سب کے سب رٹ نہیں تو پھر اور کیا ہے ؟ پھر بھی تصادم کی بات ہو رہی ہے اور اسی تصادم اور فوجی آپریشن میں مارا جائے گا بے کس نادار بلوچ جس کی سرزمین تو ہے لیکن اس کا مالک وہ نہیں جس کا ڈگار (کھیت) ہے لیکن اس کو بیچنے والے سارے اس کے اپنے بندے ہیں جو اس سے اظہار یکجہتی قوم پرستی اور سرزمین سے محبت لگاؤ کا نعرہ بھی لگاتے ہیں اور اس کا ڈگار فروخت کرنے میں بھی سب سے آگے آگے ہیں۔

بات ہو رہی تھی سیلاب کی اور سیلاب کو روکنے کے بجائے راستہ دینے کی خدا بھلا کرے آنکاڑہ کورڈیم کے سیولین انجینئرز کا کہ جنہوں نے پہلی مرتبہ عقل سے کام لے کر لمحہ بہ لمحہ بڑھتے بھپرے ہوئے پانی کو راستہ فراہم کیا آنکاڑہ ڈیم کا دوسرا اسپل وے کھول دیا اور گوادر شہر کو بچایا لیکن اس دوران جو خوف و ہراس پھیلایا گیا اس کی مثال کم از کم مکران اور گوادر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمارے ایک قریبی عزیز نے ۳ مرتبہ صبح ۵ بجے کے قریب بذریعہ ٹیلی فون ہمیں گہری نیند سے جگا کر یہ بری خبر سنائی کہ اٹھو افواہ ہے کہ آنکاڑہ کورڈیم ٹوٹ گیا ہے اور پانی شہر کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے رکھو اور پہاڑ پر چڑھنے کی تیاری کرو، سونامی کا خوف دل میں تھا کچھ دن پہلے پسنی میں شادی کورڈیم کے ٹوٹنے سے کافی جانی و مالی نقصان ہوا تھا ہم اندھیرے میں ہاتھ پیر مارنے لگے کیونکہ بارش کا سلسلہ جاری تھا اور بجلی غائب ،ہم نے موبائل فون اور ماچس کی روشنی کی مدد سے محکمہ پبلک ہیلتھ انتظامیہ یا کوئی بھی سرکاری ٹیلی فون نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ہمیں کوسٹ گارڈ کا نمبر ملا۔ ہم نے اصلی صورت حال جاننے کی کوشش کی تو کوسٹ گارڈ کے ٹیلی فون سے معلوم ہوا کہ بند ٹوٹ چکا ہے اور 15

فٹ اونچا پانی ڈیم سے خارج ہوکر سیدھا شہر کی طرف آ رہا ہے ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ متعلقہ محکمہ ڈیم پر ہیں ان کا کہنا ہے کہ شہر کو کوئی خطرہ نہیں لیکن ان کو ڈسٹرب نہ کیا جائے وہ کوشش میں لگے ہوئے ہیں اس دوران معلوم ہوا کہ شہری آدھی آبادی کوہ باتیل پر چڑھ چکی ہے۔ایک عجیب عالم تھا چونکہ ہمارا کھولی نمبر ۸ سمندر سے محض چند گز کے فاصلہ پر ہے یعنی گھر لب دریا لیکن سمندر سے کوئی خاص ناراضگی کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا اس لئے ہم نے کوہ باتیل پر چڑھنے کا اپنا ارادہ ترک کر دیا اور صبح صادق کا انتظار کرنے لگے۔صبح معلوم ہوا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں نے پیسوں کی لالچ میں جگہ جگہ رکاوٹیں بندات ان جگہوں پر کھڑی کی تھیں جہاں اس سیلابی ریلا کا قدرتی گزرگاہ ہوتا تھا 1995ء کے سیلاب میں بھی پانی ڈور کے قریب اپنے قدرتی گزرگاہ سے ہوتے ہوئے سمندر میں مل گیا تھا پہنچا وہیں پہ جہاں کا خمیر تھا لیکن اس وقت گوادر کے زمینوں کی اس قدر اونچی قیمتی نہ تھیں جب قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں تو ہر ندی نالہ کو کھتونی نمبر دیا گیا جن کے پاس پیسہ نہیں تھا ان کے زمینوں کو سرکار یا سٹلمنٹ والوں نے اپنے کسی دوست عزیز رشتہ دار کے نام کر دیا اور خرید کر اس پر رکاوٹیں نشانات ڈال دیئے اور نتیجتاً سیلاب کے پانی کو جب رستہ نہ ملا تو اس نے اپنی قدیمی آبادی کو بھی خوف زدہ کیا بلکہ اس کو عبرت حاصل کرنے کے لئے قدرت کی طرف سے وارننگ دی، چاہے سیلاب ہو یا سیاست سب کو اپنی فطری راستہ چاہیے یہ سیلاب بہت سے حیران کن نتائج بلکہ بھاری نقصانات کا سبب بنا اس علاقے کا نام ہمارے وزیراعظم نے جناح اینو نیو رکھا جہاں پر چار پانچ کروڑ کی لاگت سے کئی منزلہ عمارات زیر تعمیر تھیں زمین بوس ہوگئیں ہسپتال کی عمارت پانی میں بہہ گئی حالانکہ ائیر پورٹ کی پرانی عمارت سلامت رہی لیکن سب سے زیادہ نقصان کوسٹل ہائی وے کو پہنچا جس کو پوری دنیا میں ایک عالمی معیار کا ہائی وے قرار دیا گیا تھا جس پر اربوں روپے لاگت آئی تھی تقریباً دو سال کے اندر مکمل ہوا۔اندازن اس کو کھولے ہوئے 58 دن گزرے تھے کہ اس کی پلیں گر گئیں اور سڑک کئی مقامات سے بہہ گیا کوئی سویلین ادارہ اس سڑک کو تعمیر کرتا تو یقیناً لوگ کہتے کہ انہوں نے اپنے کمیشن کی خاطر ناقص میٹریل (Material) استعمال کیا تھا وہ چور اور رشوت خور ہیں لیکن کوسٹل ہائی کو ایک فوجی ادارہ ''ایف ڈبلیو'' (FWO) کے زیر نگرانی فوجی ماہرین اور فوجی انجینئرز نے تعمیر کیا تھا اور وہ بھی محض 58 دن بعد بہہ گیا۔کہیں ان کو سویلین کی بیماری تو نہیں لگی؟ یہ تحقیق طلب مسئلہ ہے یقیناً اس کی انکوائری ہونی چاہیے کیونکہ قوم کا اربوں روپیہ ڈوب گیا اور یہ میگا پروجیکٹ ایک مہنگا پروجیکٹ بن گیا۔

اگر ہم اگست سے اکتوبر 2004ء تک تین مہینے برطانیہ میں نہ ہوتے تو ہمیں بھی یقین آتا کہ قدرتی آفات کا مقابلہ انسانی بس کی بات نہیں جیسا کہ ہمارے نوخیز صوبائی وزراء راگ الاپتے رہتے ہیں سوائے سونامی کے جس کا پیشگی کوئی وارننگ سسٹم نہ تھا لیکن وہاں ہم نے اس تین مہینے کے دوران متواتر موسلہ دھار بارشیں دیکھیں دن رات برستے بارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن نہ کوئی پل ٹوٹا نہ کوئی سڑک بہہ گئی اور نہ کسی شہر میں سیلاب آیا بلکہ پانی کا نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔وہ بھی انسان ہیں ہم بھی انسان ہیں وہ ہم سے بدترین موسمی حالات میں دن رات رہتے ہیں روزانہ موسلہ دھار بارش برستی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ہم بے خبر سوئے رہتے ہیں یعنی ہمارے ملک میں کسی بھی

ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لئے ہمارے کسی بھی محکمے یا حکمران کے پاس کوئی پیش بندی منصوبہ موجود نہیں اور نہ ہم اپنے ملک کے شہریوں کو کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں جبکہ ان ممالک میں ہمارے مقابلے میں ان کے جانوروں اور حیوانوں کو زیادہ اہمیت بلکہ حقوق حاصل ہیں۔

اب رہی بات مکران کی تو اس کے متعلق سکندر اعظم نے صدیوں پہلے کہا تھا کہ اس علاقے میں باہر سے آنے والے کسی بھی حملہ آور کو بھگانے کے لئے لشکر یا فوج کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے اپنے قدرتی اور جغرافیائی حالات ایسے ہیں جو کسی بھی یلغار کو خود بخود قابو کر کے دشمن کو بھاگنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ منظر ہم نے ۳ مارچ کے سیلاب کے دوران سنا اور دیکھا۔ نیوی والوں نے گوادر ایسٹ بے پر جس وسیع اراضی پر قبضہ کیا ہے سیلاب کے دوران وہ اس زمین پر تعمیر شدہ چوکیوں کے چھت پر پناہ لیے ہوئے تھے نوجوانوں نے آکر بتایا کہ کوسٹ گارڈ کے جوان بھی اپنا کیمپ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور لینڈ مافیا کے خریدار سراسیمگی کی حالات میں کوہ باتیل کی طرف بھاگ رہے تھے حالانکہ اس کے آگے بھی سمندر ہے۔ جب مکران کے جغرافیائی قدرتی حالات نے اپنا رنگ دکھایا تو نہ زمینی راستہ نہ ہوائی راستہ بچا تھا سب کے سب منقطع بند اور سمندری راستے کے متعلق ابھی تک حکمرانوں نے سوچا بھی نہیں ہے کئی سرمایہ کار فیری سروس کا پلان لے کر آئے لیکن اسلام آباد کے ریڈ ٹیپ ازم نے ان کو عملی اقدامات تک پہنچنے کے مواقع نہیں دیئے۔

اب حالت یہ ہے کہ جس زمین کی اوپری سطح کی مٹی کو لینڈ مافیا نے دیکھے بغیر اپنے کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کرنے کے لئے سودا کیا تھا اس کی ساری مٹی سمندر میں بہہ چکی ہے سارے نشانات مٹ چکے ہیں اب پانی خشک ہونے کے بعد مٹی کی ایک اور سطح نمودار ہوگی جو صرف اور صرف قدرت کی ملکیت ہوگی کیونکہ اس کی صدیوں کے پرانے مالک نے اس کو فروخت کر دیا ہے اب ایک مرتبہ پھر بولی لگے گی قدرت کی اس نئی زمین کو ایک مرتبہ پھر فروخت کیا جائے گا اور ایک آفت ایک تباہ کن سیلاب آئے گا۔ اب بھی اگر لوگوں نے عبرت حاصل نہ کی تو ہوسکتا ہے کہ ایک بہت بڑی تباہی آجائے اور ہم سب قوم نوح کی طرح اس سرزمین سے غائب ہو جائیں پھر پھر کون فروخت کنندہ اور کون خرید کنندہ ہوگا اس کا سوائے قدرت کے اور کسی کو بھی علم نہیں۔

ایک میگا پروجیکٹ تو اپنی تکمیل کے چند دن بعد قدرتی آفات وسیلاب کی نذر ہو کر ایک بہت ہی مہنگا پروجیکٹ بن گیا ہے اب یہ ''ائف ڈبلیو'' کے لئے گاؤ ماتا ہو گیا ہے پھر اس پر اربوں کی لاگت آئے گی اور دوسرا میگا سٹی یعنی گوادر سٹی جو اس وقت قرون وسطیٰ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ شہر کھنڈرات بنتا جا رہا ہے جگہ جگہ گٹر ابل رہے ہیں چاروں طرف گندگی کا ڈھیر لگا ہوا ہے چھوٹی موٹی سڑکیں ٹوٹ چکی ہیں۔ ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کے کھڈوں میں جو گندہ پانی جمع ہے اس نئی نئی ماڈل کی گاڑیوں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے لوگوں کی بھرمار تھی سیلاب نے اس پر بھی اچھا خاصا اثر ڈالا ورنہ سیلاب سے پہلے ہوٹلوں سرائے خانوں اور کرائے کے مکانوں میں جگہ ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ زمینوں ایکڑوں پلاٹوں کے سودے جن کے پیسے کم پڑتے تھے وہ اپنی نئی ماڈل کی گاڑی بھی حوالے کرتا تھا یہی وجہ

ہے کہ پرانی تنگ گلیوں اور ٹیڑھے میڑھے کچھی دیواروں کے سامنے نئی ماڈل کی کرولا، پراڈو لینڈ کروزر کھڑی ہوئی ملیں گی کیونکہ گھر کے اندر تو خود اس کی فیملی کو سونے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ یہ گوادر شہر کا حال ہے جس کو الیکٹرونک میڈیا میں بینکاک اور دبئی کی طرح دکھایا جاتا ہے۔ پام سٹی، مکہ سٹی، سبزی منڈی وغیرہ گوادر کی بلدیہ جو کسی زمانے میں خاص کر جب گوادر مسقط عمان کا حصہ تھا ایک مثالی بلدیہ کہلاتا تھا اس کے بعد بھی اس بلدیہ کی شہر کے حوالے سے ایک خاص کارکردگی کی مثال ملتی ہے حالانکہ اس وقت کے منتظم اعلیٰ یا چیئرمین بلوچ قوم کا درد بھی اپنے سینے میں اس شدت سے نہیں رکھتے تھے جس شدت سے آج کے ناظمین رکھتے ہیں وہ قوم پرست بھی نہیں تھے لیکن پھر بھی ان کی کارکردگی نمایاں رہی ہے شاید اس قدر اختیارات بھی ان کو حاصل نہ تھے جبکہ موجودہ ضلعی اور شہری ناظمین کو حاصل ہیں بقول حکمرانوں کے سارے اختیارات نچلی سطح یعنی یونین کونسل کی سطح تک بیشتر مقامی قوم پرست قوم کا درد رکھنے والے سیاسی کارکن ہیں جو ہمیشہ اس شہر کی مظلومیت پر نعرہ زن رہے ہیں تو پھر یہ شہر کیوں اصلی گوادر شہر روز بروز کھنڈرات میں تبدیل ہو رہا ہے اگر زمین سے نہیں تو کم از کم اپنے شہر سے اپنی لگاؤ پیار محبت کا زبانی نہیں عملی اظہار تو کریں۔ کیا ہمارے گوادر کے ناظمین اپنا کچھ قیمتی وقت نکال کر اس ''کیوں'' پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟ ہاں اگر ان کو بھی زمینوں اور پلاٹوں کی چمک نے ذہنی طور پر مفلوج بنا دیا ہے تو پھر گوادر کی عوام کو چاہیے کہ اس کیوں پر غور کر کے اپنے آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں ورنہ زمین تو بک چکی ہے یہ شہر بھی ہاتھ سے جائے گا کیونکہ ویسے بھی ہمارے گھر لبِ دریا واقع ہیں اور اوپر سے سیلاب کا ریلہ اس لئے عطا نے کہا ہے کہ:

''سیلاب کو نہ روکیے راستہ بنائیے
کس نے کہا تھا گھر لبِ دریا بنائیے''

روزنامہ ''انتخاب'' حب

17 مارچ 2005ء

مزاحمت

مزاحمت کے سیاسی فلسفہ سے ناواقف ہوں اور نہ کسی سیاسی فلاسفر کا حوالہ دے سکتا ہوں لیکن اس زمینی حقائق کا ضرور ادراک رکھتا ہوں کہ جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے جو عمر میں مجھ سے چھ ماہ چھوٹا ہے مزاحمت کی زد میں چلا آرہا ہے۔ کبھی جمہوریت کیلئے مزاحمت ہورہی ہے تو کبھی جمہوریت کی بساط لپیٹنے کے لئے، کبھی مرکز میں مزاحمت ہورہی ہے تو کبھی صوبوں میں، اب تو یہ روز بروز پاکستان کے بجائے مزاہمستان بن کر رہ گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مشرقی پاکستان کی مزاحمت نے اس کو دولخت کردیا اور اب یہ مزاحمت بلوچستان میں تیسری یا چوتھی بار زور وشور سے شروع ہے۔

پاکستان میں بسنے والے پاکستانی مارنے والے پاکستانی، مرنے والے پاکستانی کیسے بنا؟ کس طرح بن گیا؟ میں نے نہیں بنایا آپ نے نہیں بنایا! کس نے بنایا ہے؟ جس نے بنایا ہے وہ اس کائنات وسرزمین سے سدھار چکے ہیں جو زندہ بچ گئے ہیں وہ عذاب میں مبتلا ہیں۔ جن کے لئے یہ ملک بنایا گیا وہ سوال جواب کرنے لگے ہیں! کہتے ہیں کہ جھوٹ کا پلندہ ہے نہ علامہ اقبال نے کوئی خواب دیکھا تھا نہ جناح قائداعظم تھے؟ اب کس کس کو دل دیں اور کس کس کو سمجھائیں۔؟ سچی بات کریں یا ڈر خوف کے مارے سچ کو چھپائیں؟ کیا کریں کیا نہ کریں! کچھ سمجھ نہیں آتا۔ حکمران کہتے ہیں کہ ہمیں ساتھ دیں ہمارے احکامات پر لبیک کہیں تو تمہیں دودھ اور شہد کی نہریں بہا کردیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ محض پینے کا صاف پانی دو، کالج دو یونیورسٹیاں دو، تعلیمی ادارے دو تو کہتے ہیں یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب چھاؤنیاں مکمل ہوں گی۔ چھاؤنیوں کے بغیر اس قسم کی سہولیات بہم نہیں پہنچائی جاسکتیں جب تک حاکم یا حکمران نہیں ہوں گے تو عوام کو کون سہولت پہنچا سکتا ہے۔ دوسری طرف مزاحمت کاروں کا کہنا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ حکمران ترقی کے سہانے سپنے دکھا کر تم سے تمہاری سرزمین، ساحل وسائل تم سے چھیننا چاہتے ہیں اور تم کو ریڈ انڈین (اپاچی) بنا کر تمہارا نام ونشان تمہاری تاریخ، تمہاری ثقافت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مزاحمت کار جو کررہے ہیں لیکن دودھ اور شہد کی نہریں نکالنے والے برسرزمین عوام کیلئے کچھ بھی نہیں کررہے ہیں۔ اب کیا کریں، کہاں جائیں، کس کی بات پر یقین کریں۔؟ بہتر ہے ٹی وی دیکھیں اور مزید پریشان ہوجائیں۔ ٹی وی پر تو ایک زبردست فلم چل رہی ہے۔ برٹش نژاد امریکن ریڈ انڈین اپاچیوں سے ان کی سرزمین پر برسرپیکار ہیں۔ ٹی وی اسکرین پر قتل وغارت گری کا خوفناک منظر زمین کیلئے وسائل کیلئے فتح شکست، پھر فتح اور فتح کے بعد بھی مزاحمت اپاچیوں کا لیڈر ہتھیار ڈالتا ہے، سرنڈر کرتا ہے۔ حملہ آوروں کا کمانڈر غرور اور متکبرانہ انداز سے لیکن آداب حکمرانی کا خیال رکھتے ہوئے اپاچیوں کے کمانڈر سے مخاطب ہوکر کہتا ہے۔

If you surrender , surrender honourably , then lets have a cup of coffee and ''
''smoke a cigar

حملہ آور ہیٹ پہنے ہوئے سرتاپا ملبوس مزاحمت کار نیم برہنہ حملہ آوروں کے ساتھ اپاچی سرزمین کا ایک سن آف سوائل (Son of soil) جو دلالی / مخبری کے ساتھ ساتھ ترجمانی کے بھی فرائض انجام دے رہا ہے اس کو دیکھ کر کچھ اپاچی نوجوان مشتعل ہو کر حملہ آوروں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں ''This is a Appachi Land'' لیکن اس سے پہلے کہ حملہ آور کچھ بولیں دلال چیختا ہے'' If you say this is a Appachi Land next time , i will kill you all'' اس کے بعد ہتھیار ڈالنے کا منظر ادھر میدان جنگ میں فوجی عدالت کا قیام پھانسی کا اعلان اور مزاحمت کاروں کو اپنے بچوں کے نام پیغام اس کے بعد پھانسی پر عمل درآمد اور پھر خوف کا سماں۔

اس فلم کی کہانی شاید 200 سال پہلے کی ہے اب 2006 ہے۔ کیا انسان نے بحیثیت انسان ترقی کی ہے یا زوال پذیر ہو رہا ہے؟ بلکہ زوال کی پستی تک پہنچ چکا ہے۔ بے شمار علوم پر دسترس، جدید ٹیکنالوجی، کمپیوٹر کی تحقیق اور سائنسی ترقی کے لازوال کرشمات یہ سب کچھ انسانی ذہن کی اختراع تخلیق، لیکن انسانیت کی تباہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب اپاچی امریکن بن چکے ہیں شاید ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا ہے۔ امریکہ اب واحد سپر پاور بن چکا ہے۔ زمین ہی زمین وسائل ہی وسائل سابق سوویت یونین کو مات دینے کی حد تک تو بات سمجھ آتی ہے کہ جدید دور کے دو متضاد نظریات کا ٹکراؤ ایک کو شکست دوسرے کو فتح وہ بھی 70 سال کے بعد۔ لیکن اب جھگڑا کس بات پر کس کے ساتھ کس لئے اور کیوں اس قدر خون خرابہ۔؟ ہوسکتا ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں کا ایجنڈا ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کو اپاچی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ویتنامیوں کو بھی اپاچی سمجھا تھا لیکن وہاں سے خود اپاچی بن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عراق اور افغانیوں کو بھی اپاچی سمجھ کر مار رہے ہیں اور خود بھی مر رہے ہیں۔ یعنی مار دھاڑ خون خرابہ کا بازار گرم ہے لگتا ہے امریکی حکمرانوں کے ذہن سے اپاچیوں کا خوف ابھی تک باقی ہے اس لئے اب وہ ایران کو بھی اپاچی لینڈ سمجھنے لگا ہے لیکن ہر جگہ مزاحمت جاری ہے جو حکمران خوف اور دہشت کی فضا میں حکمرانی کرتے ہیں۔ وہ وقتی طور پر ضرور کچھ حاصل کرتے ہیں لیکن وہ دیرپا نہیں ہوتے چونکہ ہم امریکہ کے اتحادی ہیں اسی لئے یہی اثرات نفسیاتی طور پر ہمارے ملک کے حکمرانوں کو بھی لاحق ہیں۔ وہ قانون فطرت یا قدرت کو جانتے ہیں ہوئے صرف نظر کرتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح علم ہے کہ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔ یہ عمل اگر مثبت ہو تو یقیناً ردعمل بھی مثبت ہی ہوگا اور اگر منفی ہو تو ردعمل بھی منفی ہی ہوگا۔

اب رہی بلوچستان میں مزاحمت کی بات جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے اس ملک کے بنانے میں اس کو چلانے اور مختلف عہدوں پر رہ کر اس کی خدمت کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بلوچستان کا الحاق پاکستان کے

ساتھ جبراً کیا گیا ہے جس میں بلوچستان کے لوگوں کی مرضی شامل نہیں تھی اور انہوں نے 1973ء کے متفقہ آئین کو بھی نہ مان کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بلوچستان آئینی طور پر وفاقی پاکستان کا حصہ نہیں اور نہ بحیثیت رکن قومی اسمبلی اس آئین کو ماننے کیلئے تیار تھے ان میں ایک تو نواب خیر بخش مری صاحب ہیں جو آج تک اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں اور دوسرے ہمارے سابقہ بی ایس او کراچی کے خزانچی اور موجودہ نیشنل پارٹی کے چیئرمین ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ تھے جنہوں نے بعد میں اسی آئین کے تحت سینیٹر بن کر حلف اٹھایا۔ عبدالحئی صاحب شاید اب بھی اپنے بعد کے فیصلے پر قائم ہیں اور پارلیمانی سیاست کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ بلوچستان کے مزاحمت کار اپاچی بن کر سرنڈر کریں گے یا ویتنامیوں کی طرح حملہ آوروں کو اپنی سرزمین سے مار کر بھگانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو کم از کم پسپا ہونے پر مجبور کریں گے۔ اس کا انحصار بھی من الحیثیت قوم پوری بلوچ قوم پر ہے کہ وہ اس مزاحمت کا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں اور ساتھ دیں گے بھی کہ نہیں۔؟

روزنامہ ''انتخاب'' حب

24 جون 2006ء

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جان سے گزر گئے

26 اگست صبح سویرے لندن سے دبئی کے پرہجوم پرنور ائیر پورٹ پہنچے۔ دبئی میں 28 اگست تک مجھے قیام کرنا تھا، شام کو ایک قریبی عزیز اپنی گاڑی میں مجھے دبئی کا جدید ترین ہوٹل برج العرب دکھانے لے جا رہے تھے کہ راستے میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور اس کے ساتھ ہی یہ منحوس خبر کہ نواب محمد اکبر بگٹی کو مار دیا گیا ہے۔ بلوچ کہتے ہیں کہ ''موت کی خبر کبھی جھوٹی نہیں ہوسکتی'' اس کے بعد متواتر ہر بلوچ موبائل پر ایک دوسرے کو یہ منحوس خبر ایسے سنا رہے تھے کہ جیسے موت اس کے اپنے گھر اپنے خاندان میں واقع ہوئی ہے۔ ہم حیران ششدر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ بہت بڑا حادثہ ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شہید نے اس مختصر عرصے میں اپنی اس بے لوث عظیم قربانی کی بدولت اپنے آپ کو ہر بلوچ کے گھر، خاندان بلکہ فرد فرد کے دل و دماغ میں پہنچا دیا ہے جس کی شدت کا احساس ہمیں موبائل پر پیغامات پڑھ کر ہوا ان میں کچھ اس طرح تھے:

''یہ بازی خون کی بازی ہے یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر گھر سے بگٹی نکلے گا تم کتنے بگٹی مارو گے''

اس دوران ہمیں پتہ ہی نہیں چلا اور ہم برج العرب کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے لیکن وہاں برج العرب کے بجائے ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی جگہ پر نواب شہید کی قد آور، جاذب نظر، باوقار، بارعب شخصیت برج البوشی بن کر کھڑے اپنے دشمنوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہم اس منحوس خبر کے بعد باہر ہی سے واپس اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نواب صاحب کی جسمانی موت اور روحانی حیات کی سچائی ثابت ہو چکی تھی لیکن ہمارے دماغ کے پردے پر وہ لمحات، ادوار اور واقعات کا ایک لامتناعی سلسلہ فلم اسکرین کی طرح نمودار ہونے لگا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو (شہید) کے دور کا وہ باوقار گورنر جو فوکر طیارے کے ڈی سیٹ پر براجمان کوئٹہ سے کراچی تک ہمارے ہم سفر ائیر ہوسٹس کی سراسیمگی اور بار بار نواب صاحب کے پاس آ کر اس کی جاذب نظر شخصیت کو وارفتگی کی حد تک گھورنا، اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے نواب صاحب نے اپنی بھاری شال کو (جو اس کے برابر والی سیٹ پر رکھی ہوئی تھی) دوسری طرف ملٹری سیکریٹری پر اچھالتے ہوئے ائیر ہوسٹس کو اپنے ساتھ جب بیٹھنے کیلئے کہا تو خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ چونکہ میں نواب صاحب کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اس لئے ان کی گفتگو آسانی سے سن سکتا تھا۔ ائیر ہوسٹس نے نواب صاحب کے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جو نواب صاحب نے دکھائے، ان کی کشادہ ہتھیلی اور اس کی لکیروں پر کچھ تبصرہ کرنے کے بعد ائیر ہوسٹس یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ نواب صاحب آپ تو بہت ہی شفیق، مہذب شائستہ انسان ہیں لوگ یوں ہی آپ کے متعلق پتہ نہیں کیا کیا کہتے ہیں۔ میں آپ کے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔ جب جہاز نے کراچی

لینڈ کیا تو اترتے وقت نواب صاحب کی نظر مجھ پر پڑی تو پوچھا ''کوئٹہ میں کیا کرتے ہو''؟ میں نے کہا کہ نواب صاحب میں کوئٹہ میں نہیں راولپنڈی میں وزیراعظم ہاؤس میں بحیثیت ''اوایس ڈی'' بلوچستان متعین ہوں اور واپس اسلام آباد جارہا ہوں۔اسی دن نواب صاحب نے کراچی پہنچ کر گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد راولپنڈی پی سی ہوٹل میں ملاقات، بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں کئی ملاقاتیں اور پھر 1990ء میں نواب صاحب کی پارٹی ''جمہوری وطن پارٹی'' میں ہماری شمولیت، اس کے بعد متواتر ملاقاتیں، قربت، کوئٹہ، ڈیرہ بگٹی، بگٹی بولک کراچی میں ملاقاتیں، نواب صاحب کا دورہ پسنی جو محض میری الیکشن مہم کیلئے تشریف لائے تھے اور گوادر سے پسنی کیلئے جب ہم سسنا طیارے میں سوار ہوئے تو مکران کے کمشنر عرفان کانسی نے نواب صاحب کی برابر والی نشست پر بیٹھنے کی کوشش کی تو نواب صاحب نے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھ میرا امیدوار بیٹھے گا۔ پھر 1998ء میں سرینہ ہوٹل کوئٹہ میں پارٹی کے کنونشن کے دوران میں نے اپنی تقریر میں نواب صاحب کے سیاسی فیصلوں پر سخت تنقید کی جس کو نواب صاحب نے بڑے حوصلے اور خندہ پیشانی سے سنا بلکہ میرے کچھ نقاط پر اتفاق کرتے ہوئے ذمہ داری بھی قبول کر لی جس پر لوگوں نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ سارے مناظر ایک ایک کر کے دماغ کے پردے پر صاف اور واضح نظر آتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔اس لئے یقین کرنا مشکل تھا کیونکہ لاش بھی ابھی تک غائب تھی۔ پیسے ملے، ڈالر ملے، چشمہ ملا، گھڑی ملی، سیٹلائیٹ فون ملے، فوجیوں کی لاشیں ملیں لیکن نہیں ملا تو فقط 7 فٹ لمبا نواب بگٹی کا جسد خاکی۔ دوست دشمن کوئی یقین نہیں کر رہا ہے کیونکہ سرکاری اہلکار جھوٹ پر جھوٹ بولتے چلے جارہے تھے۔ہم 28 اگست کو دبئی سے کراچی پہنچے لیکن ابھی تک لاش غائب ہے۔ پھر 31 اگست کو اچانک لاش ملنے کا اعلان قاتلوں کی طرف یہ کہہ کر کیا گیا کہ نواب بگٹی کا جسد خاکی مل گیا ہے اس کا سر نظر آ گیا ہے باقی جسم کا حصہ غار میں دبا ہوا ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ سیٹلائیٹ فون کے ذریعہ ٹریس ہوا اور آپریشن کے دوران مارا گیا۔کون یقین کرے کہ کیا ہوا ہے۔؟ یہ کیسی شخصیت ہے کہ اس کی لاش نے بھی دشمنوں کو اس قدر خوف اور دہشت میں مبتلا کر دیا ہے اور پھر دوسرے دن ایک تالا لگا ہوا صندوق ڈیرہ بگٹی کا سینہ چیر کر بہت ہی عجلت میں سنگینوں اور بندوقوں کے سائے میں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے اور یوں اپنی طرف سے قصہ ختم لیکن قصہ تو اب شروع ہوا ہے بلکہ زیادہ خطرناک طریقے سے شروع ہوا ہے اور نواب شہید کی تا ابد یہ آواز دوستوں اور دشمنوں کا پیچھا کرتی رہے گی۔

''میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا''

آج نواب اکبر بگٹی تمام مظلوم قوموں کا شہید بن چکا ہے۔آج نہ وہ بگٹیوں کا تمندار ہے نہ سردار نہ جمیل بگٹی اور طلال بگٹی کا باپ ہے بلکہ وہ ہر بلوچ کا باپ بن چکا ہے۔آج اس کے لاکھوں کروڑوں وراث پیدا ہو چکے ہیں جن کو بگٹی شہید کی لاش چاہیے۔ جو نعرہ

زن ہیں کہ ''قاتلو جواب دو، خون کا حساب دو'' یہ وارث اس وقت تک چین سے بیٹھنے والے نہیں جب تک ان تمام حقائق سے پردہ نہیں اٹھتا جو اس نام ونہاد آپریشن کے سبب بن چکے ہیں۔

اس ملک کی تاریخی بدقسمتی یہ ہے کہ اس ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو بھرے جلسے میں گولیوں سے چھلنی کر کے شہید کر دیا اور قتل کے محرکات کو مٹانے کیلئے قاتل کو بھی اسی وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد پاکستان اور قائداعظم کے محسن خان قلات میر احمد یار خان پر بھی فوج کشی کر کے اس کو زندان میں ڈال دیا اور اس کے جانثاروں کو بمعہ نواب نوروز خان حیدرآباد جیل کی کالی ٹھڑی میں موت سے ہمکنار کیا اور وہ بھی قرآن شریف پر حلف اٹھانے کے باوجود..... یہ سلسلہ اس ملک کے محسنوں کے ساتھ جاری رہا ہے۔ صوبہ سرحد کے ڈاکٹر خان کا قتل ہو یا سہروردی اور مولوی تمیز الدین کی بے حرمتی حتیٰ کہ خود اس سب سے بڑے اسلامی مملکت کو مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر کے دولخت کر دیا لیکن یہ سودا ان کو کچھ زیادہ مہنگا پڑ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پورا ملک نزع کی حالت میں تھا لیکن بلوچوں نے بشمول نواب اکبر بگٹی ان نامساعد حالات سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ انہوں نے اس امید کے ساتھ نئے بچے کچے پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا کہ شاید اب ان جرنیلوں کو ہوش آ گیا ہے اب اس ملک کو قانون اور آئین کے مطابق چلایا جائیگا۔ صوبوں کو خودمختاری ملے گی اور اب ایک حقیقی وفاقی پاکستان وجود میں آئے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ ایک مرتبہ پھر بلوچستان پر فوج کشی کی گئی اور ستم بالائے ستم یہ کہ فوج کشی کے دوران نواب شہید نے وفاقی پاکستان کا ساتھ دیا اور اپنے پرانے رفقاء اور دوستوں سے دشمنیاں لیں اور جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان سے فوج واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے اس اپنے مقرر کردہ کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الحق نے اس کی مخالفت کی کیونکہ مجموعی طور پر وہ اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے تھے اور جب ذوالفقار علی بھٹو ان کیلئے رکاوٹ بنے تو اس کو بھی اس محسن کش جرنیل نے پھانسی کی کال کوٹھڑی میں پہنچا دیا اور اس کی لاش کو بھی گمنام طریقہ سے لاوارثوں کی طرح لاڑکانہ لے جا کر دفنا دیا۔ یہ حشر نئے پاکستان کے محسن کا کیا گیا جنہوں نے اس ملک کو ایک متفقہ آئین دیا۔ 90 ہزار جنگی قیدیوں کو ہندوستان کی جیل سے چھڑا کر لایا ان کے شکست خوردہ چہروں اور بنگالیوں کے خون سے رنگی ان کی وردیوں کو نہلا دھلا کر صاف شفاف کیا۔ ان کو پھر نئے ہتھیاروں سے لیس کیا۔ ملک کو ایٹمی طاقت بنا کر ناقابل تسخیر بنایا اور سب سے بڑھ کر عام پاکستانیوں کو عزت نفس کے ساتھ جینے کا حوصلہ دیا اور اب ہمارے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر کا حشر بھی ہمارے سامنے ہے۔ پھر مرتضیٰ بھٹو کا قتل دن دھاڑے گھر کے سامنے، ایم پی اے عبداللہ مراد بلوچ شہید کا قصور یہ تھا کہ وہ پاکستان کے مروجہ قانون وآئین کے اندر رہتے ہوئے اپنے علاقے کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کر رہے تھے۔ مظلوموں وغریبوں کی مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے کوئی بغاوت نہیں کی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی قبائلی لشکر تھا وہ ایک عام سیاسی کارکن تھے لیکن اپنے حلقے اور کراچی کے بلوچوں کے حقوق کیلئے مصروف عمل تھے۔ صبح دن کی روشنی میں گھر کے قریب گولیوں سے چھلنی کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شکر ہے کہ لاش کو غائب نہیں کیا گیا۔ اس ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ تو چند نامور

لوگ ہیں نامعلوم کتنے اور گمنام سپاہی ان کی بربریت کا نشانہ بن چکے ہیں۔

نواب بگٹی کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ ہمیشہ پارلیمانی سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ پارلیمنٹ کے حصہ تھے مرکز اور صوبے کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ صوبائی خودمختاری پر ایک جامع بل سینیٹ میں پیش کر چکے تھے اور اس پر عملدرآمد چاہتے تھے۔ اس دوران مذاکرات کا جو ڈرامہ رچایا گیا اس کی آخری حد تک جا چکے تھے پھر انہوں نے کھلے عام تین نامور پنجاب کے صحافیوں کو اپنا ثالث مقرر کر دیا تھا اور ان کے ہر فیصلہ کو ماننے کیلئے تیار تھے چاہے وہ فیصلہ ان کے خلاف ہوتا لیکن حکمرانوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ محض ان کے خون کے پیاسے ہیں۔ جب ان کے سینکڑوں سال پرانے آباؤ اجداد کے مسکن پر گولے برسائے گئے، بے شمار بے گناہ لوگوں کو شہید کیا گیا اور جنگ جب ان پر مسلط کی گئی تو انہوں نے بھی پیٹھ نہیں دکھائی بلکہ اس مرد جری نے ہمت وحوصلہ، بہادری وشجاعت کا نشان بن کر بلوچ کہساروں کا رخ کیا اور بالاچ کے پہاڑوں کو اپنا مسکن بنایا۔ حالانکہ یہ عمر اُن کی آرام اور آسائش کی تھی، خاموش رہ کر گوشہ نشینی کی تھی لیکن انہوں نے بلوچ کہساروں کا رخ کر کے عطا شاد کے اس شعر کو عملی جامہ پہنایا:

''کہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی
رات سوجائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے''

اب بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران خاص کر فوجی حکمران اس طرح اس ملک کے محسنوں کو مار کر چھوٹے صوبوں کی عوام کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔؟ کیا یہ انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔؟ ان کے اس اقدام سے اس قدر نفرتیں بڑھ گئی ہیں کہ اس کا دائرہ پورے بلوچستان بلکہ جہاں بھی کوئی بلوچ آباد ہے پھیل چکا ہے اور اب معاملات بزرگوں کے ہاتھ سے نکل کر کٹر قوم پرست انتہا پسند نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی نوجوانوں کی نسل ہے جو نواب شہید کو کسی زمانے میں بلوچوں کے قاتل سمجھتے تھے اور یہ نعرہ لگا کر نہیں تھکتے تھے کہ:

''سی آئی اے کے تین نشان
بھٹو بگٹی ٹکا خان''

اور آج یہی اکبر خان ان کے آئیڈیل اور ہیرو بن چکے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نواب محمد اکبر بگٹی شہید کا مقابلہ چند انا پرست ،تنگ نظر، وژن سے خالی حکمرانوں سے تھا جو اپنی وردی اور ملازمت سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور نہ ان کو نواب شہید کی مزاج سے واقفیت تھی۔ نواب شہید سرنڈر کرنے والا ایسا شخص نہیں تھا جو خاموشی کے ساتھ جیل کی کسی کال کوٹھڑی میں دم توڑ دیتا۔ اس شخص نے اپنی زندگی میں اپنی موت کے طریقہ کا خود انتخاب کیا تھا اور وہی انہوں نے کر کے دکھایا۔ ان کے قول وفعل میں کبھی بھی تضاد نہیں رہا ہے وہ ہر

معاملے میں عملیت پسندی کے شکار تھے چاہے زندگی کے نشیب وفراز ہوں یا موت کی وادیاں، لیکن انہوں نے اپنے دشمنوں کو ایک ایسی شکست سے دچار کر دیا ہے کہ وہ برسوں اس زخم کو چاٹتے رہیں گے۔ وہ مر کر امر ہو گئے ہیں۔ جب زندہ تھے تو کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ بڑے سے بڑا طوفان، بڑے سے بڑا حادثہ اس کو نہ ہلا سکتا تھا نہ جھکا سکتا تھا اور جب چلے تو جان سے گزر گئے لیکن جانِ جاناں بلکہ جانِ جہان بن گئے۔

''جور کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جان سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا''

روزنامہ ''انتخاب'' حب
11 ستمبر 2006ء

لاشوں کا تحفہ

26 اگست 2006ء کو بلوچستان کے لوگوں کو تالہ لگے صندوق میں بند نواب شہباز اکبر بگٹی کی انمول لاش تحفہ میں دی گئی جن کا قصور یہ تھا کہ وہ اس ملک کے قانون اور آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے صوبے کے محروم طبقات کے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بلوچستان کے لوگوں اور نواب شہید کے وارثوں کو یہ شکایت تھی کہ تحفہ بھیجنے والے اس قدر کم ظرف تھے کہ لوگوں اور نواب کے وارثوں کو اس قدر قیمتی تحفے کا دیدار تک نہیں کرایا گیا۔ اس لئے اب کی بار بلوچستان کے لوگوں اور شہید کے ورثاء کی شکایت کا ازالہ کرتے ہوئے تین اور لاشوں کا ایک انمول تحفہ اس انداز سے دیا گیا کہ ان کا وہ جی بھر کے دیدار کر سکیں تا کہ آئندہ ان کو کوئی شکایت نہ رہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ یہ انمول تحفے کچھ تاخیر سے ان تک پہنچے ان کی تر و تازگی زائل ہو چکی تھی لیکن بہر حال اس بار ان کی شکایت دور کر دی گئی۔

یوں تو ہمارے اس ملک میں لاشوں کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ لیاقت علی خان، حسن ناصر، حمید بلوچ، ڈاکٹر خالد بلوچ، ذوالفقار علی بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور پھر محترمہ شہید بے نظیر بھٹو کی لاش کو راولپنڈی سے ایک تر و تازہ قیمتی انمول تحفہ کی طرح لاڑکانہ پہنچایا گیا لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ لاشوں کے معاملے میں بھی بلوچستان کو پسماندہ رکھا گیا ہے۔ یا تو صندوق میں بند کر کے دیا جاتا ہے یا گھلا سڑا کر حوالے کیا جاتا ہے۔

اس مملکت خداداد پاکستان کو اس کے ذاتی مفادات رکھنے والی مقتدر قوتوں اور بونے پالیسی سازوں نے اس حال میں پہنچا دیا ہے کہ اب اس کے باشندے (Citizen) ہر علاقے، محلے، گلی، کوچوں میں ایک دوسرے سے ایک ہی سوال پوچھتے رہتے ہیں کہ کیا واقعی یہ ہمارا ملک (Servive) کرے گا بھی کہ نہیں۔؟ نفرتیں بڑھتی جا رہی ہیں، فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں، یقین، اعتقاد، اعتماد، بھروسہ متزلزل ہوتے جا رہے ہیں، اگر کوئی اعتماد کرے تو کس پر کرے، کیسے کرے، کہا کچھ جاتا ہے عمل کچھ اور طرح سے ہوتا ہے۔ ایک طرف موجودہ منتخب حکومت کے منتخب صدر، وزیر اعظم، گورنر، وزیر اعلیٰ مفاہمتی عمل کا اعلان کرتے ہیں دوسری طرف صدر مملکت ایوان صدر میں بلوچستان کے مسئلے پر جرگہ منعقد کرتے ہیں۔ ماضی کے حکمرانوں کی زیادتیوں پر معافیاں مانگتے ہیں اور پھر عملدرآمد لاشوں کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں کسی ملک یا اس پر بظاہر حکمرانی کرنے والوں کو کون قابل بھروسہ مانے گا۔ اب تو بقول سینیٹر میر حاصل بزنجو کے ''ان حالات میں بلوچستان میں لوگوں کے ساتھ پاکستان کے متعلق بات تک کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک میں کون سی قوتیں ہیں جو ملک کی مقبول عام (Popular leadership) قیادت کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اگر یہ قوتیں غیر ملکی ہیں تو ان تک ہمارے خفیہ اداروں کے ہاتھ کیوں نہیں پہنچ سکتے۔ جن پر قوم کا اربوں روپے خرچ

ہوتا ہے اور اگر یہ قوتیں خود ملک کے اندر موجود ہیں تو پھر اس ملک اور قوم کو کیا پیغام دینا چاہتی ہیں کیونکہ خفیہ اداروں یا ایجنسیوں کا فرض منصبی محض اس قدر ہے کہ وہ کسی بھی ملک دشمن یا غیر قانونی سرگرمیوں کے بارے میں حکومت وقت کو بروقت یا پہلے اطلاع یا رپورٹ پیش کریں۔اس کے بعد حکومت پولیس اور عدالت کا دائرہ اختیار شروع ہوتا ہے اور جرم ثابت ہونے پر ان عناصر کو ملکی قانون کے مطابق سزا دی جاتی ہے لیکن یہ کون سا طریقہ ہے کہ اغوا کر کے خود ہی منصف بن جاؤ اور لوگوں کو جانوروں کی طرح مار کر کسی ویرانے میں پھینک دو۔ یہ عناصر کوئی بھی ہوں ان کا تدارک بہت ضروری ہے کیا ہمارے ملک میں ایسی کوئی حکومتی طاقت ہے جو ایسے عناصر کی سرکوبی کر سکے۔؟ اگر ہے تو اس کو فوری طور پر حرکت میں آنا چاہئے۔اب رہی بات شہداء تربت کی، واجہ غلام محمد بلوچ، شیر محمد بلوچ اور لالا منیر یہ تینوں نہ کوئی قبائلی سردار تھے نہ ان کے پیچھے کوئی قبائلی لشکر تھا۔یہ سیدھے سادھے عام سیاسی کارکن اپنے اپنے سیاسی نظریے اور اصولوں کے مطابق سیاسی طور پر سرگرم تھے۔ان پر مقدمات تھے وہ مختلف عدالتوں میں پیشیاں بھگت رہے تھے۔انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ اس ملک کے کسی عدالت قانون کو نہیں مانتے جیسا کہ پنجاب کے ایک بہت اعلیٰ پائے کے لیڈر نے کہا تھا لیکن اس کو تو وزیر اعظم صدر جتنا پروٹوکول دیا جاتا ہے اور یہ عام طبقہ سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنماؤں کو انتہائی بے رحمی اور سفاکانہ طریقے سے قتل کیا جاتا ہے اور ان کی لاشوں کو جنگلی جانوروں کے سامنے پھنکا جاتا ہے یہ کہاں کی حب الوطنی ہے۔؟ اصل سوال یہ ہے کہ ان رہنماؤں کے اغوا کے پیچھے کیا محرکات ہیں اور اس سے قاتل کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔؟ اگر مقصد یہ ہے کہ ان تمام سیاسی عناصر کو خوف زدہ کیا جائے جو اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر اور اصولوں کے مطابق میدان میں سرگرم عمل ہیں تو پھر اس میں الٹا لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔اس سفاکانہ حرکت سے وہ لوگ بھی متنفر ہوئے ہیں جو اچھے شہریوں کی طرح پُر امن زندگی گزارنا چاہتے ہیں یعنی اس ظالمانہ حرکت کی وجہ سے ملک کے خلاف بلوچستان کے لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔کچھ تجزیہ کار اس قتل کو ''جان سولینکی'' کے اغوا اور پھر رہائی سے جوڑتے ہوئے خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے پوشیدہ راز ہیں جن سے واجہ غلام محمد بلوچ شہید کو آگاہی حاصل تھی۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایران پاکستان گیس پائپ لائن کے معاہدے کو سبوتاژ کرنے کیلئے یہ خونی ڈرامہ رچایا گیا تاکہ مکران جیسے پُر امن علاقے میں ہنگامہ آرائی اور بدامنی پھیلا کر اس منصوبے کو ناکام بنایا جا سکے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ دن کی روشنی میں ایک نامور وکیل و سیاستدان کچکول علی کے چیمبر میں چشم دید گواہوں کے سامنے پیش آیا۔اغوا کاروں نے وکیل موصوف کے دفتر کے اندر ہلہ بول دیا اور ان تین سیاسی رہنماؤں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس کے تین چار دن بعد ان کی سڑی گلی لاشیں ملیں۔یوں مقصد صاف یہ ہے کہ اغوا کار جو بھی ہیں محض وہ بتا سکتے ہیں کہ اس بہیمانہ قتل کے پیچھے کیا محرکات ہیں اور وہ کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ان کی باز پرس کی جائے اگر ایسے عناصر کی سرکوبی بروقت نہ کی گئی تو پھر یہ سلسلہ رکنے والا نہیں اور اس کا انجام بھی اسی طرح بہیمانہ سفاکانہ اور بھیانک ہوگا جس طرح ان تین شہداء کے ساتھ ہوا۔

اس مسئلے پر بلوچستان ہائی کورٹ کا ازخود نوٹس اور صوبائی حکومت کی طرف سے تحقیقاتی ٹریبونل ایک مثبت اقدام ہے لیکن اس معاملے کو طول دینا یا محض لوگوں کے جذبات کو سرد کرنے کیلئے نہیں ہونا چاہئے۔ ان تحقیقاتی اداروں کو بغیر کسی خوف یا لالچ کے ان اصل مجرموں یا قاتلوں تک پہنچنا ضروری ہے جن کی اس حرکت کی وجہ سے پورے بلوچستان میں آگ اور خون کا کھیل جاری ہے۔ ڈی پی او اور ایس ایچ او کو طلب کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امید کرتے ہیں کہ تمام انسانی حقوق کے سرگرم کارکن، سول سوسائٹی کے لوگ، وکلاء، میڈیا کے کرتا دھرتا اور خاص کر محترم نواز شریف صدر مسلم لیگ (ن)، جماعت اسلامی کے سابق سربراہ قاضی حسین احمد اور تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان جنہوں نے ججز کی بحالی کیلئے پورے ملک کو سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ لانگ مارچ اور دھرنا دے کر قانون کی بالادستی کا نعرہ لگایا تھا ان تین عام طبقے سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنما واجہ غلام محمد بلوچ، شیر محمد بلوچ اور لالا منیر کے قاتلوں کی گرفتاری کیلئے بھی اس طرح آواز اٹھائیں گے جس طرح انہوں نے معزول ججز کی بحالی کیلئے آواز اٹھائی تھی۔ اس طرح ماروائے عدالت، ماروائے قانون قتل کی تحقیقات کا بھی اسی انداز سے مطالبہ کریں گے جس انداز سے انہوں نے پہلے کیا تھا۔ اس وقت بلوچستان کے لوگوں کو بروقت انصاف چاہئے اور آپ سب لوگ اس مسئلے پر آواز اٹھا کر یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔ ہم مرکزی حکومت، صدر مملکت، وزیراعظم اور متعلقہ تمام اداروں کے سربراہوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لا کر اصل قاتلوں کو گرفتار کر کے کٹہرے میں کھڑا کریں اور ان کو عبرتناک سزا دلوائیں تاکہ آپ کی حکومت Credibility کی برقرار رہ سکے۔

''پہلے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی''

بلوچستان کا سیاسی بحران

حکیم بلوچ نے اپنی کتاب ''زیر سایہ خورشید'' کے ایک باب میں لکھا ہے کہ ''بلوچستان کے شاہی جرگہ نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ مگر کب دیا تھا کوئی نہیں بتا سکتا ہے، کیسے دیا ہے؟ ریکارڈ نہ دارد۔'' حکیم بلوچ صاحب نہ صرف حکومت بلوچستان کے مختلف سرکاری اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں بلکہ وہ بذات خود ایک اعلیٰ پایہ کے محقق، تجزیہ نگار اور دنیا کی تاریخ پر وسیع مطالعہ اور غضب کی یاداشت رکھنے والے عالم فاضل شخصیت ہیں اس لئے ان کی اس تاریخی انکشافات پر یقین کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس کی تصدیق ہمارے سامنے کئی مرتبہ شہید نواب اکبر بگٹی نے یہ کہہ کر کی تھی کہ انہوں نے بھی اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر حکیم بلوچ رقمطراز ہیں کہ ''29 یا 30 جون 1947ء کو کوئی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا مگر واقعہ حقیقتاً سچ ہے یا جھوٹ دورغ برگردن راوی۔ مگر شاہی فرمان نمائندہ تاج برطانیہ پولیٹکل ایجنٹ نے جاری کر دیا تھا کہ شاہی جرگہ نے متفقہ طور پر قرار دیا کہ برٹش بلوچستان، پاکستان میں شامل ہو جاتا ہے۔'' برٹش بلوچستان پورا بلوچستان یا ریاست قلات کا ذکر نہیں ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے ہم مزید تاریخی پس منظر پر نہیں جا سکتے لیکن اتنا عرض کرنے کی جسارت ضرور کرتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ بلوچستان کی سیاسی بحران کی ابتدا یہیں سے شروع ہوتی ہے جو ہنوز جاری ہے۔ بلوچستان کی بدقسمتی بلوچستان کی جغرافیہ رہی ہے، فرہنگیوں نے اپنے دور حکمرانی میں اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا لیکن پھر بھی ان کی تشفی نہیں ہوئی اس لئے انہوں نے باقی ماندہ بلوچستان جو ان کے زیر تسلط تھا اس کو بھی دو (۲) حصوں میں تقسیم کیا۔ برٹش بلوچستان جو بلوچستان کے پشتون بولنے والے علاقے بشمول مری، بگٹی، چاغی ایریا پر مشتمل تھا اور ریاست قلات جو تین ریاستوں ریاست مکران، ریاست خاران اور ریاست لسبیلہ پر مشتمل تھا جہاں بلوچوں کی اکثریت ہے ہماری ناقص رائے میں اس بحران کی بیج کو فرہنگی حکمران جاتے جاتے اس نیت کے ساتھ بو گئے تھے کہ یہاں کے لوگ اور ان کے حکمران ہمیشہ آپس میں دست گریباں ہوتے رہیں۔ جو اب حقیقت کا روپ دھار چکا ہے، دوسری طرف اس پورے خطے کو مزید بحران اور انتشار کا شکار بنانے کے لئے گولڈ سمتھ لائین اور ڈیورنڈ لائین کی لکیریں کھینچیں جو اب ٹوٹتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ شاید اب اس میں بھی ان کی خاموش منظوری شامل ہے۔ ویسے بھی امریکن تھنک ٹینک کی طرف سے بلڈ بارڈرز (Blood Boarders) کی کافی تشہیر ہو چکی ہے۔

اس تاریخی وضاحت کے بعد اس تاریخی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرہنگیوں کے جانے کے بعد آٹھ مہینے تک ریاست قلات بشمول اپنی تین ریاستیں آزاد حیثیت سے برقرار رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بلوچستان کبھی بھی تاج برطانیہ کا اس طرح حصہ نہیں

رہا جس طرح ہندوستان رہا تھا بلوچستان یا ریاست قلات کی بالکل الگ حیثیت تھی بالکل نیپال کی طرح رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح جو خان قلات کے وکیل کی حیثیت سے ریاست قلات کی آزادی خودمختاری کا کیس لڑ رہے تھے ذاتی خواہش تھی کی پاکستان بننے کے بعد ریاست قلات اپنی رضامندی سے پاکستان میں شامل ہو جائے لیکن اس میں کسی جبر یا طاقت کا عنصر شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے لوگ قائداعظم محمد علی جناح کو بڑی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھتے تھے ماسوائے کانگریس رہنماؤں کے باقی تمام لوگ جناح کو برصغیر پاک و ہند میں بڑے پایہ کا لیڈر مانتے تھے۔ قائداعظم کے مرنے کے بعد سازشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بحران اس دن جڑ پکڑ لیتا ہے جب سکندر مرزا اپنے مظموم عزائم کی تکمیل اور پاکستان میں دائمی مارشل لاء کی راہ ہموار کرنے کے لئے سادہ لوح خان قلات میر احمد یار خان کو خود بغاوت پر آمادہ کر لیتے ہیں تا کہ فوج کو ریاست قلات پر یلغار کرنے کا جواز فراہم ہو سکے۔ اس فوجی یلغار نے بلوچستان کے سیاسی بحران کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا جس کی بیج فرہنگی جاتے جاتے بو گئے تھے اور اس کے بعد مختلف ادوار میں اس بحران کی جس طرح آبیاری کی گئی اس میں سیولین سے زیادہ فوجی حکمرانوں نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔

سابقہ مشرقی پاکستان کے سانحہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو باقی ماندہ پاکستان کے واحد منتخب اکثریت رکھنے والے لیڈر تھے جس کو شکست خوردہ اسٹیبلشمنٹ نے باامر مجبوری اقتدار حوالہ کیا۔ بھٹو نے شکست خوردہ پاکستان کے ریزہ ریزہ ٹکڑوں کو جمع کر کے دستور ساز اسمبلی کے ذریعہ ایک متفقہ آئین بنایا (1973ء کا آئین کہتے ہیں) جس میں دوسرے صوبوں کی طرح بلوچستان کے منتخب نمائندوں نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ سوائے نواب خیر بخش مری کے باقی سب نے اس آئین پر اس امید کے ساتھ دستخط کئے کہ شاید اب ان کے جائز قانونی اور آئینی حقوق کا تحفظ ہو گا لیکن شومئی قسمت کہ بہت قلیل مدت میں اس متفقہ آئین میں بھی ترامیم کی بھرمار ہوئی اور ایک مرتبہ پھر اسٹبلشمنٹ کے سازشی عناصر نے چیدہ چیدہ سیاستدانوں کو آپس میں دست گریباں کر دیا متفقہ آئین متنازعہ آئین بن گیا اور ایک مرتبہ پھر بلوچستان میں فوجی آپریشن کا آغاز ہوا کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور بلوچستان کے اس بحران کا منطقی انجام ضیاء الحق کی مارشل لاء کی شکل میں نمودار ہوا۔ ضیاء الحق نے اپنے ذاتی اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے بلوچستان کے سیاسی بحران کا یہ حل نکالا کہ حیدرآباد سازش کیس ختم کر کے اپوزیشن کے تمام ممتاز سیاستدانوں ولی خان ل، غوث بخش بزنجو، نواب خیر بخش مری، سردار عطا اللہ مینگل کو غیر مشروط طور پر رہا کر کے ملک سے باہر جانے کی اجازت بھی دے دی۔ حالانکہ جب بھٹو نے فوج کو بیرکوں میں واپس کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو سب سے زیادہ ضیاء الحق نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس سے بلوچستان کے لوگوں نے وقتی طور پر تو سکھ کا سانس لیا لیکن بلوچستان کے سیاسی بحران کا کوئی ٹھوس اور جامع حل کی طرف پیش رفت نہ ہو سکی فوجی حکومت میں سیاسی معاملات کے حل کی ویسے بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ضیاء الحق (مرحوم) کے ہواؤں میں تحلیل ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر سویلین حکمرانوں کو موقع فراہم کیا گیا۔ بے نظیر بھٹو تو بہت ہی

محدود مینڈیٹ کے ساتھ مختصر مدت کے لئے برسر اقتدار رہیں لیکن نواز شریف کے بھاری مینڈیٹ کے دور اقتدار میں بلوچستان میں کچھ غیر معمولی امن وسکون رہا۔ یہ وہ دور ہے جب سردار اختر مینگل بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ نواب اکبر بگٹی بھی پارلیمنٹ اور پارلیمانی سیاست کے حصہ دار تھے۔ نواب خیر بخش مری کے فرزندان چنگیز خان اور گزین مری بھی صوبائی حکومت میں وزارتوں پر براجمان تھے۔ حتیٰ کہ چنگیز مری حکمران پارٹی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں کرپشن کے اسکنڈل بھی زبان زد عام رہے۔ کوئی مزاحمت کوئی مسلح جدوجہد دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ بی این ایم اور دوسرے سارے قوم پرست اقتدار اور پارلیمانی سیاست میں جتے ہوئے تھے۔ قوم پرستی کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ بقول نواب بگٹی ''سارے قوم پرست اس وقت پیٹ پرست بن چکے تھے'' کہ پھر اکتوبر 1999ء میں ایک بھونچال آسمان سے زمین پر نازل ہوا اور جنرل پرویز مشرف اپنے سات (7) نقاطی ایجنڈے کے ساتھ بھاری مینڈیٹ والے (حالانکہ نقطہ دان کہتے ہیں کہ یہ بھاری مینڈیٹ بھی خود مقتدرہ نے اس کو دلایا تھا) وزیر اعظم نواز شریف کو روندتے ہوئے ایک مرتبہ پھر افواج پاکستان کو سیاست میں گھسیٹ کر اقتدار اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے ساتھ ہی بلوچستان پھر ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔

ابتداء میں لوگوں نے سمجھا کہ جنرل مشرف چونکہ نہ جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتا ہے نہ سرمایہ دار طبقے سے، یہ ضرور اس ملک کو راہ راست پر گامزن کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ابتدائی اقدامات تھے بھی کچھ اس کمال کے لیکن کیا پتہ کہ ''ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور'' جن کو چور کرپٹ لٹیرا کہہ کر پس زندان ڈال دیا گیا یا ملک بدر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان سب کو نہ صرف گلے لگایا گیا بلکہ اہم وزارتیں بھی انہی کو سونپ دی گئیں۔ ڈی وی لوشن آف پاور (Devolution of power) کو جس طرح ڈی ویلیو (Devalue) کیا گیا اس کی مثال شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے یہیں سے ایک مرتبہ پھر بلوچستان کی سیاسی بحران کی گھمبیر صورت حال اور گھمبیر تر ہوتی ہوئی زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتی ہے۔ نواب خیر بخش مری کو جو گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے جسٹس نواز مری (مرحوم) کے قتل کے الزام میں پیراں سالی میں جیل ڈال دیا گیا۔ نواب اکبر بگٹی جو زندگی میں کبھی سیاسی وجوہات کی وجہ سے ملک چھوڑ کر نہیں گئے تھے ہمیشہ پارلیمانی سیاست میں مصروف عمل رہے تھے کے ساتھ چھیڑ خانی شروع کر دی گئی ان کے جائز مطالبات کو سننے سمجھنے اور ان کا آئین وقانون کے مطابق حل ڈھونڈنے کے بجائے ان کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ یہی رویہ بلوچستان کے بزرگ رہنما سردار عطا اللہ مینگل کے ساتھ روا رکھا گیا۔ بلوچستان میں ایک مرتبہ پھر بدامنی ہے راکٹ باری ہے بم پھٹ رہے ہیں بمباری ہو رہی ہے۔ نواب اکبر بگٹی کے لاش کے ساتھ جو ڈرامہ کیا گیا اس نے بلوچستان کے بحران پر مزید تیل چھڑک دیا۔

بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ جن حالات سے اب پورا ملک گزر رہا ہے خاص کر صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں جو بحران سر اٹھا چکا ہے سیکورٹی اہلکار سینکڑوں کی تعداد میں ایک گولی فائر کئے بغیر جس طرح ہتھیار ڈال رہے ہیں ملک کے اہم اداروں، عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ

کے درمیان جس طرح کی محاذ آرائی ہو رہی ہے بلوچستان کے سیاسی بحران پر کون توجہ دے سکتا ہے اب تو پورا ملک ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے اور مشکل یہ ہے کہ ملک میں کوئی قد آور قیادت بھی موجود نہیں۔ سب کے سب اپنے اپنے ذاتی گروہی مفادات کی تنگ گلی میں آ کر پھنس گئے ہیں ایڈھا کزم کی پالیسی چل رہی ہے۔ طاقت کے اندھے استعمال کو سارے مسائل کا حل سمجھا جا رہا ہے کوئی ایمرجنسی کی دھائی دے رہا ہے تو کوئی مارشل لاء کا نوید سنا رہا ہے ایسے حالات میں ہمیں اپنے زخموں کا علاج خود ڈھونڈنا ہوگا۔

کیا ہم یہ امید رکھیں کہ پاکستان آئندہ آنے والے دنوں میں ایک مہذب سیاسی معاشرہ کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگا۔؟ منصفانہ غیر جانبدار شفاف انتخابات ہوں گے۔؟ پُر امن انتقال اقتدار ہوگا۔؟ آئین و قانون کی بالادستی ہوگی، پارلیمنٹ خود مختار ہوگا، بلوچستان کے سیاسی بحران کا کوئی منصفانہ حل ڈھونڈا جائے گا۔؟ گزشتہ 60 سال کا تجربہ ان توقعات کی نفی کرتا ہے۔!!

اگر ہمارے یہ توقعات پورے ہوتے نظر نہیں آتے اور علاقے کی صورت حال بھی روز بروز تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں جس میں سب سے زیادہ بلوچستان اور بلوچوں کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے تو پھر ضروری ہے کہ بلوچ مستقبل کی پیش بندی کے لئے خاص کر سیاسی قیادت اور سیاسی کارکن ایک متفقہ مشترکہ سیاسی لائحہ عمل کے خدوخال پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں کیونکہ ہم اس وقت بُری طرح مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہیں ان حالات میں نہ ہم پارلیمانی سیاست میں کوئی بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں نہ کسی اور طریقہ سے ہم اپنی آواز کو بھرپور انداز میں کہیں پیش کر سکتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہوگا کسی نہ کسی کو تو بلی کے گلے میں گھنٹی باندنی ہوگی نہیں تو بلی سب کو کھا جائے گی۔ بلی چاہے ملکی ہو یا بین الاقوامی ان سب بلیوں کی نظر بلوچستان کی پُر وسائل سرزمین پر للچائی ہوئی ہیں ان بلیوں کو محض ایک مضبوط مربوط متفقہ سائنسی بنیادوں پر منظّم سیاسی عوامی تنظیم ہی روک سکتی ہے۔

اگر پاکستان کو بچانا ہے تو!!

1947ء کا پاکستان کیسے وجود میں آیا برصغیر کے مسلمانوں کی ضرورت تھی۔ دوقومی نظریہ کا تقاضا تھا (مذہبی جماعتوں نے مخالفت کی تھی) ہندوستان کو تقسیم کرنا تھا انگریز سامراج کی سازش تھی۔ جنگ عظیم دوئم کے اثرات کانگریس کی قیادت کی غلطی یا اس خطے کے مسلمانوں سرمایہ دار اور جاگیرداروں کی ضرورت کچھ بھی وجوہات ہوسکتی ہیں اس سے ہمیں غرض ہے نہ یہ ہمارا موضوع بحث اور نہ موقع محل کی مناسبت البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مملکت پاکستان اپنا وجود رکھتا ہے گو کہ یہ وہ مملکت نہیں جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا جس کی تکمیل قائداعظم محمد علی جناح نے 1947ء میں کی تھی۔

ہمارا موضوع بحث وہ پاکستان ہے جس کی بنیاد 1970ء میں جو شہید ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء میں ایک متفقہ آئین کے ذریعہ دوبارہ جوڑا تھا جس پر آج تک من وعن عمل نہ ہونے کی وجہ سے باقی ماندہ پاکستان ان مخدوش حالات تک پہنچا ہے آئین پر عملدرآمد تو اپنی جگہ اس متفقہ آئین کا تو حلیہ ہی دو مارشل لاؤں نے بگاڑ کر رکھ دیا اور اس کے خالق کو سولی پر لٹکایا گیا نہ صرف یہ بلکہ اس کے پورے قریبی خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹایا گیا لیکن اس ظلم بربریت اور زیادتیوں کے باوجود بھٹو خاندان اور اس کی بنائی ہوئی ''پاکستان پیپلز پارٹی'' نے ہمیشہ اس باقی ماندہ پاکستان کو نہ صرف بچانے کیلئے جہد مسلسل سے کام لیا بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرتے رہے جس کی زندہ مثال شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت ہے اگر ہم یہ کہیں کہ اس پاکستان کو ابھی تک محض بھٹو کے میتھ (Myth) نے بچایا ہوا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ بھٹو کا میتھ ہی ہے کہ آج ایک مرتبہ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کو عوام نے مسند اقتدار پر بٹھایا ہے لیکن سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ پی پی پی کو ہمیشہ اقتدار اس وقت ملتا ہے جب یہ ملک شدید ترین بحرانوں کے زد میں ہوتا ہے اور جب یہ پارٹی اور اس کی قیادت بحرانوں پر قابو پالیتی ہے تو ان کو نکال باہر کیا جاتا ہے اس وقت حالات اور ملکی سیاست کا تقاضا ہے کہ اس چوہے بلی کے کھیل کو ہمیشہ کیلئے بند کیا جائے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ملک سخت ترین بحرانوں کی زد میں ہے چاروں طرف بدامنی کا راج ہے اعتماد کا فقدان، خوف کا سایہ، تمام اداروں کی زوال پذیری، ناکام ریاست ہونے کا خوف، مذہبی جنونیت، قبائلی خلفشار، صوبوں اور مرکز کے درمیان فاصلے، صوبوں کے اندر انتشار حتی کہ دارالخلافہ اسلام آباد بھی آسان ٹارگٹ بنتا جارہا ہے مالی اور اقتصادی بحران الگ امریکن اور اتحادی افواج کے آئے روز حملے اور دھمکیاں، یہ سب کچھ اس بات کی نشاندہی کررہے ہیں کہ معاملات کافی حد تک خراب ہیں۔ ان خرابیوں کی اصل جڑ اصلی بنیاد کو ڈھونڈنا کی ضرورت ہے اب ہمارے پاس وقت بھی کم ہے اور مریض کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی ہے جب تک ہم اس مرض کی اصل تشخیص نہ کر پائیں شافی علاج ناممکن ہے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس باقی ماندہ پاکستان کی ہیئت ترکیبی کیا ہے یہ دھانچہ کن ستون پر کھڑا ہے اور ان ستونوں

کی حالت گزشتہ ساٹھ سالوں میں کیسی رہی ہے اور اب وہ کس حالت میں ہیں کیونکہ ہمارے حکمرانوں نے گزشتہ ادوار میں محض ڈھانچہ پر ساری توجہ مرکوز رکھی بنیادوں کو دیکھے بغیر اوپر ہی اوپر تعمیرات پہ تعمیرات کرتے رہے اور جن ستون پر یہ ڈھانچہ کھڑا ہے ان ستونوں کی خاطر خواہ مرمت و تعمیر نہ کی گئی اور اب بھی اگر توجہ نہ دی گئی تو بعید نہیں کہ یہ ڈھانچہ ایک دن اچانک زمین بوس ہو جائے گا اگر اس ملک کو بچانا ہے تو اب اس سوچ کو تبدیل کرنا پڑے گا کہ مرکز مضبوط تو سب مضبوط یہ تھیوری مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے جو لوگ زور زبردستی اس تھیوری پر عمل پیرا ہیں وہ پاکستان کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔

ہمارے مقتدرہ طبقے کو اب یہ تلخ حقیقت ماننی پڑے گی کہ پاکستان ایک فیڈریشن ہے اور اس کے چار فیڈریٹنگ یونٹس ہیں جن کو ہم صوبوں کا نام دیتے ہیں اور یہی چاروں صوبوں کے چاروں ستونوں پر ایک ملک کا ڈھانچہ کھڑا ہے جن کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی ضرورت ہے جب تک یہ چار اکائیاں یا صوبے مضبوط، مربوط اور مستحکم نہیں ہوتے یہ عمارت جس کا نام مرکزی حکومت پاکستان ہے اس طرح لرزتا رہے گا اس لئے وقت حالات اور موجودہ گھمبیر صورتحال کا تقاضا ہے کہ صوبوں کو مکمل صوبائی خودمختاری دینے کیلئے ایک مرتبہ پھر 1973ء کے آئین کا سہارا لیا جائے اور اگر اس میں اس مسئلے کے حل میں سقم موجود ہے تو پارلیمنٹ کا اجلاس بلا کر اس کو جتنا جلد سے ہو سکے دور کیا جائے صوبوں کو آخر برائے نام رکھنے کی کیا ضرورت ہے جو ہمیشہ مرکز کے محتاج ہیں ہر مہینہ اسلام آباد میں بیٹھ کر فنڈز کی کمی کا رونا روتے ہیں اسٹیٹ بینک سے اوورڈرافٹ لے کر تنخواہیں اور دوسرے غیر ترقیاتی اخراجات پورا کرتے رہتے ہیں کیوں ہم نے اپنے ملک کے اکائیوں کو بھکاری بنا دیا ہے کیوں ہم ان پر اعتماد نہیں کرتے کیوں صوبے کے منتخب نمائندوں کو اپنے اپنے صوبوں میں امن وامان کو کنٹرول کرنے کیلئے اختیارات اور وسائل نہیں دیتے اور ناکام ہونے کی صورت میں ان کو سزا کیوں نہیں دیتے ان کی سرزنش کیوں نہیں کرتے۔؟؟

اس حقیقت سے ہم راہ فرار اختیار نہیں کر سکتے کہ جب تک اس ملک کے بنیادی ستون یعنی صوبوں کو مضبوط، مربوط، فعال مالی اور سیاسی طور پر مکمل خودمختاری نہیں دیتے تب تک ہم مشکلات میں گرے رہیں گے اب اس فرسودہ لوٹ کھسوٹ استحصالی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے ہمارے موجودہ حکمرانوں کو مضبوط عملی اقدام اور دیرپا مشکل فیصلے کرنے ہوں گے ہر صوبے کو اس کے وسائل پر مکمل دسترس اور اپنے معاملات میں آزادی دینی ہوگی تب جا کر بداعتمادی کا فقدان ختم ہو سکتا ہے تب جا کر مرکز مضبوط اور محفوظ ہو سکتا ہے جہاں تک امن وامان کے سلسلے میں دہشت گردی اور عسکریت پسندی کا معاملہ ہے اس میں ہمیں فرق واضح کرنا ہوگا دہشت گردوں اور عسکریت پسندوں کا الگ الگ مینڈیٹ اور منصوبے ہیں اس وقت یہ سب کچھ گڈمڈ ہو چکا ہے اور سب کو کمانڈو مشرف کے پالیسی کے تحت ایک لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے جو بہت بڑی غلطی ہے اس وقت عسکریت پسند جن کو انگریزی میں (Millitants) کہتے ہیں دو صوبوں میں برسرپیکار ہیں ایک صوبہ بلوچستان میں جن کو ہمارے میڈیا والے شرپسند کہتے ہیں (بلوچی میں ''شر'' اچھے کو کہتے ہیں) جہاں تک بلوچستان کے

عسکریت یا بقول میڈیا شر پسندوں کا تعلق ہے ان کی داستان بہت طویل ہے اور وہ 1948ء سے برسر پیکار ہیں لیکن اس میں شدت اور زیادہ منظّم انداز میں لڑنے کا گر کمانڈو مشرف کے دور میں اس وقت پیدا ہوا جب نواب اکبر بگٹی کو صرف اپنی ذاتی انا کی تسکین کیلئے بے دردی سے قتل کیا گیا حالانکہ نواب اکبر بگٹی کے تمام مطالبات جائز اور ملکی آئین وقوانین کے مطابق تھے اب یہ بلوچستان کے عسکریت پسند اپنے صوبے کے ساحل اور وسائل پر مکمل دسترس اور اختیار مانگتے ہیں جبکہ پختونخواہ صوبے کے عسکریت پسند جو کہ بیشتر مذہبی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں بزور طاقت اپنا مسلک و مذہب مسلط کرنا چاہتے ہیں باقی جہاں تک دہشت گردوں کا تعلق ہے ان کا صرف ایک ہی مینڈیٹ ہے کہ پورے ملک میں دہشت وخوف کا ماحول پیدا کیا جائے ان کی نہ کوئی مذہب مسلک قومیت ہے نہ ان کو کسی مخصوص صوبہ یا علاقے سے غرض ہے یہ یقیناً ایک بین الاقوامی گریٹ گیم کیلئے کام کر رہے ہیں جو اس ملک کو ایک ناکام ریاست ثابت کر کے صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ان میں فرق واضح کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں اور سب کو محض طاقت کے بل بوتے پر ہینڈل کرنا چاہتے ہیں جو درست نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمارے سابقہ کمانڈو وصدر نے بیک وقت ان تمام محاذوں کو کھول کر ملک کیلئے بے شمار مشکلات پیدا کر لئے ہیں جن پر قابو پانا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں بشرطیکہ ہم پوری نیک نیتی اور مکمل اعتماد کے ساتھ اس ملک کے دیرینہ بنیادی صوبائی خودمختاری کے مسئلے کو اولیت دے کر عملی طور پر حل کرنے کی کوشش کریں صوبوں کو مکمل طور پر شریک اقتدار کریں ان کو مالی اور سیاسی اختیارات تفویض کریں صوبوں میں متعین مرکزی سیکورٹی فورسز جن میں انٹیلی جنس ادارے، آرمی، کوسٹ گارڈز، ایف سی، رینجرز وغیرہ کو بھی صوبوں کے منتخب حکمرانوں کے احکامات کے تابع کریں تو پھر وہ خود بخود اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے اپنے اپنے صوبوں میں مصروف عمل عسکریت پسندوں اور دہشت گردوں سے نمٹیں گے کیونکہ اس علاقے کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ کون کون ہے ان کے آپس میں رشتے ناطے کیا ہیں اور ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کون کہاں سے فیڈ ہو رہا ہے البتہ عسکریت پسندوں کے جائز مطالبات کو ایڈریس (Address) کیا جانا ضروری ہے اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد عسکریت پسندوں اور دہشت گردوں کے درمیان فرق واضح ہو جائیگا۔

آخر میں ہم ایک مرتبہ بھرزور دے کر عرض کرتے ہیں کہ اس باقی ماندہ پاکستان کو بچانے کا یہ آخری موقع ہے بہت خون خرابہ ہو چکا ہے اب مزید خون خرابہ کا یہ ملک متحمل نہیں ہوسکتا ایک طرف اتحادی افواج کے جاسوس طیارے پاکستانی اندرونی علاقوں پر بمباری، دوسری طرف خود ملکی مسلح افواج کا اپنے شہریوں پر آپریشن اور تیسری طرف شہری علاقوں میں خودکش حملوں کے ذریعہ دہشت گردی بقول صدر مملکت ''ملک پوری طرح حالت جنگ میں ہے'' تاریخ گواہ ہے کہ جب کوئی ملک اس طرح حالت جنگ میں ہو تو اس کو محض فوج نہیں بچا سکتی اس کو پوری عوام کی مدد وتعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور عوام اس وقت قربانی کیلئے تیار ہوتی ہے جب اس کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ اس ملک کے نفع ونقصان میں برابر کا حصہ دار ہے۔ اب سود وزیاں کے احساس دلانے کا یہ آخری موقع ہے موجودہ حکمران اور خاص کر پی پی

پی کی قیادت کیلئے یہ ایک بہت ہی کڑا وقت ہے اس کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں جمہوریت کا عمل مکمل ہو چکا ہے صدر مملکت اور وزیراعظم کا جمہوری طریقہ سے انتخاب عمل میں آ چکا ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ بڑی سرعت سے اس دیرینہ صوبائی خودمختاری کے مسئلے کو صوبوں کی عوام کے تشفی کے مطابق حل کرنے میں عملی کردار کا آغاز کریں اس وقت بظاہر افواج پاکستان کی قیادت کا رویہ بھی مثبت دکھائی دے رہا ہے پنجاب جس پر ہمیشہ یہ الزام لگتا رہا کہ وہ مضبوط مرکز کا حامی ہے بھی صوبائی خودمختاری کا حامی بن چکا ہے پنجاب کی عوام نے بھی نواز شریف کے مسلم لیگ کو ووٹ دے کر اس نعرے کو سچ ثابت کر دیا کہ ''جاگ پنجابی جاگ تیری پگ نوں لگ گیا داغ'' باقی تین صوبے تو عرصہ دراز سے اس انتظار میں ہیں کہ کب وہ حقیقی معنوں میں اپنے اپنے صوبوں میں بااختیار ہو کر اپنے لوگوں کیلئے آزادی سے کام کر سکیں گے۔ ہمارے سارے صوبے وسائل سے مالا مال ہیں محض ان کو صحیح منصوبہ بندی درست سمت اور مخلص سیاسی قیادت کے زیرنگرانی استعمال میں لانے کی ضرورت ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ کام اب نہیں ہو سکا تو پھر کبھی بھی نہیں ہو سکے گا اس لئے ہم اپنے سندھ کے بلوچ صدر مملکت سرائیکی وزیراعظم اور تمام منتخب پارلیمنٹرین سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر پاکستان کو بچانا ہے تو صوبائی خودمختاری کے اس دیرینہ بنیادی مسئلے کو جلد سے جلد حل کر کے اس ملک کو حقیقی معنوں میں ایک وفاقی ملک بنانے میں اپنا تاریخی کردار ادا کریں نہیں تو تاریخ اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔

ہمارا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

1 نومبر 2008ء

سیز فائر پلیز

اپنے اصل موضوع پر آنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حالات کے پس منظر پر ایک مختصر جائزہ پیش کریں، یوں تو ریاست پاکستان اور بلوچستان کے قبائلی اور سیاسی رہنماؤں کے درمیان بداعتمادی کی خلیج 1947ء سے جاری ہے لیکن افسوس اور دکھ کی بات یہ ہے کہ بداعتمادی کی اس خلیج کو پاٹنے کی مخلصانہ کوشش کرنے کے بجائے ہر دور کے حکمرانوں نے اپنے تئیں اس کو وسیع سے وسیع کرنے کی کوشش کی ہے جس کے منفی اثرات آج اپنی شدت کے ساتھ ہر گلی، ہر محلّہ، ہر تحصیل اور ہر ضلع میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد پہلی مرتبہ شہید ذوالفقار علی بھٹو اور بلوچستان کی قبائلی سیاسی قیادت جو کہ ''نیپ'' کی زیر اثر تھی کچھ مفاہمتی عمل کا آغاز ہوا لیکن یہ ہنی مون زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا اور اس بداعتمادی کی خلیج کو پاٹنے کا ایک بہترین موقع ضائع ہو گیا۔ اس مفاہمتی عمل کو سبوتاژ کرنے میں جہاں ایک طرف خارجی قوتوں کا عمل دخل تھا (شاہ ایران) وہاں دوسری طرف ملکی نادیدہ مقتدرہ قوتیں نیپ کی پختون قیادت اور خود بلوچستان کے قبائلی سیاسی رہنماؤں کے غیر دانشمندانہ جذباتی طرزِ عمل نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا جس کے اثرات حیدرآباد سازش کیس کے دوران اور اس کے اختتام میں واضح طور پر ظاہر ہو گئے۔ نیپ کی پختون قیادت نے معروضی حالات کا جائزہ لے کر ایک دم یوٹرن لیا اور اپنے قومی اور سیاسی مفادات کو پاکستان کے ساتھ وابستہ کیا جبکہ بلوچ قبائلی سیاسی قیادت نے بلوچ اور بلوچستان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فوجی آمر ضیاء الحق سے ایک ڈیل کے نتیجے میں خودساختہ جلاوطنی اختیار کی اور ذوالفقار علی بھٹو پھانسی چڑھ گئے۔ حالانکہ بعد میں بھٹو صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ دوبارہ بلوچستان کی قبائلی سیاسی قیادت سے رابطہ کرنے اور فوجی آپریشن ختم کرنے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ اس طرح بداعتمادی کی خلیج کو پاٹنے کا ایک بہترین موقع فوجی آمر ضیاء الحق کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ اس وقت مفاہمتی عمل نے جہاں ایک طرف بلوچ قومی مزاحمتی عمل کو مکمل جمود کا شکار کیا تو دوسری طرف میدان سیاست میں ایک ایسی خلاء پیدا کی جس کو آمر ضیاء الحق نے لینڈ مافیا اور ڈرگ مافیا کے ذریعہ پُر کیا نہ صرف یہ بلکہ بلوچ سیاسی قبائلی اختلاف کے اثرات بھی سطح زمین پر ظاہر ہونے لگے۔

آمر ضیاء الحق کی موت کے بعد سارے قوم پرست اور قبائلی سیاسی قیادت کے فرزندان ارجمند پاکستان کی پارلیمانی سیاست میں ایسے جت گئے کہ سب نے آپس میں مل کر 1988ء کے الیکشن میں قوم پرست سیاست کے ایک بانی اور بابائے بلوچستان میر غوث بخش بزنجو کو مکران اور خضدار کی قومی اسمبلی کی دونوں نشستوں سے شکست سے دچار کر کے آپس کے اختلافات پر مُہر تصدیق ثبت کر دی اگر یہ سیاسی عمل جاری رہتا تو شاید بلوچستان کے حالات اس نہج تک نہ پہنچتے، بداعتمادی کی اس خلیج کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا تھا لیکن پاکستان کی

مقتدرہ قوتوں کو سیاسی عمل سوٹ نہیں کرتا۔ وقتی طور پر محترمہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو دو دو مرتبہ کنٹرولڈ جمہوریت کے نام پر حکمرانی دے کر (اقتدار منتقل نہیں کیا) پھر ایک فوجی آمر مشرف کو فضا سے زمین پر نازل کیا اور پھر مارشل لاء مسلط کر کے ثابت کر دیا کہ اصل طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ مقتدرہ قوتیں ہیں۔ (جن کے پاس بندوق کی طاقت ہے)

اس کے علاوہ ضیاء الحق کے دور حکمرانی میں ایک بہت ہی منفعت بخش منشیات (Narco) کی تجارت کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی بلکہ ضیاء الحق نے منشیات کی بین الاقوامی تجارت کو اپنی خفیہ سرکاری پالیسی کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ ان کی تھوری یہ تھی کہ مغرب اور امریکہ کی آبادی کو اس لعنت میں مبتلا کر کے جہاں ایک طرف بے تحاشہ دولت کمائی جا سکتی ہے تو دوسری طرف غیر مسلموں کو نشہ کا عادی بنا کر اسلام کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر اس منفعت بخش کاروبار کو وسعت اور ترقی دینے کیلئے ان کو ایک ایسے گروہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف ان کے ہر جائز و ناجائز حکم کو ماننے کیلئے تیار ہو بلکہ نارکو کے اس کاروبار کی ترسیل میں ان کی مدد کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ سے لے کر مشرف کے بلدیاتی نظام اور 2008ء تک کے الیکشن سے وابستہ لوگ اسمبلیوں اور حکومتی ایوانوں میں پہنچا دیئے گئے اور اس طرح سیاسی عمل کو جمود کا شکار بنا دیا گیا اور رہی سہی کسر کو ہمارے قوم پرستوں کے بائیکاٹ نے پورا کر دیا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ پورا صوبہ ایک طویل مدت تک سیاسی تعطیل کا شکار ہوا اور اس خلاء کو ایسے لوگوں کے ذریعے پُر کیا گیا جن کا سیاست اور سیاسی عمل سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی قیادت چاہے فوجی ہو یا سویلین ہمیشہ تنزلی کا شکار رہی ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان، شہید سہروردی، خواجہ نظام الدین جیسے مایہ ناز سیاسی کا اکابرین کی جگہ ایک گونگا بہرہ فالج زدہ بیوروکریٹ غلام محمد پُر کرتے ہیں۔ اس طرح جنرل ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان جس نے آدھا ملک گنوا دیا اور پھر یحییٰ خان کی جگہ منافق ضاء الحق اور ان سب سے بدتر جنرل مشرف جس میں کسی زاویئے سے بھی ایک سنجیدہ باوقار شائستہ جنرل کے اوصاف نہیں پائے جاتے۔ اس کی باڈی لینگویج، انداز تخاطب ایک غیر شائستہ، غیر مہذب شخص کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ چند ڈالروں کے عوض اپنے ملک کے شہریوں کو فروخت کرتے رہے۔

اس بونے جنرل نے ایک ایسی فاش غلطی کی جس نے پاکستان کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بلوچ پہلے سے بہت زخم خوردہ تھے انہوں نے نواب اکبر بگٹی کو جس طریقہ سے قتل کر کے اس عظیم شخص کی لاش کو جس طرح سے بے حرمتی کی انہوں نے بلوچوں کو پاکستان سے بہت دور کر دیا۔ نواب اکبر بگٹی ایک قدآور سیاسی شخصیت تھے جنہوں نے ہمیشہ پاکستان کے آئین اور قانون کے دائرہ میں رہ کر سیاست کی ہے۔ وہ نواب بگٹی ہی تھے جنہوں نے بلوچستان کی صوبائی خودمختاری اور بلوچ ساحل و وسائل کے تحفظ کیلئے سینیٹ میں ایک جامع بل پیش کیا جو آج تک التواء میں ہے اس بونے جنرل نے اس پیرانہ سالی میں نواب شہید کو پہاڑوں میں جانے پر مجبور کیا لیکن انہوں نے پہاڑوں میں

بیٹھ کر سینیٹ کے الیکشن میں حصہ لیا اور اپنے داماد شاہد بگٹی کو کامیاب کرایا جو آج تک سینیٹ آف پاکستان کا ممبر ہے۔ نواب اکبر بگٹی کی شہادت کے بعد ریاست پاکستان اور بلوچوں کے درمیان جو تھوڑا بہت رشتہ تھا وہ یکسر کمزور پڑ گیا۔ اب اس رشتہ کو استوار کرنے یا بداعتمادی کی فضا کو ختم کرنے کیلئے موجودہ حکمرانوں کو نہ صرف بہت جتن کرنے پڑیں گے بلکہ ان کو آخری حد تک جانا پڑے گا۔

زمینی حقائق کی روشنی میں بلوچستان کے حالات روز بروز گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں وہ اپنی مرضی سے طاقت کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں ان کے پیچھے کوئی سیاسی سمت (Political direction) نہیں ہے حتیٰ کہ مکران جیسے علاقے کو بدامنی کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اغوا نما گرفتاریاں، لوگوں کا روز غائب ہو جانا، قتل، پھر لاشوں کی بے حرمتی، لاٹھی، گولی، تشدد، اب خواتین، بچوں پر بھی۔ یہ تشویشناک حالات و واقعات روز بروز نفرتوں میں اضافہ کا سبب بنتے جا رہے ہیں، یعنی ایسا لگ رہا ہے کہ معاملہ بظاہر ان قوتوں کے ہاتھ سے نکل چکا ہے جو کسی حد تک مفاہمت کی سیاست کرنا چاہتی ہیں بلکہ ساری سیاسی قوتوں کی شدید انداز سے مختلف (SMS) کے ذریعہ کردار کشی کی جا رہی ہے جو سیاسی قوتیں کل تک میدان میں اپنے آپ کو بلوچ کاز کا چیمپئین سمجھتی تھیں آج بلوچ نوجوان ان کو بلوچ کاز کا سب سے بڑا غدار اور ایجنٹ سمجھتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی کی شہادت کو تین سال مکمل ہو گئے ہیں لیکن اس کا ردعمل روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا ہے بلکہ بلوچستان کے طول و عرض میں پھیلتا جا رہا ہے۔ تمام طاغوتی تادیبی کارروائیوں کے باوجود وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کی حکمران توقع کر رہے تھے اور جو توقعات مزاحمتی قوتوں کو 2008ء کے الیکشن کے بعد جمہوری حکومت سے تھیں وہ بھی ابھی تک پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی ہیں۔ اب ایک سال کے بعد پھر ایک کمیٹی بنی ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے اپنی کچھ مثبت تجاویز صدر مملکت کو آخری منظوری کیلئے پیش کی ہیں جن کا وہ عنقریب اعلان کرنے والے ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں اس سے پہلے کہ کسی پیکج یا مذاکراتی عمل کا اعلان ہو اعتماد کی فضاء کو بحال کرنے کیلئے چند ضروری اقدامات ناگزیر ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہیں کہ مزاحمتی قوتیں چاہے وہ پہاڑ میں لڑ رہی ہیں یا سیاسی میدان میں سرگرم عمل ہیں یا بیرون ملک مختلف فورم پر جدوجہد میں مصروف ہیں ان سب کا خیال ہے بلکہ وہ اس شک کا برملا اظہار کر رہی ہیں کہ موجودہ سول حکمران کلی طور پر بااختیار نہیں ہیں ان کو حکومت ضروری ملی ہے لیکن اختیارات سے محروم ہیں اگر وہ چاہیں بھی تو اپنے فیصلوں پر عملدرآمد نہیں کرا سکتے اس لئے ان مزاحمتی قوتوں کا ایک بیرونی سیکشن یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ بغیر کسی بین الاقوامی ضامن کے وہ مذاکرات پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ سابقہ ادوار کے تجربات کی روشنی میں ان کا یہ خدشہ کافی وزن رکھتا ہے اس لئے مفاہمتی یا مذاکراتی عمل سے پہلے درج ذیل عملی اقدامات کی روشنی میں شاید مفاہمتی عمل کا آغاز ہو سکے۔

۱۔ سب سے پہلے تین مہینے کیلئے دونوں طرف سے سیز فائر ہو۔

۲۔ سیز فائر کے لئے مزاحمتی قوتوں کی معقول شرائط کو تسلیم کیا جائے۔

۳۔ فوجی آپریشن بند کر کے تمام ملٹری اور پیرا ملٹری فورسز کو بیرکوں میں واپس بلایا جائے۔

۴۔ تمام غائب شدہ زندہ یا مردہ سیاسی کارکنوں کی فہرست جاری کر کے زندہ لوگوں کو منظر عام پر لایا جائے۔

۵۔ تمام سیاسی مقدمات ختم کر کے عام مفافی کا اعلان کیا جائے۔

۶۔ نواب اکبر بگٹی شہید کے ساتھ ساتھ غلام محمد، شیر محمد، لالا منیر، رسول بخش مینگل اور ان تمام مقتولوں کی ایف آئی آر درج کر کے عدالتی کارروائی کے بعد ذمہ داروں کو قانون کے مطابق سزا دی جائے۔

۷۔ ان تمام افراد کی بحالی کا عملی کام شروع کیا جائے جو اس جنگ وجدل کے دوران اپنے اپنے علاقے سے علاقہ بدر ہونے پر مجبور ہوئے ہیں۔

کچھ اور بھی شرائط ہو سکتی ہیں جو مزاحمتی قوتیں خاص کر BNM,BRP یا BNF کے سرکردہ رہنما پیش کر سکتے ہیں لیکن ہماری ناقص رائے میں مذاکرات سیاسی عمل کا حصہ ہے اور اس سے کلی انکار سیاسی عمل کے منافی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک اور موقع ضائع کر کے محض جنگ وجدل پر اپنی قیمتی جانیں قربان کرتے رہیں جس کے شاید ہم مزید متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاکستان کے جمہوری اور خاص کر مقتدر قوتوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ نفرت اور محبت کے فرق کو محسوس کریں کیونکہ فوجی آمر مشرف اور اس کے پیش رو آمروں نے پہلے سے اتنی نفرتیں پھیلائی ہیں کہ مزید نفرتوں کی گنجائش بالکل نہیں۔ ہم مزاحمتی قوتوں سے بھی یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ آپس میں بلوچستان کی دیگر سیاسی قوتوں کے ساتھ بھی سینز فائز کر لیں اور آپس کی سیاسی اور قبائلی لڑائیوں میں اپنی توانائیاں صرف نہ کریں۔ یہی ہمارے اجتماعی مفاد میں ہے۔

ہمارا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے

روزنامہ ''انتخاب'' حب

15 ستمبر 2009ء

نئے صوبے یا صوبوں کی قومی حدود

یوں تو پاکستان میں نئے صوبوں کی بازگشت وقتاً فوقتاً سنائی دیتی رہی ہے لیکن اس مطالبہ میں شدت اس دن سے پیدا ہوئی جس دن موجودہ منتخب حکومت اور منتخب پارلیمنٹ نے سابقہ صوبہ سرحد یعنی NWFP کو 62 سال کے بعد انگریز سامراج کے ABCD سے نجات دلا کر اس کو اپنا قومی تشخص یا قومی نام ''پختون خواہ'' عطا کیا جس میں بقول مولانا فضل الرحمٰن کے ''تخت لاہور'' سے جاری کئے فرمان کے مطابق لفظ ''خیبر'' کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اس دن سے ایک مرتبہ پھر پنڈورا بکس کھل گیا نہ صرف ہزارہ ڈویژن سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے سیاسی گھرانوں کے نامور لوگوں نے بلکہ وہاں کے عوام نے بھی اپنے لئے الگ صوبہ کا مطالبہ پرتشدد احتجاج کے ساتھ شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بہاولپور اور سرائیکی صوبے کے قیام کا دیرینہ مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا۔ دوسری طرف اچانک ایک اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ ''ایم کیو ایم'' جو آج کل متحدہ کہلاتی ہے اور ایک دور میں کراچی کو ''جناح پور'' کے نام سے ایک الگ مملکت یا ملک بنانے کے اسکینڈل میں ملوث تھی یہ اعلان فرمایا کہ وہ سندھ کی تقسیم کے حق میں نہیں ہیں البتہ وہ ہزارہ، بہاولپور اور سرائیکی صوبوں کے قیام کے حق میں زوردار بیانات دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور یہ سلسلہ سارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں جاری وساری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے ہم اپنے اصل موضوع کو زیر بحث لائیں ضروری ہے کہ اس پس منظر میں برصغیر اور اس سے ملحقہ اردگرد کے علاقوں کے بارے میں ایک مختصر تاریخی خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کریں تاکہ اس اہم مسئلے کو سمجھنے میں کچھ آسانی پیدا ہو سکے۔ سب سے قدیم ترین کتاب ''اوستا'' کے مطابق موجودہ پنجاب کا نام ''ہفت آبہ'' تھا جس میں دریائے گنگا اور جمنا کے ساتھ پانچ اور دریا بھی اس سرزمین کو سیراب کرتے ہوئے گزرتے تھے اور اس وقت پنجاب دہلی سے شروع ہو کر دریائے کابل کے کنارے یا ڈیرہ اسماعیل خان تک پھیلا ہوا تھا جو اس وقت مختلف راجواڑوں پر مشتمل تھا۔

یوں تو مختلف حملہ آوروں اور مختلف ایمپائرز کے ادوار میں ان علاقوں کی سرحدات تغیر وتبدیل کا شکار رہیں لیکن 1757ء میں مغلوں کی یلغار اور ان کی ایمپائر جو تقریباً 100 سال تک ان علاقوں میں قائم رہی مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دور میں ان کے ایک نورتن عبدالرحیم خان خانان نے دریائے گنگا اور جمنا کو منہا کر کے موجودہ پنجاب کا نام ''پنج آب'' رکھ دیا اور آج تک اسی نام سے پکارا اور لکھا جاتا ہے۔ لیکن 1857ء میں مغل ایمپائر کے زوال کے بعد برٹش ایمپائر کا دور شروع ہوتا ہے۔ مغل ایمپائر کے دور میں بھی پنجاب 14 راجواڑوں پر مشتمل تھا جن میں 12 راجواڑے بلوچوں کے زیرِ تسلط تھے۔ انہی بلوچوں کی آل اولاد آج بھی پنجاب کے ان علاقوں میں بود باش رکھتے ہیں جن میں کئی نامور شخصیت قومی اسمبلی اور پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے ممبر اور حکومت میں وزراء رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

برٹش راج یا برٹش ایمپائر رفتہ رفتہ ان سارے علاقوں یعنی موجودہ خیبر پختون خواہ، پنجاب اور سندھ پر پوری طرح قابض ہو جاتے ہیں۔ البتہ بلوچستان میں وہ مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ خوانین قلات کا مختلف ادوار میں مختلف نوعیت کے تحریری معاہدات براہِ راست تاج برطانیہ کے ساتھ ہوتے ہیں جن کی برٹش حکمران کسی حد تک پاسداری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے کئی علاقوں میں ان کو سخت مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن آخر کار وہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلوچستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بلوچستان کے پشتون آبادی والے علاقے یعنی کوئٹہ سے لے کر ژوب تک جس میں کٹر سخت مزاحمتی بلوچ علاقے مری، بگٹی کو بھی شامل کر کے اس کا نام ''برٹش بلوچستان'' رکھ دیتے ہیں اور باقی تمام بلوچ آبادی والے علاقے کو ریاست قلات کے نام سے بظاہر بلکہ براہِ راست خود مختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 1947ء میں تقسیم ہندو پاک کے دوران 4 ملکوں کی آزادی کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، بلوچستان اور نیپال (بلوچستان کا پاکستان کے ساتھ جبری یا آزادانہ الحاق ایک الگ موضوع ہے جو اس وقت ہمارے زیر بحث نہیں)۔

برٹش راج کی ہندوستانی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندو پاک کے سارے پڑھے لکھے لوگ اس تاریخ سے واقف ہیں لیکن اپنے موضوع کی مناسبت سے یہاں یہ ضروری ہے کہ موجودہ مسائل خاص کر صوبوں کے بارے میں جن کی وجہ سے پاکستان کی ترقی کا پہیہ جام ہوا ہے معاشی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی طور پر یالا اینڈ آرڈر کے سلسلے میں جو مشکلات ہیں یہ سب بنیادی طور پر برٹش ایمپائر کی پیدا کردہ ہیں جس سے آج تک ہم جان نہیں چھڑا پائے بلکہ مسائل و مشکلات روز بروز گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ الگ تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت کے برٹش ایمپائر کو زار روس اور بعد میں بالشویک کمیونزم انقلاب سے ہمیشہ خطرہ درپیش رہا ہے کیونکہ ایک طرف روس کی سرحدات افغانستان اور دوسری طرف ایران سے ملتی ہیں اور ان دونوں ممالک کی سرحدات ایک طرف صوبہ سرحد (خیبر پختون خواہ) سے ملتی ہیں تو دوسری طرف ایران کی بلوچستان کے ساتھ سرحدات میلوں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس گھمبیر خطرہ اور اندرونی مزاحمت کے پیش نظر برٹش ایمپائر کے حکمرانوں نے اس خطے کی نہ صرف بیرونی سرحدات کو غیر فطری طریقہ سے تقسیم کیا بلکہ اندرونی طور پر پورے علاقے کو اتل پتل کر کے رکھ دیا۔ اندرونی طور پر مختلف علاقوں کو ان کی قومی سرحدات سے محروم کر کے انتظامی یونٹ کے نام پر دوسری قوموں کی قومی سرحدات کے ساتھ شامل کیا تاکہ یہ آپس میں لڑتے رہیں یعنی لڑاؤ حکومت کرو۔ مثلاً سندھ کو ممبئی سے علیحدہ کیا، پنجاب کے علاقے ہزارہ ڈویژن کو پنجاب سے کاٹ کر صوبہ سرحد میں شامل کیا۔ ڈیرہ غازی خان اور اس کے ملحقہ علاقوں کو بلوچستان سے کاٹ کر پنجاب میں شامل کیا اور جیکب آباد (جس کا پرانا نام خان گڑھ تھا) کو بلوچستان سے کاٹ کر سندھ کا حصہ بنایا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح 1839ء میں ڈیورنڈ لائن کے نام سے پختونوں کے درمیان لکیر کھینچ کر ان خونی رشتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ پختونوں کے قبائلی علاقوں جہاں صرف اور صرف پختون رہتے ہیں ان کو بھی الگ کر کے آزاد قبائل کا نام دیا اور (FCR) کے

کالے قانون کے تحت ان کو چلایا جو غالباً آج بھی وہاں پر لاگو ہے اسی طرح اسی ڈیورنڈ لائن کے تحت بلوچوں کے علاقے ہلمند اور زابل کو بھی بلوچستان سے کاٹ کر افغانستان میں شامل کیا۔ اسی طرح 1871ء میں ''گولڈ سمتھ'' کے نام سے لکیر کھینچ کر بلوچوں کے ایک بہت بڑے علاقے کو رشوت کے طور پر ایران کے حوالے کیا تا کہ وہ وہاں سے روس کی یلغار کو روکنے کی کوشش کرے۔ اس طرح بلوچوں کو بھی ان کے خونی رشتوں اور قومی سرحدات سے محروم کر دیا بلکہ جاتے جاتے کشمیر کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان ہمیشہ دست گریباں رہیں۔ ان غیر فطری، غیر قومی سرحدات کی جبری تقسیم و تبدیلیوں کے منفی اثرات اب شدت کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ برٹش ایمپائر کے حکمرانوں نے اسی قسم کے مسائل ہندوستان میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن جمہوریت پر ان کا یقین کامل اور جمہوری اور سیاسی اداروں کے استحکام کی وجہ سے وہاں کی قیادت نے ان مشکلات پر جمہوری انداز سے قابو پا لیا اور آج وہ نسبتاً بنیادی مسائل سے کافی حد تک چھٹکارہ پا چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان ہر میدان میں ہم سے آگے ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم نے جمہوریت کو پنپنے کا کبھی موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری سیاسی ادارے مستحکم نہ ہو سکے اور نہ کبھی ہماری مقتدر قوتوں اور حکمرانوں نے ان بنیادی سلگتے مسائل پر کبھی سنجیدگی سے توجہ دی جواب ایک دیو کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یوں تو اس ملک کے حکمران، دانشور، تھنک ٹینک، اہل فکر و دانش برطانیہ سامراج برطانیہ سامراج کہتے نہیں تھکتے لیکن آج تک کسی بھی حکمران نے نہ کسی دانشور یا مقتدر قوتوں نے برٹش سامراج کی پیدا کردہ ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور نہ ہندوستان کی سیاسی قیادت کی طرح ان میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ وہ ایسا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا خمیازہ ایک مرتبہ ہم بنگلہ دیش کی صورت میں بھگت چکے ہیں اور اگر اب بھی ہمیں ہوش نہیں آیا اور ہمیں تلخ حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تو شاید ہم مزید مشکلات و سانحات سے دچار ہو سکتے ہیں۔ اوپر بیان کئے ہوئے تاریخی حقائق اور معروضی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع کی زمرے میں فقط یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ اس سے پہلے پانی سر سے اوپر گزر جائے اس سنجیدہ اور بنیادی مسئلے پر تیزی سے حکمرانوں اور مقتدر قوتوں کو نہایت سنجیدگی سے توجہ بلکہ عملی اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم مرض کی تشخیص کریں۔ اس کے بغیر کوئی علاج دارو درمان شفا بخش ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہماری ناقص رائے میں پاکستان کوئی مانے یا نہ مانے ایک کثیر القومی ملک ہے جس میں مختلف اقوام غیر فطری طریقے سے جبراً ایک دوسرے کے علاقوں میں خلط ملط کی گئی ہیں اور جب تک ان قومی سرحدات کا ان کی تاریخی اور فطری انداز سے عملی حل نہیں نکالا جاتا نئے صوبے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ سڑی ہوئی لاش کو کنویں میں رہنے دیا جائے اور محض کنویں سے متواتر پانی نکال کر فرض کر لیا جائے کہ کنواں پاک ہو گیا ہے یہ پانی وضو نماز کیلئے جائز ہے۔ حضور جب تک سڑی ہوئی مردہ لاش کو نہیں نکالا جاتا وہ پانی پاک نہیں ہو سکتا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ موجودہ منتخب حکومت پارلیمنٹ کے ارکان اور مقتدر قوتیں اس ملک اور اپنے بہترین مفاد میں اس بنیادی دیرینہ

مسئلے کے حل کیلئے اس طرح جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس طرح انہوں نے این ایف سی ایوارڈ اور 18 ویں ترمیم کے سلسلے میں کیا ہے ایک غیر جانبدار کمیشن ترتیب دے کر جو اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ جج، بیوروکریٹس اور چاروں صوبوں کے پڑھے لکھے سنجیدہ سیاسی رہنماؤں پر مشتمل ہو اور پاکستان میں بسنے والی اقوام کی قومی سرحدات کی جبری تقسیم کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اس کے صحیح اور درست حل کے لئے اپنی تجاویز پیش کریں اور ان تجاویز پر پارلیمنٹ میں سیر حاصل بحث کے بعد ان قومی سرحدات کی اپنی فطری اور اصلی حالت میں بحالی پر عملدرآمد کو یقینی بنائیں تاکہ یہ بنیادی مسئلہ بھی ہمیشہ کیلئے حل ہو جائے۔ موجودہ تمام صوبے اپنی اپنی قومی سرحدات اور خونی رشتوں کے ساتھ رہ کر ہی خوش رہ سکتے ہیں اور صوبوں کے درمیان یا صوبوں اور مرکز کے درمیان جو تنازعہ کی حدت ہے وہ خود بخود ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اس کے بعد انتظامی بنیادوں پر نئے یا صوبوں کے اندر اور صوبے بنانے کے صوابدیدی اختیارات بھی ان صوبوں کے منتخب نمائندوں کو دیئے جائیں جس کی توثیق مرکزی حکومت سے کی جا سکتی ہے۔

ہمارا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔

روزنامہ ''انتخاب'' حب

2 مئی 2010ء